مقدمہ

خلیل الرحمان داؤدی
ڈاکٹر وحید قریشی

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

صابر کے حالاتِ زندگی اور تصانیف

خلیل الرحمان داؤدی

حالاتِ زندگی

صابر کا ذکر اس کے معاصر تذکرہ نگاروں نے زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں کیا اور جن صاحبوں نے اس کے حالات اور نمونۂ کلام دیا ہے، انھوں نے زیادہ تفصیلات سے گریز کیا ہے۔ گلستانِ سخن میں خود صابر نے اپنے حالات دو جگہ دیے ہیں۔ پہلی جلد کے صفحہ ۱۰ پر لکھتے ہیں:

''احقر افراد خلائق با وصف شاہ زادگی خادم ارباب فضل و افضال، باوجود صاحب عالم بندۂ اہل کمال، اضعف عباد، ناشناسائے بلاد، قادر بخش صابر تخلص، ابن صاحب عالم و عالمیاں، ۔۔۔ خلف یگانۂ دودمان سلطنت نشان مرزا خورد بہادر تغمدہ اللہ بغفرانہ، ابن سر وردہ خانوادگان دولت قرین، مرزا اعز الدین بہادر مرحوم کہ مہین برادر زیبندۂ تخت و سریر، حضرت عالم گیر ثانی اور فرزند ارشد کیوان حشم ۔۔۔۔۔ مرزا معز الدین جہاندار شاہ بادشاہ مغفور کے تھے۔''

دوسری جلد میں اپنے نام کے تحت صفحہ ۱۰۳ تا ۱۱۹ میں اپنے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس میں سے مندرجہ ذیل اقتباس قابلِ ذکر ہے:

''ہر چند آبائے عظام اور اجداد کرام کی بدولت نسبت شہزادگی سے مشرف اور بہرۂ بلند نامی سے کامیاب ہے، لیکن دولت کمال کے طفیل اور افاضل روزگار کی تربیت کے اثر سے اس نسبت کا نیازمند اور اس وسالت کا محتاج نہیں ہے۔''

ان کے اس تعلق شاہ زادگی کا ذکر معاصر تذکرہ نگاروں نے وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ عبدالغفور نساخ ''سخن شعراء'' میں صفحہ ۲۷۱ پر لکھتے ہیں:

''صابر تخلص، مرزا قادر بخش خلف مرزا اکرم بخت بہادر ابن مرزا خورد بہادر نبیرۂ

مرزا معز الدین جہاندار شاہ بادشاہ دھلی، شاگرد عبدالرحمان خاں احسان و مولوی امام بخش صہبائی، صاحب دیوان ھیں، تذکرۂ گلستان سخن ان کے نام سے مشہور ہے، لیکن حقیقت میں تذکرۂ مذکور مولوی امام بخش صہبائی مرحوم کا لکھا ہوا ہے۔''

'یادگار شعراء' میں جو اشپرنگر کی اودھ کیٹلاگ کا اردو ترجمہ ہے، 'گلستان بے خزاں' کے حوالے سے صابر کے نام کے آگے صرف مرزا صابر درج ہے۔ (صفحہ ۱۲۴) 'بزم سخن' (۱۲۹۸ھ) مرتبہ سید علی حسن خاں میں صابر کے حالات یوں درج ہیں:

''صابر، مرزا قادر بخش فرزند مرزا اکرم بخت بہادر نبیرۂ مرزا معز الدین جہاں دار شاہ بادشاہ دھلی با عبدالرحمان خاں احسان و مولوی صہبائی نسبت تلمذ داشت، تذکرہ و دیوانے بزبان ریختہ یادگار خویش گذاشت۔''

(صفحہ ۷۳)

ان کے بھائی سید نورالحسن خاں تذکرہ 'طور کلیم' (۱۲۹۸ھ) میں فرماتے ہیں:

''مرزا قادر بخش خلف مرزا اکرم بخش بہادر نسبش تا جہاں دار شاہ بادشاہ دھلی می رسد۔ از تلامذۂ عبدالرحمان خاں احسان و مولوی صہبائی علیہ رحمۃ بود۔ تذکرہ گلستان سخن بنام او غازۂ شہرت دارد (صفحہ ۶۲)۔''

صفیر بلگرامی 'جلوۂ خضر' کی جلد اول (۱۸۸۴ع) میں شہزادہ صابر کا ذکر کرتے ہیں اور قواعد و محاورات کی صحت اور درستی کے اعتبار سے قواعد والے حصے کی بہت تعریف کرتے ہیں ('جلوۂ خضر' جلد اول، صفحہ ۲۷۰) صفحہ ۲۷۵ پر انھوں نے شہزادہ قادر بخش صابر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ۱۲۹۱ھ تک زندہ تھے۔

صفیر بلگرامی کی اصل عبارتیں یہ ہیں:

(اقتباس از 'جلوۂ خضر' جلد اول مصنفہ فرزند احمد صفیر بلگرامی تالیف ۱۳۰۱ھ مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، طبع اول ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ع، صفحہ ۲۹۳۔)

محاورات دھلی صابر کے کلام سے ۱۲۹۱ھ تک:

عصیاں کی دولت اب تم خجلت ۱ سے بعد مرگ
اٹھنا مرے غبار کو دشوار ہو گیا

لب تلک ۲ آ کر سخن پھر جائے ۳ ہے دل کی طرف
حرف یاں کس کا زبان نقش کو سرما ہوا

میں ہوں خود دریا و لے ۴ کو تہ نظر کے سامنے
ظرف موج و قطرہ میرے رخ کا اک پردہ ہوا

گہ حرم میں اور گاہے دہر میں دیکھا اسے
طور ہرجائی پنے ۵ کا اس پہ کیا زیبا ہوا

منہ پہ کہتے دیتے ہیں جو دل میں ہے آئینہ نمط ۶
تم ہٹے اور نہ یاں دل میں کچھ اے یار رہا

تیرہ بختی کا کھلا عقدہ نہ اوس سے مثل شب
ماہ نو ہے گویا ۷ ناخن مرے تدبیر کا

ہماری خاک میں اتنی کہاں رسائی ہے
نجانیں ۸ دل میں ترے کس طرح غبار آیا

ہوتا ہے فیض اہل توکل کو غیب سے
اک قطرہ بحر سے نہیں لیتی کبھو ۹ صدف

۱۔بدولت، آب خجلت۔ ۲۔تک۔ ۳۔پھر جاتا ہے۔ ۴۔ولیکن ۵۔ھرجائی پن۔ ۶۔کی طرح۔ ۷گویا۔ ۸۔خدا جانے کیا جانیں۔ ۹۔کبھی

اس سن میں جائے ۱ دیتے ہیں انساں کو آنکھ میں

جوں ۲ طفل اشک چاہیے ہرگز جواں نہ ہو
مجھ کو بسان نقش قدر چھوڑ کر چلے

صابر نہ اعتماد رہا ہمرہاں ۳ پہ کچھ
مجھ کو جگہ ۴ کہاں ہو کہ آتا نہیں نظر

دل میں ترے تو غیر سے خالی مکاں مجھے
نقش قدم تلک ۵ نہیں رکھتی رہ عدم

ملتا وگرنہ قافلۂ رفتگاں مجھے
کس اضطراب دل سے اُٹھتا ہوں چونک چونک ۶

حاصل ہوئی نہ مر کے بھی خواب گراں مجھے
چھپتا پھروں ۷ ہوں خلق کی نظروں سے پر **فلک**

کرتا ہے بوئے گل کی طرح سے عیاں مجھے
دل میں بھی دی جگہ تو کدورت کے ساتھ دی

رکھتے ہیں خاک ۸ میں ہی ملائے بتاں ۹ مجھے
دیر میں آ کے ہوئے اور ہی جلوے سے دوچار

مل گئے وہ جو ضلالت سے پڑا کار ۱۰ مجھے

IqbalCyberLibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

اقتباس از 'جلوۂ خضر' جلد اول صفحہ ۲۷۱، ۲۷۲ محاورہ غلط دہلی جو صابر نے لکھے ہیں

اصل لفظ	مستعمل دہلی	اصل لفظ	مستعمل دہلی
آردآبہ	اردابہ	پڑاوہ	پچاوہ

۱۔ جا دیتے ہیں۔ ۲۔ مثل۔ ۳۔ ہمرہوں۔ ۴۔ میری جگہ۔ ۵۔ تک۔ ۶۔ چونک چونک کر۔ ۷۔ پھرتا ہوں۔ ۸۔ خاک ہی میں۔ ۹۔ بتاں با ترکیب ۱۰۔ کام۔

تاربافی	ٹاٹ بافی	طوطیا	توتیا
چیلانچی	چلمچی	جازم	جاجم
جرغل	ذرغل	شرک	سڑک
شلہ	شولہ	شتا	شطاح
صدقہ	صلہ	صلاح	صلاء
کیسہ	کھیسہ	نبات	نوبات
پوش	پویش	طاسہ	تاشہ
دم و درود	دم درود	سریشم	سریس
صدقہ	سلہ	قربوس	قبور

اقتباس از 'جلوۂ خضر' جلد اول صفحہ ۲۷۳:

''شہزادہ قادر بخش صابر نے اپنے تذکرۂ گلستان سخن میں دہلی کے آٹھ استادوں کا ذکر صفحہ ۷۶ میں کیا ہے:

(۱) حافظ عبدالرحمان احسان (۲) شاہ نصیر (۳) میر نظام الدین ممنون (۴) شیخ ابراہیم ذوق (۵) مرزا اسداللہ خاں غالب (۶) حکیم محمد مومن خاں مومن (۷) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (۸) نواب محمد ضیاء الدین خاں نیر اور مؤلف کے کے تحقیق اور اصول استادی کی رو سے اور بھی حضرات ہیں جن کو منصب استادی کا بارگاہ مبدۂ فیاض سے عنایت ہوا ہے۔

(۱) مولوی صدرالدین خاں آزردہ (۲) میر حسین تسکین (۳) مرزا کریم الدین رسا (۴) مرزا رحیم الدین حیا (۵) مولوی امام بخش صہبائی (۶) مرزا پیارے رفعت (۷) شہزادہ قادر بخش صابر (۸) شاہ محمد نصیر رنج (۹) مولوی عبدالکریم سوز (۱۰) نواب سعدالدین خاں شفق (۱۱) نواب زین العابدین خاں

عارف (۱۲) حکیم آغا جان عیش (۱۳) حکیم ثناء اللہ خاں فراق (۱۴) حافظ قطب الدین مشیر (۱۵) نواب الٰہی بخش خاں معروف (۱۶) مرزا نیاز علی نکہت۔

یہ ۴۴ اساتذہ بعد دور میر تقی و سودا کے شمار میں آتے ہیں جن کے فیض سے دہلی کے مشاعروں اور شاعری کو رونق ہے۔

اور چار حضرات اور بھی نسیم دہلوی، داغ دہلوی، سالک دہلوی اور تشنہ دہلوی بھی اگر چہ دہلی کی زبان کے دور میں شامل ہیں، مگر بہ سبب اصلاح و درستی کے اس کے ماہر بھی ہیں۔ اس لیے میں ان لوگوں میں بھی جو کچھ باتیں دہلی کی زبان کی پاتا ہوں، اسی آخر دور میں لکھ کر دکھاتا ہوں:

گلستان بے خزاں (۱۲۹۱ھ) میں صفحہ ۴۴ اپر صابر کے بارے میں صرف اس قدر لکھا ہے:

''صابر تخلص، مرزا صابر نام، ایسا مستحکم جن کا کلام جس سے سامع کو محو ہو بہو کرتے ہیں۔''

سراپا سخن میں محسن (۱۲۷۷ھ، ۱۸۸۱ع) کہتے ہیں۔ ''شاہ زادہ قادر بخش صابر مولد و مسکن قلعۂ مبارک شاہجہان آباد، صاحب دیوان۔'' (ص ۱۰۰)۔

سخن شعراء (مؤلفہ عبدالغفور خاں نساخ، مطبوعہ نولکشور ۱۲۹۱ھ) میں صابر کے بارے میں اندراج اوپر دیا جا چکا ہے، یہاں پر اتنا عرض کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ کہ نساخ نے اس کے بعد ۱۱ اشعار انتخاب کیے ہیں گارسین دتاسی نے گلستان سخن کا ذکر اپنے خطبات میں کیا ہے۔ ان کے اقتباس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''تین تذکرے گلستان سخن کے نام سے موسوم ہیں اور ان کے مصنف صابر، جوش اور مبتلا ہیں۔ ان کا حال دیکھنا ہو تو میری تاریخ دیکھیے (خطبات گارسین دتاسی اردو ترجمہ، صفحہ ۹۴)۔''

یہی مصنف اپنی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی کی طبع ثانی (۱۸۷۰ع) کی جلد سوم

میں صابر کا حال اس طرح لکھتا ہے:

SABIR (Mirza Qadir-Bakhsch), prince royal de Dehli, fils de Mirza Muhammad-bakhsch et eleve du maulawi Imam-bakhsch Sahbayi, est ne dans le palais imperial (quill'-i-mubarak) de Dehli, et il y habitait avant l'insurrection de 1857. Sabir est auteur d'un Diwan hindoustani dont Muhcin donne des extraits. Il est en outre auteur d'un Tazkira des poetes urdus intitule Gulistan-i-sukhan "le Jardin de l'eloquence." Ce Tazkira forme 544p. de 13 lignes (1); ily en avait, a la bibliothique.

----

1. Cet ouvrage est annonce comme etant imprime, dans l' aKhbar-i-alam, Mirath, 22, aout 1867.

----

du Palais imperial de Dehli, un exemplaire qui a ete echete par le gouvernement anglais apres la prise de cette capitale en 1857 (No 1087 du Catalogue).

(HISTOIRE DE LA LITTERATURE HINDWUIE

ET HINDOUSTANIE

PAR

M. Garein De Tassy

SECONDE EDITION

PARIS

Vol III pp.6-7)

۱۸۵۲ء میں اس سے اخذ و ترجمہ کر کے ڈاکٹر فیلن اور منشی کریم الدین نے 'طبقات شعرائے ہند' ترتیب دیا۔ اس مآخذ میں صابر کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کریم الدین لکھتے ہیں:

''مرزا صابر ایک بادشاہ (کذا) شاہ زادے ہیں، قلعہ شاہجہان آباد میں رہتے ہیں۔ اون کو بٹیروں کے پکڑنے اور لڑانے کا بہت شوق ہے۔ جب اس شوق سے فرصت پاتے ہیں، شعر بھی کہتے ہیں۔ میرے مکان پر مشاعرہ بارویں شعبان ۱۲۶۱ھجری کو یہ شعر اونھوں نے پڑھے تھے۔ میں نے داخل پرچۂ مشاعرہ بھی کیے ہیں۔ انتخاب ان کا یہ ہے (۶ شعر: 'پھسلانے لگے، رہ جانے لگے، کی زمین میں) (طبقات شعرائے ہند، ص ۴۱۷)

تذکرہ نگاروں کی معلومات کا یہی عالم ہے اور اس سے زیادہ ہمیں معاصر تذکرہ نگاروں سے کچھ نہیں ملتا۔ صابر کے کم عمر معاصرین میں 'بزم سخن' اور 'طور کلیم' کے مرتبین نے جو کچھ لکھا ہے اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ متاخر تذکرہ نگار انھی بیانات کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ چناں چہ 'قاموس المشاہیر' جلد ۲ صفحہ ۳۵، 'تذکرہ شعرائے متغزلین' از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (ص ۲۰۴) اور رسالہ 'نگار' کا 'تذکروں کا تذکرہ نمبر'، (ص ۲۵۰) پر انہی معلومات کی تلخیص دی گئی ہے۔

خود صابر کے بیانات اس کے حالات کے سلسلے میں کچھ مزید روشنی ڈالتے ہیں یا پھر ان کے دیوان 'ریاض صابر' کے مرتب عاقل دہلوی نے ان کے بارے میں کچھ مزید معلومات کہیا کی ہیں۔ 'خم خانہ جاوید' کے مرتب پنڈت سری رام نے بھی صابر کا ذکر کیا ہے۔

سب سے پہلے سید محمد سلطان عاقل دہلوی پروپرائٹر مطبع اخبار آصفی واقعہ حیدر آباد دکن نے جو کچھ 'ریاض صابر' کے دیباچے میں لکھا ہے، اس میں سے بعض اہم اندراجات پیش کیے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ا۔ ''۱۲۲۳ھجری نبوی میں شاہجہان آباد کے قلعۂ معلی میں (جو کبھی اردو زبان کا مولد و موطن تھا) پیدا ہوئے..... پہلے حضرت حافظ عبدالرحمان خان احسان علیہ الرحمۃ سے مدتوں اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد جناب مولوی امام بخش صہبائی سے فیض پایا۔ غالب و مومن و ذوق سے ہم عصرانہ ربط رہا۔ چناں چہ ایک قطعہ میں فخریہ فرماتے ہیں:

پہلے استاد تھے احسان و نصیر و ممنون
ہوئی احساں سے پر اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرت صہبائی کی اصلاح کا فیض
طبع باریک ہوئی ان کی بدولت میری
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب
اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
ہند کا فضل و ہنر ذات پہ تھا جن کی تمام
مانتے تھے وہی اشخاص فضیلت میری
باہر آ کر نہیں مشہور ہوا میں کچھ آج
شکر ہے اپنی ہی دلی سے ہے شہرت میری

۲۔ غدر تک حضرت مرحوم و مغفور دہلی ہی میں رہے........آخر کار گھبرا کر بنارس کی سرزمین کو اپنے قدم برکت لزوم سے تا حیات، بلکہ قیامت تک، شرف بخشا یعنی وہیں ۱۲۹۹ھجری میں انتقال فرمایا۔

ان پریشاں خیالیوں کے لکھنے والے نامہ سیاہ خاک پائے سخن وراں سید محمد سلطان عاقل دہلوی نے تاریخ وفات کے عدد نام نامی سے نکالے یعنی محمد قادر بخش ۱۲۹۹ھ۔ گویا یہ نام مرنے کی تاریخ تھا۔ یہ خاکسار بنارس ہی میں پندرہ سولہ برس تک حضرت مرحوم و مغفور کی شرف یابی حضوری سے مشرف اور خوشہ چینوں کے ذیل میں ایک خاص التفات کا مستحق رہا۔ غدر تک کا کلام حضرت ممدوح کا باغیوں کی نذر ہوا۔ یہ دیوان جواب اہل نظر کے ملاحظے سے گزرتا ہے، غدر کے بعد کی کمائی ہے، ہاں ایک تذکرہ گلستان سخن، جو در حقیقت رنگینی عبارت میں گلستان سخن ہے، غدر کے پہلے کی طبع آزمائی ہے۔

۳۔ ’’خاکسار کو ہمیشہ سے یہ آرزو تھی کہ یہ دیوان ہیچمدان کے اہتمام سے چھپے، چناں چہ حیدرآباد کی برکت خیز خواہشوں نے یہ جرأت دلائی اور حسب الحکم حضور مرزا محمد قیصر بخت بہادر فروغ دام اقبالہ فرزند ارجمند حضرت مبرور ۔۔۔ اس مجسم بیش بہا کان گوہر کو جوہر شناسوں کے حضور میں پیش کرتا ہوں ۔۔۔:

حضرت مرحوم و مغفور نے غدر سے پہلے جو کچھ فرمایا تھا، اس کلام میں بعض محاورات قدیم زبان کے باقی تھے، مثلاً ’آئے ہے، جائے ہے، وغیرہ، لیکن اس دیوان میں کوئی محاورہ مخصوص بہ زبان قدیم نہیں ہے، البتہ چند اصطلاحیں یا محاورے دہلی کے ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو لکھنؤ میں نہیں بولتے اور یہ اختلاف دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا ہے۔ مثلاً:

جون سے گل پہ بہار آتی ہے
پہلے ہم جان فدا کرتے ہیں

اہل لکھنؤ 'جون سے' کی جگہ 'جس' کہیں گے اور اہل دہلی 'جس' اور 'جون سے' دونوں لفظوں کو ایک ہی موقع پر استعمال کرتے ہیں، یا مثلاً لفظ 'مان' بمعنی احسان و ناز اہل لکھنؤ نہیں بولتے، یا مثلاً لفظ فکر کو اہل لکھنؤ مؤنث کہتے ہیں اور اہل دہلی دونوں طرح استعمال کرتے ہیں۔۔۔''

خود 'ریاض صابر' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر صابر دہلی میں موجود تھے، چناں چہ دہلی کی بربادی کا انہوں نے جو قطعہ لکھا وہ یہ ہے:

قطعۂ تاریخ بربادیٔ دہلی

جو تھا دار الخلافہ شہر دہلی
فلک نے اس کو ویراں کر دیا ہے
نہیں کچھ اس کی آبادی کی صورت
اگر آباد پھر ہووے خدا ہے
وہ تھا گویا چراغ عالم افروز
سموم ظلم سے گل ہو گیا ہے
وہی یادش بخیر اپنا وطن تھا
ہمیں ملک سلیماں سے سوا ہے
رضائے حق پہ ہم شاکر ہیں ہر دم
نہ شکوہ ہے کسی سے نے گلا ہے
ہوا وہ جو مقدر میں لکھا تھا
وہ ہو گا اور جو جو کچھ لکھا ہے
نہ صابر بے قراری ہم کو زیبا
نہ یارا ضبط کا باقی رہا ہے

گھٹا جب دل تو یہ از راہ تاریخ
کہا کیا ظلم دلی پر ہوا ہے
۱۲۷۴ھ''

(ریاض صابر، ص ۷۵۔۲۷۴)

پنڈت سری رام نے 'خم خانۂ جاوید' کے دیباچے میں 'گلستان سخن' کی بڑی تعریف کی ہے اور اسے اپنے مآخذ کی فہرست میں شامل کیا ہے، لیکن ان کے انتقال کی وجہ سے خام خانۂ جاوید کی پانچویں جلد پنڈت برج موہن کیفی نے ترتیب دی۔ اس میں صابر کے بارے میں جو اطلاعات ہیں وہ ذیل میں دی جاتی ہیں:

(اقتباس از 'خم خانۂ جاوید، جلد پنجم مؤلفہ لالہ سری رام دہلوی مطبوعہ دہلی۔)

''صابر: صاحب عالم مرزا محمد قادر بخش گورگانی دہلوی ابن مرزا مکرم بخت۔ آپ کی ولادت ۱۲۲۳ھ میں لال قلعہ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شمیم اقبال خسروی سے ایک عالم کا دماغ معطر ہو رہا تھا۔ ہر طرف عیش و مسرت نے اپنا سکہ جما رکھا تھا۔ آپ نے بھی آنکھ کھول کر یہی دیکھا کہ راجہ سے پرجا تک سب رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ ایک عرصے تک یہی منظر پیش نظر رہا، یکا یک شاہانہ درخت اقبال نے جڑ چھوڑ دی۔ لال قلعہ تباہ و برباد ہو گیا اور تخت شاہی پر ایک نئی بساط بچھی۔ وہ بساط جس کو بابر نے ہندوستان کے تخت پر بچھایا تھا، چشم زدن میں الٹ گئی۔ مرزا صاحب کے بڑے صاحب زادے مرزا قیصر بخت کا عقد بنارس میں ہوا تھا۔ مرزا صابر بھی بعد غدر بنارس ہی میں جا رہے مگر وطن کی کشش ایسی نہ تھی کہ ان کو وہاں رہنے دیتی۔ چنانچہ اکثر دلی آتے رہتے اور اپنے یاران طریقت سے مل جل کر واپس ہو جاتے۔ قدرت نے ان کو اور خوبیوں کے علاوہ شاعرانہ طبیعت بھی عطا کی تھی۔

جس وقت مرزا صاحب نے شعر کہنا شروع کیا تھا حافظ عبدالرحمان خاں احسان سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ ان کے انتقال (۱۲۶۷ھ) کے بعد مولانا امام بخش

صہبائی کی طرف رجوع لائے اور پھر آخر تک انہیں کی استادی کا دم بھرتے رہے۔ غالب و ذوق و مومن سے معاصرانہ ربط رہا اور اپنی شرکت سے ان کی محفلوں کو ہمیشہ گرماتے رہے۔ خاندان تیموریہ میں شاید شاہ ظفر کے سوا حضرت صابر کا سا کوئی با کمال شاعر نہیں ہوا۔ آپ کے کلام میں جو لذت ہے اس کے مزے سے دل ہی آگاہ ہو سکتا ہے۔ اور ات جس قدر آپ کے کلام میں پائے جاتے ہیں وہ موجودہ زمانے کے فصحا اور شرفاء کی زبان زد ہیں۔ رعایت لفظی کی پابندی اور تشبیہات کی قید سے آپ کا شہباز خیال آزاد نظر آتا ہے۔ پاکیزہ تخیل کے ساتھ زبان کی سلاست و انداز بیان کی دل فریبی جو لطف دیتی ہے، اس کا اظہار زبان قلم سے کافی نہیں ہو سکتا۔ گلستان سخن ایک تذکرۂ شعراء بھی آپ نے لکھا تھا۔ عاقل وغیرہ باکمالوں کا کلام موجود ہے جس کو آپ کے خرمن سخن سے برسوں گل چینیاں کرنے کا فخر حاصل رہا ہے۔

''آپ نے ۱۲۹۹ھ میں بہ مقام بنارس ۶۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ آپ کا دیوان 'ریاض صابر' کے نام سے موجود ہے''۔

ان معلومات میں خود صابر کے بیانات اور بعض دیگر ذرائع سے ہم جو اضافہ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے:

اسرار تخلص مرزا سپہر شکوہ ابن مرزا طہماسپ ابن مرزا سلیمان شکوہ کے بارے میں صابر نے خود لکھا ہے کہ وہ راقم آثم کے خسر تھے۔ چند روز ہوئے کہ وفات پائی اور مزار ان کا آں سوئے دریائے جمن شاہ بڑے کے تکیے میں واقع ہے (ص، ۲۶۶)۔ اسی طرح مرزا سعادت سلطان ابن مرزا قادر بخش موزوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ خسر پور راقم ہیں (ص، ۳۵۹)۔ اسی طرح گلستان سخن میں انھوں نے اپنے شاگردوں کا حال بھی درج کیا ہے۔ چنانچہ آرزو (جلد اول، ص ۲۲۴)، ایجاد (جلد اول، ص ۲۸۲)، بسمل (جلد اول، ص ۲۸۹)، پریشان (جلد اول، ص

۳۲۱)، تپش (جلد اول، ص ۳۳۲)، تیمور (جلد اول، ص ۳۵۹)، سپہر (جلد دوم، ص ۳)، فروغ (جلد دوم، ص ۲۷۹)، قناعت (جلد دوم، ص ۳۰۲)، قیس (جلد دوم، ص ۳۱۴)، ماہر (جلد دوم، ص ۳۱۳)، مظفر (جلد دوم، ص ۳۶۹)، موزوں (جلد دوم، ص ۳۸۸)، ناصر (جلد دوم، ص ۴۱۹) کا حال لکھا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل شعراء کے بارے میں ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ صابر کے رشتہ دار تھے (چنانچہ گلستان سخن میں ان اعزا کا ذکر ہوا ہے):

اسرار: مرزا سپہر شکوہ، خسر صابر۔

ایجاد: مرزا رحیم الدین پسر مرزا حسین بخش۔

تہور: مرزا غلام فخر الدین، برادر صابر۔

تیمور: مرزا سعادت سلطان (صبر کا خسر زادہ و شاگرد)۔

فروغ: محمد عمر سلطان فرزند صابر۔

صابر کے دوسرے اعزا جو شاعر بھی تھے، ان کی تعداد سات ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ قیصر: مرزا خدا بخش، نواسۂ شاہ عالم، صابر کے ماموں۔

۲۔ قناعت: مرزا غلام نصیر الدین خلف مرزا ولی الدین ابن مرزا زاھد الدین ابن شاہ عالم ثانی شاگرد احسان و صابر۔

۳۔ کامل: مرزا ناصر الدین معروف بہ محمد مرزا ابن مرزا ابو سعید، برادر عم زاد صابر و رحیم الدین حیا، یہ شاگرد حیا تھے۔

۴۔ ماہر: مرزا جمعیت شاہ خلف الصدق مرزا ذوالفقادر بخت ابن مرزا جمشید بخت ابن حضرت فردوس منزل شاہ عالم بادشاہ شاگرد صابر۔

۵۔ موزوں: مرزا قادر بخش خسر پور صابر۔

۶۔ مہجور: مرزا ھدایت علی مرحوم ابن مرزا احسن الدین مغفور ابن حضرت عالمگیر ثانی، صابر ہیچمداں کے برادر عم زاد۔

۷۔ناصر:		مرزا محمد علی بیگ پسر مرزا احمد بیگ، فن شعر میں راقم تذکرہ سے مستفید۔

دوسرے تذکروں سے ان کے رشتے داروں کے بارے میں ہمیں جو معلومات ملتی ہیں وہ یہ ہیں:

ارشد گورگانی

''ارشد: صاحب عالم مرزا عبدالغنی گورگانی دہلوی خلف مرزا علی بہادر ابن شاہ زادہ داوّر شاہ خلف الرشید حضرت احمد شاہ بادشاہ، پیدائش قلعۂ معلی میں ہوئی۔ ابھی ۶، ۷ برس سے زیادہ عمر نہ ہونے پائی تھی کہ غدر ہو گیا۔۔۔۔ چنانچہ ایام طفولیت میں کئی سال تک قطب صاحب میں رہے اور وہیں کتب درسیہ پڑھیں۔ اس کے بعد سر رشتۂ تعلیم پنجاب میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ لاہور، مگر زیادہ عرصہ فیروز پور میں فارسی کے ہیڈ مولوی رہے۔شاعری کی ابتدا بچپن ہی سے ہو گئی تھی۔ مرزا قادر بخش صاحب صابر مرحوم آپ کے رشتے میں ماموں ہوتے تھے۔انہیں علاوہ زبردست استعداد عربی و فارسی، علم عروض پر ایسا عبور تھا کہ اس فن میں مستند سمجھے جاتے تھے اور فن شعر میں تو استاد مسلم الثبوت تھے۔صابر مرحوم کے بڑے صاحب زادے مرزا عمر سلطان معروف بہ مرزا قیصر بخت فروغ بنارس میں شادی ہو جانے کے باعث وہاں جا رہے تھے۔اگرچہ مرزا صابر بھی وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔مگر ان کا زیادہ تر دہلی میں قیام رہتا تھا۔مرزا سے انہیں خاص انس تھا۔ان کی ذکاوت، تیزی اور رسائی فکر کو دیکھ کر جان گئے کہ خدا نے اسے غیر معمولی دماغ دیا ہے۔۔۔اسی اثنا میں مرزا صابر بنارس تشریف لے گئے۔وہاں جا کر چند ہی روز اصلاح کا سلسلہ جاری رکھا کہ مرزا صابر نے لکھ بھیجا کہ اب تم بجائے خود استاد ہو، تمہیں اصلاح کی کوئی احتیاج نہیں۔مرزا صابر مرحوم ہمیشہ ان پر ناز فرمایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ساری عمر کی کمائی دو شاگرد ہیں، اول یہ اور دوسرے مرزا فروغ

صاحب زادہ کلاں ۔۔۔ ۵۸ برس کی عمر میں افروری ۱۹۰۶ع کو اچانک اس دار فانی سے ملک جاودانی کو سدھارے اور ملتان میں پیوند زمین ہوئے۔''

(خم خانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۲۶۲/۲۶۶)

ارشد

''ارشد تخلص، مرزا عبدالغنی دہلوی شاگرد مرزا قادر بخش صابر:

صاحب ہماری جان بھی صدقے ہے دل تو کیا
بندہ کچھ ان ھتوں سے ھٹایا نہ جائے گا
دل کیا ملائیں دل میں کدورت ہے آپ کے
دل ہم سے خاک میں تو ملایا نہ جائے گا
غم ہجر اور اس پہ رشک رقیب
مرض میں مرض دوسرا ہو گیا

(سخن شعراء، ص ۳۱)

مرزا محمد سلیمان قدر تسخیر

''تسخیر تخلص، مرزا محمد سلیمان قدر بہادر تسخیر نبیرۂ مرزا آسمان قدر نمود گورگانی مقیم لکھنؤ، شاگرد میر ہادی بے خود۔ غدر کے بعد والد بزرگ وار کے ہم راہ بنارس چلے گئے۔ وہاں مرزا صابر کی تحریک سے شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد ۱۳۰۵ھ میں پھر لکھنؤ میں رہائش اختیار کی اور مشاعرے کی بنا ڈالی۔ ان کے بیٹے مرزا حیدر قدر ماہ نے اس کا دیوان چھپوا دیا ہے''

(خم خانۂ جاوید جلد دوم، صفحہ ۵۴، ۵۵ مطبوعہ دہلی ۱۹۱۱ع)

مرزا غلام فخر الدین

''تہور تخلص، مرزا غلام فخر الدین برادر حقیقی مرزا قادر بخش صابر، شاگرد حافظ عبدالرحمان خاں احسان و مومن خاں دہلوی، عین شباب میں انتقال کیا:

سنتے ہی نام غیر تہور بھی ہے غضب
اس جنگ جو سے لڑنے کو تیار ہو گیا

لے آئے ذرا خط کا جواب اس سے کسی ڈھب
افسوس کہ قاصد سے اب اتنا نہیں ہوتا

ناصحا پند و نصیحت تو نہ کر محفل میں
کہ مرے ساتھ کوئی اور بھی رسوا ہو گا

اب ہے کیا باقی جو ہے کاوش تری دست جنوں
چاک داماں ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا

(سخن شعراء، ص ۹۴)

’’فروغ تخلص محمد عمر سلطان دہلوی خلف مرزا قادر بخش صابر تخلص:

دیا ہو جھوٹ ہی گو نامہ بر نے مژدۂ وصل
پر اس کے کہنے سے دل کو تو یک قرار آیا

کیا ہو آپ نے گو سچ ہی وعدہ آنے کا
یہ سوچیے تو کہ مجھ کو کب اعتبار آیا

لے کے آتے ہو ساتھ غیروں کو
باز آیا میں اس عنایت سے

(سخن شعراء، ص ۳۶۶)

’’جعفر: مرزا جعفر بخت بہادر جعفر نبیرہ برادر مرزا قادر بخش صاحب بہادر صابر گورگانی ۱۸۷۲ء میں حیات تھے اور بنارس میں رہتے تھے۔ فن سخن میں غالباً اپنے نام ور بزرگ حضرت صابر سے مشورہ لیتے تھے۔ چند غزلیں ہنگام ترتیب تذکرہ نظر سے گزریں۔ ان کا انتخاب حاضر ہے۔ کلام سے پایا جاتا ہے کہ تلاش مضمون و الفاظ اچھی اور بندش چست ہے۔‘‘

(خم خانۂ جاوید، جلد دوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۱۱ع، صفحہ ۲۳۱)

''مخفی تخلص، سلطان جہاں بیگم نام۔ صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر کی بیوی تھی۔ سنا ہے کہ اس مرحومہ کا کلام بہت ہے۔ لیکن یہ دو شعر اس کے میسر آئے ہیں:

لنڈھائی مے کہ پئیں خفتگان خاک شراب
قسم خدا کی عسس کو بڑا ثواب ہوا
خدا جانے کیا بات ہے اس میں مخفی
کہ اس ظلم پر جی بھاتا بہت ہے''

(بہارستان ناز از فصیح الدین رنج میرٹھی۔ اتمام تصنیف ۱۸۶۴ع، طبع ثالث مطبع عثمانی میرٹھ ۱۸۸۲ع صفحہ ۸۶)۔ اس کے علاوہ درگا پرشاد نے مرأت خیالی میں ان کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ صابر کی زندگی ہی میں ان عفیفہ کا انتقال ہوا۔ چنانچہ صابر۔ ان کی وفات پر قطعۂ تاریخ بھی لکھا۔ فرماتے ہیں:

''تاریخ وفات ملکۂ ملکی جناب نواب جہاں سلطان بیگم صاحبہ مرحومہ و مغفورہ زوجۂ مصنف:

سلطان جہاں جہاں جہاں بود
زینت دہ دودمان شاہی
چوں رخت حیات زیں جہاں بست
در جادۂ خلد گشت راہی
آں مہر چوں شد بہ برج خاکی
شد تیرہ ز ماہ تا بہ ماہی
تاریخ وفات گفت صابر
ویرانی خانہ شد الٰہی''

۱۲۸۳ھ

(ریاض صابر، ص ۲۷۳)

''قطعۂ تاریخ وفات برادر صاحب مرزا فیاض الدین بہادر مرحوم رئیس شاہ زادگان بنارس وخسر فرزند مصنف:

حلم بحر سخا و معدن جود

در جاں را بہ تار مرگ بسفت

عقل سال وفات آں ذی قدر

فخر شہزادگی ہند بگفت''

۱۲۸۶ھ

دیگر برائے لوح مزار:

لحد مرزا فیاض الدین ۱۲۸۶ھ

(ریاض صابر، ص ۲۷۲)

صابر کے دل شاگردوں کی تعداد چوبیس ہے۔ سخن شعراء میں عبدالغفور نساخ نے اٹھارہ شاگردوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے نام اور تخلص یہ ہیں:

۱۔ آرزو	مرزا علاؤالدین
۲۔ ارشد	عبدالغنی
۳۔ افسر	مرزا محمد دہلوی
۴۔ ایجاد	مرزا رحیم الدین
۵۔ بسمل	حافظ محمد حسین
۶۔ بلند	صفدر علی بیگ
۷۔ پریشاں	عبدالرحیم دہلوی
۸۔ تپش	یوسف علی
۹۔ تیمور	مرزا سعادت سلطان

۱۰۔سپہر　　　شتاب خاں

۱۱۔شاہی　　　مجاہد الدین دہلوی

۱۲۔فروغ　　　محمد عمر سلطان

۱۳۔قناعت　　　مرزا غلام نصیر الدین

۱۴۔قیس　　　سید مرزا علی دہلوی

۱۵۔ماہر　　　جمعیت شاہ

۱۶۔مظفر　　　مرزا مظفر

۱۷۔موزوں　　　قادر بخش

۱۸۔ناصر　　　مرزا محمد علی بیگ

بعض دوسرے ذرائع سے مندرجہ ذیل شاگردوں کا پتا بھی چلتا ہے۔ان میں بیوی اور دوسرے رشتہ دار بھی شامل ہیں:

شوخی:　　نادر شاہ، رام پوری۔

فائز:　　مولوی محمد حسن فائز بنارسی۔

شاکر:　　مرزا محمود شاہ۔

(رسالہ زبان دہلی ستمبر ۱۸۹۴ء میں شاکر کی غزل ہے)۔

مخفی: سلطان جہاں زوجۂ صابر۔

نامی: میرزا شجاع خلف مرزا داؤد شاہ۔مرزا قادر بخش صابر مؤلف گلستان سخن کے نواسے خاندان تیموریہ سے ہیں۔چھبیس برس کی عمر، پہلے اپنے نانا کے شاگرد تھے۔اب نواب مرزا خاں داغ سے مشورہ ہے۔اگرچہ دہلی ان کا وطن ہے مگر اب یہیں مقیم ہیں، یہ ان کا کلام ہے:

دل تھام کے بیٹھے وہ جگر تھام کے اٹھے
اتنا تو کیا ہے میرے نالوں نے اثر آج

کچھ نشہ ہے کچھ نیند ہے کچھ شرم و حیا ہے
آنکھوں سے کھلا رات کی صحبت کا اثر آج

صابر کے پوتے مرزا اکرم بخت ترحم بھی شاعر تھے۔ 'جلوۂ یار' میرٹھ کے فروری ۱۹۱۱ء کے شمارے میں ص ۱۰ پر ان کے بارے میں مندرجہ ذیل اندراج پایا جاتا ہے:

''جناب شاہ زادہ مرزا اکرم بخت صاحب ترحم گورگانی خلف شاہ زادہ مرزا قیصر بخت صاحب فروغ مرحوم:

جدائی میں جناب دل نہ تم اس طرح مضطر ہو
خدا جانے وصال یار کب ہو اور کیوں کر ہو
مقابل روئے دلبر کے گر خورشید محشر ہو
یقیں ہے وہ بھی حیراں ہو یقیں ہے وہ بھی ششدر ہو
وہ دل بھی مانگتے ہیں مجھ سے لیکن شرط بھی یہ ہے
کوئی اچھے سے اچھا ہو کوئی بہتر سے بہتر ہو
وہ آ کر حال پرسی بھی مری اس طرح کرتے ہیں
کہو کیا رنگ ہے کیسے ہو کس کے غم میں مضطر ہو
نہیں ہے وہ تو اس میں کس قدر وحشت برستی ہے
اگر وہ حور وش آ جائے تو جنت مرا گھر ہو
فراق برق وش میں صورت سیماب مضطر ہوں
جواب ابر تر اپنا نہ کیوں کر دیدۂ تر ہو
ترحم کیوں نہ ہو بزم سخن میں آپ کی شہرت
نبیرے حضرت صابر کے ہو اچھے سخن ور ہو''

۱۲۸۴ھ میں 'گل دستۂ انجمن' کے نام سے ایک مجموعۂ غزلیات مطبع اکبری سے شائع ہوا تھا جسے محمد عبدالکریم نے ترتیب دیا تھا۔ یہ روداد ان مشاعروں کی دو

نشستوں کی ہے جسے محمد کرم اللہ خان صاحب خلف محمد شفیع خان عرف منشی آغا جان صاحب اور محمد احسان الرحمان خان صاحب خلف اصغر نواب سیف الرحمان خان صاحب عرف موسیٰ خاں صاحب منعقد کراتے تھے۔ یہ مجلس مہینے میں دو بار برپا ہوتی تھی۔ انتظام میر عبدالرحمان خلف میر حسین تسکین کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں صابر کے کئی شاگردوں نے شرکت کی۔ مثلاً مرزا عبدالغنی ارشد صاحب عالم مرزا محمد عثمان افسر، شتاب خان سپہر، مرزا مجاہد الدین شاہی، مرزا علی قیس۔ خود قادر بخش صابر بھی شریک مشاعرہ ہوئے۔ روداد کے صفحہ گیارہ پر صابر کا کلام اس طرح درج ہے:

دودمان گورگانی حضرت صاحب عالم جہاں پرور مرزا محمد قادر بخش صاحب المتخلص بہ صابر، صاحب 'تذکرۂ گلستان سخن' از ارشد تلامذۂ جناب حافظ عبدالرحمان خاں احسان مغفور مرحوم، صاحب دیوان وفخر ہندوستان سلمہ اللہ تعالیٰ۔''

اس عنوان کے بعد طرحی مشاعرے کی ایک غزل ہے جس کے ۱۵ اشعر ہیں۔ مطلع یہ ہے:

یہ ضعف ہے تو کام بنایا نہ جائے گا
ہم سے ترے خیال میں جایا نہ جائے گا

اسی مشاعرے کی دوسری نشست میں مرزا محمد عثمان شاگرد صابر اور مرزا عبدالغنی ارشد شاگرد صابر بھی شریک ہوئے تھے اور غالب نے اس مشاعرے میں ایک غیر طرحی غزل پڑھی تھی۔ ان معاصر معلومات سے ہمیں صابر اور ان کے رشتے داروں اور شاگردوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات مل جاتی ہیں۔ لیکن ان اطلاعات میں صابر کی پیدائش کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ 'تذکرہ یادگار ضیغم' میں صفحہ ۲۶۷ تا ۲۶۸ پر صابر کے لڑکے مرزا قیصر بخت بہادر فروغ تخلص کے حالات درج ہیں اور ضمناً صابر کی عمر کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

''فروغ تخلص، مرزا قیصر بخت بہادر نام، شاہ زادگان دہلی سے ہیں۔ مرزا جواں بخت اک زمانے سے دہلی چھوڑ کر بنارس چلے آئے تھے۔ اس وقت سرکار انگلشیہ سے مواجب مناسب مقرر ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ سب ان کے خاندان پر ہفتم ہے اور ان سب میں ایک رئیس ہوتا ہے، چنانچہ اب ان کی خوش دامن رئیسہ ہیں۔ بغاوت مرزا ابوالظفر مرحوم شاہ دہلی نے کچھ اثر ان کے خاندان پر نہیں کیا۔ نواب گورنر جنرل بہادر اسی اعزاز سے ان کی ملاقات کرتے ہیں۔ اب باصرار صاحبان انگریز ڈپٹی انسپکٹر مدارس حمیر (ہمیر) پور ہیں۔ علم مناسب ہے شعر فارسی اردو خوب کہتے ہیں۔ آدمی خوش رو خوش اخلاق ہیں، اکثر ان کے شاگرد بنارس، جون پور وغیرہ میں موجود ہیں۔ ان کو تلمذ اپنے والد مرزا قادر بخش صابر مرحوم سے رہا ہے۔ وہ تیموریہ خاندان میں تھے۔ شعر گوئی سے بہت شوق تھا۔ عبدالرحمان خاں احسان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ذوق و غالب و مومن کے ہم طرح رہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی امام بخش صہبائی کو بھی کلام دکھاتے تھے۔ ۸۰، ۸۲ برس عمر پا کر ۱۳۰۰ھ میں وفات پائی۔ ان کی عمر چالیس برس کی ہے۔ چند شعر اردو تذکرہ کے دیے جاتے ہیں۔

بڑھ گئی بعد مرے گرمی وحشت میری
مثل سیماب گزوں اڑتی ہے تربت میری (۲ شعر)''

(یادگار ضیغم)

اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ جب ۱۳۰۰ھ میں اسی یا بیاسی برس کی عمر میں صابر کا انتقال ہوا تو پیدائش ۱۲۱۸ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ 'ریاض صابر' کے اوپر درج شدہ اقتباس سے ہمیں معلوم ہے کہ ۱۲۹۹ھ میں صابر کا انتقال ہوا اور پیدائش ۱۲۲۳ھ تھی، وفات کے وقت عمر ۷۶ برس ہوتی ہے۔ گلستان سخن میں مرزا سلیمان شکوہ کے حال میں صابر نے لکھا ہے:

''مدت سے لکھنؤ اور بیشتر مستقر الخلافت آگرے میں تشریف فرما رہے۔ راقم کی یاد میں حضرت شاہجہان آباد میں رونق افروز ہوئے تھے، پھر سرزمین اکبرآباد میں تشریف لے جا کر قیام کیا اور بعد مدت اسی گلشن فیض سے گلزار جناں کی طرف کوچ کیا۔''

(گلستان سخن، ج اول، ص ۲۰)

سلیمان شکوہ ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ میں فروکش ہوئے اور غازی الدین حیدر کے اعلان بادشاہت کے موقع پر ۱۲۳۴ھ میں انہوں نے لکھنؤ چھوڑا، کاس گنج گئے، وہاں سے آگرے میں سکونت پذیر ہوئے اور ۲۹ ذیقعدہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۸۳۸ع کو انتقال کیا۔ صابر کے بیان کے مطابق گویا وہ ۱۲۳۴ھ کے بعد اور ۱۲۵۳ھ سے پہلے دلی آئے تھے۔ 'بعد مدت' کا قرینہ یہ کہتا ہے کہ ۱۲۳۴ھ کے لگ بھگ ہی دلی کا سفر کیا ہوگا۔ اس وقت (۱۲۳۴ھ) صابر کی عمر اتنی ضرور تھی کہ انہیں شاہ زادے کی آمد کا حال یاد رہا۔

تصانیف

صابر 'گلستان سخن' کے علاوہ صاحب دیوان بھی تھے اور ان کا یہ دیوان ان کے انتقال کے بعد سید محمد سلطان عاقل دہلوی نے شائع بھی کیا تھا۔ عاقل صابر کے شاگرد تھے اور انہوں نے اس منظوم مجموعے کو ۱۳۰۵ھ میں ترتیب دیا۔ گلستان سخن پر تفصیلی مضمون آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیے یہاں پر 'ریاض صابر' کے بارے میں بعض تفصیلات شاید بے موقع نہ ہوں گی۔ وھوہذا:

۱۔ صفحہ ۲ سے ۸ تک مرتب دیوان سید محمد سلطان عاقل دھلوی یا دیباچہ ہے۔

۲۔ اس کے بعد دیوان غزلیات ردیف وار شروع ہوتا ہے۔ صفحہ ۱ سے ۲۶۵ تک دیوان غزلیات ہے۔ صفحہ ۲۶۶ سادہ ہے، صفحہ ۲ پر 'اشعار متفرقات' ہیں۔

۳۔ صفحہ ۲۶۸ پر 'قطعات' شروع ہو جاتے ہیں۔ کل ۷ قطعات ہیں جو صفحہ

۲۶۹ پر ختم ہو جاتے ہیں۔

۴۔ صفحہ ۲۶۹ سے ہی 'رباعیات' شروع ہو جاتی ہیں جو صفحہ ۲۷۲ پر ختم ہو جاتی ہیں۔

۵۔ صفحہ ۲۷۳ سے 'قطعات تاریخیہ' شروع ہوتے ہیں۔ پہلا قطعہ 'تاریخ وفات مرزا فیاض الدین بہادر' کا ہے جس سے سن ۱۲۸۶ھ نکلتا ہے۔ دوسرا قطعہ 'تاریخ پیدائش مولوی محمد عبدالسلام ابن محمد فیض القدیر' کا ہے جس سے سن ۱۲۷۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ تیسرا قطعہ 'تاریخ وفات نواب جہاں سلطان بیگم زوجۂ مصنف' کا ہے جس کا سن ۱۲۸۳ھ ہے۔ چوتھا قطعہ 'تاریخ انتقال مولوی فیض القدیر' کا ہے جس سے سن ۱۲۹۷ھ نکلتا ہے۔ پانچواں قطعہ 'تاریخ وفات شاہ غلام فرید' ہے جس سے سن ۱۲۶۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ چھٹا قطعہ 'تاریخ وفات شیخ ابراہیم ذوق دہلوی' کا ہے جس سے سن ۱۲۷۱ھ نکلتا ہے۔ ساتواں قطعہ 'تاریخ بربادئ دہلی' کا ہے جس سے سن ۱۲۷۴ھ نکلتا ہے۔ آٹھواں قطعہ 'تاریخ طبع کتاب 'کان تاریخ' مصنفہ ناظر رام پرشاد طاہر' کا ہے جس سے سن ۱۲۹۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ آخری قطعۂ تاریخ صفحہ ۲۷۵ پر ہے۔ کل ۸ قطعات تاریخ ہیں۔

۶۔ صفحہ ۲۷۵ سے ہی 'قصیدہ درنعت' شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۲۸۱ پر ختم ہوتا ہے۔ صرف یہی ایک قصیدہ ہے۔

۷۔ صفحہ ۲۸۱ سے 'سلام' شروع ہوتا ہے، دوسرا سلام صفحہ ۲۸۲ سے شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۲۸۳ پر ختم ہو جاتا ہے۔ صرف دو سلام ہیں۔

۸۔ صفحہ ۲۸۳ سے 'مخمسات' شروع ہو جاتے ہیں۔ کل ۵ مخمسات ہیں جو صفحہ ۲۹۳ پر ختم ہو جاتے ہیں۔

۹۔ صفحہ ۲۹۳ سے 'واسوخت' شروع ہوتا ہے جو بہ صورت مسدس ہے۔ یہ واسوخت صفحہ ۳۰۴ پر ختم ہوتا ہے۔

۱۰۔ اس کے بعد ۳۰۵ سے 'سراپائے معشوق بے وفا' بہ صورت مسدس ہے جو صفحہ ۳۱۰ پر ختم ہوتا ہے۔ صفحہ ۳۱۰ پر ہی 'تمام شد کلیات حضرت صابر مرحوم' ہے۔ یہاں پہنچ کر مرزا قادر بخش صابر کا کلام ختم ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ اس کے بعد صفحہ ۳۱۱ سے مصنف (مرزا قادر بخش صابر) کی وفات کے قطعات تاریخیہ ہیں۔ پہلا قطعہ تاریخ انتقال، مصنف کے صاحب زادے مرزا قیصر بخت بہادر المتخلص بہ فروغ کا ہے جو صفحہ ۳۱۵ پر ختم ہوتا ہے، سن ۱۲۹۹ھ نکالا ہے۔ اس کے آخر میں فروغ نے 'تاریخ انطباع دیوان کے لیے دو شعری فارسی قطعہ کہا ہے۔ دوسرا قطعہ تاریخ انتقال مصنف قاضی وزیر حسن صاحب عطارد کا ہے جو صفحہ ۳۱۷ پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا قطعہ تاریخ، مولوی محمد ناصر صاحب الہام کا ہے۔ الہام نے تین قطعات کہے ہیں۔ آخری قطعہ تاریخ نواب حافظ محمد زکریا خاں صاحب ذکی دہلوی کا ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ صفحہ ۳۱۸ پر یہ قطعات تاریخ وفات مصنف ختم ہو جاتے ہیں۔ تمام قطعات سے سن ۱۲۹۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ کتاب کے صفحات کی ترتیب بھی یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ آخری صفحہ ۳۱۸ ہے۔

۱۲۔ آخر میں ۱۲ صفحات کا ایک ضمیمہ ہے جو ایک تقریظ اور چند قطعات تاریخ طبع کتاب پر مشتمل ہے۔ تقریظ حکیم سید محمد علی حسین خاں صفوی المعروف بہ حکیم انور آغا المتخلص بہ عالم و خرد لکھنوی ابن مظفر الدولہ ناصر الملک مرزا حسن علی خاں بہادر نصرت جنگ کی ہے۔ اردو نثر کی یہ تقریظ صفحہ ۷ پر ختم ہوتی ہے۔ اسی صفحے پر اس تقریظ کے ختم ہونے کے بعد تقریظ نگار نے دو قطعات تاریخ انطباع کتاب کہے ہیں۔ پہلا اردو میں اور دوسرا فارسی میں۔ ہر ایک سے سن ۱۳۰۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے بعد مرقومۃ الذیل شعرائے کرام نے قطعات تاریخ انطباع کتاب کہے ہیں:

۱۔ نواب مرزا خاں صاحب المتخلص بہ داغ دہلوی دو قطعے ہیں۔ پہلا اردو

میں اور دوسرا فارسی میں۔

۲۔ سید ظہیر الدین حسین عرف نواب مرزا المتخلص بہ ظہیر دہلوی شاگرد ذوق۔ تین شعر کا اردو قطعہ ہے۔

۳۔ نواب وحید الدین احمد خاں متخلص بہ وحید۔ پہلا قطعہ فارسی میں ہے اور دوسرا اردو میں۔

۴۔ سید محمد کاظم حسین حبیب کنتوی المتخلص بہ حبیب۔ فارسی قطعہ ہے جس سے سن ۱۳۰۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

۵۔ جناب سید محمد کاظم حسین المتخلص بہ شیفتہ کنتوری فارسی قطعہ ہے جس سے سن ۱۳۰۵ھ نکلتا ہے۔

۶۔ جناب میر اصغر حسین صاحب المتخلص بہ ناجی۔ اردو قطعہ ہے۔

۷۔ جناب مرزا جان بیگ صاحب صادق دہلوی۔ اردو قطع ہے۔

۸۔ جناب سید الطاف حسین قابل، شاگرد عاقل دہلوی۔ اردو قطعہ ہے۔

یہ آخر قطعہ ہے جو صفحہ ۱۲ پر ختم ہوتا ہے۔

ماہ صفر کے آخری چہار شنبے کے متعلق مرزا قادر بخش صابر فرماتے ہیں:

صفر کا آخری ہے چار شنبہ گھر سے شاہوں کے
بٹا کرتے ہیں چھلے یہ بھی اک رسم شہانہ ہے
شۂ خوباں ہو تم بھی ایک چھلا ہاتھ کا اپنے
نشانی گر ہمیں بھیجو تو یہ اچھا بہانہ ہے

اسی موضوع سے متعلق دوسرا قطعہ ملاحظہ فرمائیے:

آخری چار شنبے کو سب لگ
روند کر سبزہ، عید کرتے ہیں
ہم جو عاشق مزاج ہیں تو آج

سبزہ رنگوں کی دید کرتے ہیں

اس موضوع پر مرزا غالب کا قطعہ ملاحظہ فرمائیے:

ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر، چلو
دکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند
جو آئے، جام بھر کے پیئے، اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند
غالب یہ کیا بیاں ہے، بجز مدح بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہیں جن کے آگے سیم و زر و مہر و ماہ ماند

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں چار شنبہ آخر ماہ صفر کو شاہی تقریب کی صورت میں منایا جاتا تھا۔ شاہی دربار میں لوگ قصیدے پیش کرتے تھے۔ چھلوں کے بٹنے کی رسم کا ذکر صابر کے قطعے میں موجود ہے اور سبزے کا روندنا بھی اسی قبیل سے ہے۔

ریاض صابر کی کیفیت اسی قدر ہے۔ اس کے بعد ’گلستان سخن‘ کا تفصیلی جائزہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

خلیل الرحمان داؤدی

عرض مرتب

تذکرۂ ’گلستان سخن‘ کی تالیف کا آغاز ۱۲۷۰ھ میں اور اختتام ایک سال کے بعد آخر شوال ۱۲۷۱ھ میں ہوا۔ اسی زمانے میں یہ پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اس کی پہلی اشاعت کے سرورق پر تذکرے کے نام کے ساتھ ۱۲۷۱ھ دیا ہے اور کہیں سنہ انطباع موجود نہیں ہے، لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ یہ تذکرہ پہلی مرتبہ اسی زمانے

میں (۲۔۱۲۷۱ھ) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسری مرتبہ اسے مطبع نول کشور نے شائع کیا۔ یہ اس تذکرے کی تیسری اشاعت ہے۔ موجودہ متن کی تصحیح و ترتیب کے دوران میں مرقومۃ الذیل دونوں اشاعتیں میرے پیش نظر رہی ہیں:

(۱) تذکرۂ گلستان سخن، مطبوعہ در مطبع مرتضوی دہلی، باہتمام حافظ محمد غیاث الدین، صفحات ۵۰۰، سن طباعت ۲۔۱۲۷۱ھ۔ یہ اس تذکرے کی اشاعت اول ہے۔

(۲) تذکرۂ 'گلستان سخن' مطبوعہ در مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ع)۔ یہ اشاعت دوم ہے۔

اب 'مجلس ترقی ادب' لاہور سے یہ تیسری مرتبہ شائع ہو رہا ہے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اپنی گوناگوں مصروفیات کے پیش نظر اس تذکرے پر کوئی جامع مقدمہ نہیں لکھ سکا۔ مقدمے کے لیے مواد بھی اچھا خاصا جمع کر لیا تھا، لیکن اسے ترتیب دینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

میں نے مجلس سے درخواست کی کہ یہ کام کسی اور شخص کے سپرد کر دیں۔ مجھے انتہائی خوشی ہے کہ یہ کام اس سے لیا گیا جو میرے نزدیک اس قسم کے کاموں کے لیے سب سے زیادہ اہل ہے۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے انتہائی فاضلانہ انداز میں 'گلستان سخن' کا تجزیہ کیا ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ میں اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکر گزار ہوں۔ مقدمے کا جزو اول 'مولف کے حالات زندگی و تصانیف' بے شک میری تحریروں پر مبنی ہے لیکن یہ بھی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے حسن اعتنا کا پرتو ہے۔ فقط

خلیل الرحمان داؤدی

ٹیگور پارک، لاہور

۲۹۔ اکتوبر ۱۹۶۶ع

گلستان سخن کا تجزیہ

ڈاکٹر وحید قریشی

(۱)

شاہ زادہ قادر بخش صابر، مغلیہ خاندان کا چشم و چراغ، جس کے خاندان اور اولاد میں کئی اردو اور فارسی کے شاعر گزرے ہیں، شعر و شاعری میں دسترس رکھتا تھا۔ اس کا ثبوت اس کے دیوان 'ریاض صابر' سے بہ خوبی ہو سکتا ہے۔ گلستان سخن میں بھی اس کے جو حالات درج ہیں ان سے ان کی شعر گوئی کے بارے میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں رہتی، لیکن تذکرہ نگاری کی بات دوسری ہے۔ اس میں خود گلستان سخن کی ابتدائی اشاعت میں سرورق کی عبارت ہے کہ یہ صہبائی کی اصلاح سے مزین ہے۔ اور صابر کے معاصر تذکرہ نگاروں میں بھی بعض اسے صابر کی تصنیف نہیں مانتے۔ باوجودیکہ سرورق پر صابر کا نام بہ طور مصنف درج ہے۔ شاہ بہاؤ الدین بشیر معروف بہ عبداللہ شاہ، جو شاہ نصیر کے چھوٹے بیٹے نجم الدین کے حقیقی نواسے تھے اور جنہوں نے (بہ قول صاحب 'خم خانۂ جاوید' جلد اول، ص ۷۹۶) ۱۹۰۱ء کے لگ بھگ وفات پائی تھی، بشیر کا بیان ہے(۱):

''گلستان سخن ۱۲۷۱ھ صاحب عالم مرزا قادر بخش صابر کے نام سے مشہور ہے، مگر حقیقت میں ان کے استاد مولوی امام بخش صہبائی جنت ماوائی کی تصنیف ہے۔ اس کی عبارتیں اس بات کی شاہد ہیں اور اس شہر کے

۱۔ گارسیں دتاسی نے اردو تذکروں پر ۱۸۵۵ء میں ایک کتابچہ لکھا تھا، اس کی اشاعت کے دورے سال شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا (گارساں دتاسی از ڈاکٹر زور ص ۳۴)۔ خوش قسمتی سے یہ ترجمہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کے حاشیوں پر بغیر دستخطوں کے بے

شمار قلمی حواشی درج ہیں۔ یہی تحریریں بعض دوسری کتابوں پر موجود ہیں اور وہاں بشیر کا نام صاف طور پر مرقوم ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں یہ حواشی، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، بشیر ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ۱۸۵۴ء یا ۱۸۵۵ء میں گلستان سخن تکمیل کو پہنچا تھا اس لیے مقالۂ دتاسی کے متن میں اس تذکرے کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن طبع ثانی کے وقت، جس کی نوبت ۱۸۶۸ء میں آئی، گارسیں دتاسی نے نظر ثانی کی اور دوسرے ایڈیشن میں گلستان سخن کے بارے میں وہ عبارت شامل کر دی جو 'خطبات گارساں' میں لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر ریاض الحسن نے رسالہ 'اردو' جنوری ۱۹۵۰ء میں گارسیں دتاسی کے مقالے کی اسی طبع ثانی کا اردو ترجمہ اردو تذکرے کے عنوان سے شایع کیا (گلستان سخن کے لیے دیکھیے یہی مقالہ ص ۹۱) بہ ظاہر ریاض الحسن صاحب ذکاء اللہ کے اردو ترجمے سے ناواقف ہیں۔

''خاص خاص اشخاص کو یہ حال معلوم ہے۔''

(حاشیہ اردو تذکرے ص ۱۳)

پھر فرماتے ہیں:

''گلستان سخن ۱۲۷۱ھ مرزا صاحب کے نام سے مشہور ہے مگر درحقیقت مولوی صہبائی کی تصنیف ہے۔ اس میں فارسی اردو دونوں زبانوں کے شاعروں کا حال و مقال مندرج ہے۔''

(ایضاً ص ۱۷)

دوسری معاصر شہادت غالب کی ہوسکتی ہے لیکن ان کے بیانات متضاد ہیں۔ ایک خط میں وہ ذکاء کو لکھتے ہوئے گلستان سخن کو صابر کا تذکرہ قرار دیتے ہیں لیکن اس سے پہلے انہوں نے شفیق کو جو خط لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں کہ ''صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کر رہا ہوں۔'' معلوم نہیں اس مقام پر اس سے مراد گلستان

سخن ہے یا صہبائی کے انتخاب دواوین کا ذکر کر رہے ہیں جو خود ایک تذکرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عبدالغفور نساخ 'سخن شعراء' میں 'گلستان سخن' کو صہبائی کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ ان کا اقتباس یہ ہے:

''تذکرہ گلستان سخن ان (صابر) کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں تذکرہ مذکور مولوی امام بخش صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔'' (سخن شعراء ص ۲۷۲)

دور حاضر میں بھی یہ اختلاف چل رہا ہے۔ چنانچہ 'خم خانہ جاوید' از لالہ سری رام دہلوی میں دیباچے کے پہلے اور دوسرے صفحے پر ہے:

''اس خیال سے مختلف تذکروں کی فراہمی اور مطالعہ شروع کیا، مگر افسوس ان میں سے کوئی بھی دل میں نہ کھبا۔ آب حیات، جو تلاش و تحقیقات کی انتہا تنقید حسنہ کا قابل قدر نمونہ اور اردو ادب و زبان کی خدمت میں ایثار کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور اعلیٰ انشاء پردازی کا ایک بے مثال مرقع ہے، اس کی نسبت شروع سے میرا یہ خیال تھا کہ یہ تذکرہ محققان زبان و مشتاقان عروض اور خاص کر مشتاقان انشاء پردازی کے حق میں خضر راہ ہوگا اور آب حیواں کا کام دے گا، مگر جب مجھ تشنہ لب سخن کی ان اوسوں سے پیاس نہ بجھی تو کسی دوسرے سرچشمے کی تلاش ہوئی کیوں کہ اس کے جامع نے اول تو اس میں خاص الخاص چند مشاہیر شعراء کے حال اور برائے نام کلام کے سوا دیگر مشتاقان سخن سے غرض نہیں رکھی، دوسرے کلام بھی لیا تو بہ طور نمونہ ہی لیا، انتخاب کا حظ نہ آنے دیا۔ گو انہوں نے مجبوراً یہ امر اختیار کیا ورنہ چار دور کیا وہ ایک دور کے شاعر بھی نہ لکھ سکتے۔ مگر اس سے وہ بات نہ ہوئی جس سے اپنی طبیعت کھلتی اور ان اہل درد کا میلان طبع معلوم ہوتا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو جدید و قدیم بیسیوں تذکرے دیکھ ڈالے، سیکڑوں بیاضیں وقف نظر کر دیں، لیکن افسوس صد افسوس جملہ تذکروں کو عام اور ہمہ گیر پایا۔ ان مدونوں نے رطب و یابس، خاص و عام بلکہ عوام الناس میں بھی کچھ تمیز نہ رکھی۔ یہاں تک کہ بعض تذکرے تو عامیانہ

درجے پر پہنچ گئے۔ بھرتی کے شاعروں اور ان کے کلام کی وہ بھرمار دیکھی کہ ان سے طبیعت بھر گئی۔ اس طوفان بے تمیزی میں تو لنگڑے لولے ہر قسم کے سوار بھرتی تھے۔ جنہیں قافیے کی خبر، نہ ردیف کی سدھ، خوبی مضمون سے بحث، نہ موزونیت سے لہنا۔

ہاں گلستان سخن، گلشن بے خار اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ دونوں تذکرے مجھے پسند آئے اور

دل سے پسند آئے۔ ارکان تذکرہ نویسی سے مالا مال، محققانہ پابندی سے اپنے مدونوں کا کمال دکھا رہے تھے۔ لیکن گلستان سخن نے، جس کی تدوین مولانا امام بخش صہبائی نے کی اور مرزا قادر بخش صابر نے اپنے نام سے چھپوایا، دہلی سے آگے قدم بڑھانے کو عار سمجھا۔ لفظ صابر کی رعایت سے اس نے شاہجہانی شہر پناہ کے اندر کی زمین کو زمین اور اس کے اوپر کے آسمان کو آسمان جانا۔ صرف سرو قدان دہلی سے کام رکھا، باہر کے لہلہاتے ہوئے شمشادوں کو وہیں کا وہیں کھڑا رہنے دیا۔ البتہ دوسرے گلشن سدا بہار سے خاص خاص رنگ کے پھول چنے اور ان کے گل دستے بنائے، مگر پھر بھی چمنستان سخن کے صدہا خوش نما پھول گل چیں کی مہربانی یا تغافل (جو چاہو اس کا نام رکھ لو) کی بدولت اپنی شاخوں پر پژمردہ ہو کر رہ گئے۔''

دیباچے کے صفحے پر لالہ سری رام لکھتے ہیں:

''جن جن تذکروں سے ہم نے مدد لی ان کے نام نامی ذیل میں درج ہیں:

گلستان سخن، گلشن بے خار، نغمۂ عندلیب، انتخاب یادگار، سخن شعراء، سراپا سخن، آب حیات، شمیم سخن، تذکرہ شعرائے دکن، طبقات الشعرائے شوق، تذکرہ قاسم، تذکرہ مصحفی، تذکرہ منوالال، مشع سخن [انجمن؟]، مجموعۂ یوسفی، ریاض فردوس، تذکرہ نواب کلب حسین نادر، طور کلیم، طراز عشق، غنچۂ ارم، تذکرۂ شبستان عالم گیری، آثار الشعراء، چمنستان کشمیر، مجموعۂ سخن، تذکرۂ شعرائے پٹنہ، تذکرہ لطف، جلوۂ خضر، نکات

الشعراء، فرح بخش، طبقات الشعراء (جسے ڈاکٹر فیلن صاحب نے فرنچ زبان سے گارسن ڈی ٹیسی کے تذکرے سے اردو میں ترجمہ کرایا اور مولوی کریم الدین نے اس میں اپنے وقت کے شعراء کو بڑھا کر قبل از غدر چھاپا) تذکرہ شعرائے ہنود، تذکرہ شعرائے بدایوں، تذکرہ شعرائے ٹونک، تذکرۂ ضیغم، تذکرہ مولوی مظہر الحق، غرض:

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم   زہر خرمنے خوشۂ یافتم"

قاضی عبدالودود صاحب نے بھی گلستان سخن کے بارے میں دو جگہ تفصیلی رائے کا اظہار کیا ہے۔ رسالہ 'معاصر' پٹنہ کے حصۂ اول صفحۂ ۷ پر فرماتے ہیں:

"گلستان سخن جس کا ایک نام آثار المعاصرین بھی ہے، شعبان ۱۲۷۰ھ میں شروع ہو کر شوال ۱۲۷۱ھ میں تمام اور اسی سال طبع ہوا۔ سرورق میں قادر بخش صابر کا نام بہ حیثیت مصنف درج ہے، لیکن اس کے بعد ہی یہ مرقوم ہے کہ اس کی عبارات صہبائی کی اصلاح سے مزین ہیں۔ غالب ۸۲ھ کے ایک خط میں ذکاء کو لکھتے ہیں" آپ صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں..... غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا۔ اب ایک مجلد کہیں نظر نہیں آتا..." (اردوئے معلیٰ، ص ۲۸) لیکن ایک قدیم تر خط میں شفق کو لکھ چکے ہیں کہ صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کرتا ہوں (ص ۳۳۱)۔ نساخ اور سری رام اسے صہبائی کی تصنیف بتاتے ہیں اور قرائن دلالت کرتے ہیں کہ یہ غالب کے قول پر مبنی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ مقدمے کے مطالب علمی اور تذکرے کی عبارت صہبائی کی ہے اور شعراء کے حالات اور اشعار دونوں نے جمع کیے ہیں۔ اس لیے اگر اسے دونوں کی مشترک تصنیف کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ مقدمے میں (ص ۷۶) جن شعراء کا خاص طور پر ذکر ہے وہ احسان، نصیر، مومن، ذوق، غالب، شیفتہ، نیر، سوز، صہبائی اور ان سے الگ آزردہ کا ذکر ہے......."

(اقتباس از 'جہان غالب' مؤلفہ قاضی عبدالودود مشمولہ معاصر حصہ ۴، پٹنہ ص ۷)

اسی مجلّے کے صفحہ ۹۳ پر گلستان سخن کی تلخیص درج کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

ا۔ دیباچہ دستور فصاحت [امتیاز علی عرشی] میں ہے کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اصل تذکرے (گلستان سخن) کے مصنف صہبائی ہیں۔ اس قسم کی رائیں حسن ظن اور صاف دلی سے بعید اور پچھلے بزرگوں پر بغیر کسی دستاویزی شہادت کے سخت نکتہ چینی کا موجب ہیں، اس لیے میں اس کے ماننے پر آمادہ نہیں (ص ۱۰۳)۔ اگر دستاویزی شہادت سے صابر یا صہبائی کا اقرار نامہ مراد ہے تو یہ واقعی موجود نہیں، لیکن غالب 1 گلستان سخن شعراء صفحہ ۲۷۲ اور سری رام دیباچہ خم خانہ جاوید، جلد ۲ کی بھی یہی رائے ہے کہ صہبائی اور صابر کا بزرگان سلف میں ہونا خارج از بحث ہے غالب صہبائی کے ہم عصر ہیں، لیکن باوجود اس کے کہ لطائف غیبی میں غالب کی ستائش کا کائی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا، اس کا لفظ لفظ غالب کے قلم سے

ا۔ غالب نے شفق کو ایک کتاب بھیجی ہے جسے صہبائی کا تذکرہ کہا ہے۔ یقین کامل ہے کہ اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے (خطوط غالب ص ۳۳۱) اس کے برخلاف انہوں نے ذکاء کو لکھا ہے کہ آپ صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں۔ غدر سے پہلے چھپا تھا، اس کے نسخے ضائع ہو گئے، کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ تضاد حقیقی نہیں کہ ذکاء نے صابر کا تذکرہ مانگا ہوگا۔ غالب نے وہی لکھ دیا جو ذکاء نے لکھا تھا۔

ہے اور سیاح کو، جن کی طرف یہ منسوب ہے، اس سے مطلق سروکار نہیں۔ میرے نزدیک شعراء کے حالات و اشعار بیشتر صابر اور کم تر صہبائی کے فراہم کردہ ہیں، لیکن عبارت سراسر صہبائی کی لکھی ہوئی ہے اور مقدمے کے علمی مباحث کے وہ تنہا ذمہ دار ہیں۔ لیکن گلستان سخن سے قطع نظر صابر کی ایک سطر بھی موجود نہیں جسے ان کے ذی علم ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ یہ بات

کہ عبارت میں صہبائی کی اصلاح ہے، بار بار لکھی گئی ہے اور خلاف دستور سرورق میں بھی اس کا ذکر ہے۔ میرا خیال ہے کہ صہبائی کے دہلوی معاصرین اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کتاب دراصل صہبائی کی ہے اور رکھلا رازنساخ کو اپنے زمانۂ قیام دہلی میں انہیں سے معلوم ہوا۔ میرا قیاس ہے کہ سری رام نے بھی یہ بات بہ طور روایت سنی اور ان کا بیان غالب کے قول پر مبنی نہیں۔''

(ص ۹۲۔۹۳)

'تذکروں کا تذکرہ نمبر' کے مرتبت فرمان فتح پوری قاضی عبدالودود صاحب کے موقف کو درست تسلیم نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں وہ گلستان سخن کے تحت فرماتے ہیں:

''حیرت ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب بھی اس باب میں بعض باتیں غیر ذمہ دارانہ کہہ گئے ہیں۔ مثلاً محمد محفوظ الحق صاحب کے مضمون پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ گلستان سخن کے متعلق دہلی کے معتبر اصحاب کا بیان ہے کہ یہ دراصل صہبائی کی تالیف ہے.... یہ غلط ہے۔ گلستان سخن صہبائی کا نہیں، قادر بخش صابر ہی کی تصنیف ہے۔''

معاصر شہادتوں کی موجودگی میں فرمان فتح پوری کی رائے قابل تسلیم نہیں۔ گلستان سخن کے ابتدائی ۲۰۳ صفحات میں جو بحثیں اٹھائی گئی ہیں وہ صہبائی کے سوا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ صہبائی کی اپنی تحریریں موجود ہیں اس لیے یہ بحث محض دلائل کی حد سے گزر کر واقعات اور عبارات کی مدد سے طے کی جاسکتی ہے۔

(۲)

ا۔ صابر نے جہاں اور کئی ماخذوں کا حوالہ دیا ہے، وہاں بعض مقامات پر خود صہبائی کی تحریروں سے بھی استناد کیا ہے۔ اس سے قطع نظر ہمیں مندرجہ ذیل باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا:

ا۔ ہمارے پاس مطبوعہ صورت میں صہبائی کی کئی فارسی تحریریں موجود ہیں، لیکن اگر بحث کو صرف اردو کتابوں تک محدود کر دیا جائے جب بھی بحث کچھ نہ کچھ واضح نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ گلستان سخن کی تالیف سے پہلے صہبائی دو کتابیں لکھ چکے تھے۔ دہلی کالج کے استاد کی حیثیت سے انہوں نے پرنسپل بوترس کی فرمائش سے میر شمس الدین فقیر کی کتاب 'حدائق البلاغت' کا اردو ترجمہ (۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ع) کیا تھا۔ یہ کتاب فقیر کی کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ مختلف مقامات پر اختصار اور تفصیل سے بھی کام لیا گیا ہے اور مثالیں بھی فارسی کی بجائے اردو کی دی گئی ہیں۔ اسی طرح پرنسپل موصوف ہی کی فرمائش پر انہوں نے ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ع میں 'انتخاب دواوین شعرائے مشہور اردو زبان کا' کے نام سے ولی سے لے کر معاصرین تک چیدہ چیدہ شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا۔ ہر شاعر کے مختصر حالات دینے کے علاوہ ابتداء میں اصناف سخن پر تیس صفحات کا دیباچہ بھی لکھا۔ صہبائی کی یہ دونوں تحریریں گلستان سخن سے پہلے چھپ چکی تھیں۔ ذیل میں تذکرے کی بعض عبارتیں ان دونوں کتابوں کے بعض ضروری اقتباسات کے محاذ میں درج کی جاتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوگا کہ گلستان سخن کے ابتدائی حصے کی تالیف کے وقت یہی دو کتابیں پیش نظر تھیں۔ ان کے نفس مضمون اور اسلوب بیان میں اور گلستان سخن کے ابتدائی حصے میں ایک نسبت قریبہ پائی جاتی ہے:

انتخاب دواوین

معلوم کیا چاہیے کہ شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں اور اصطلاح شعراء میں ایک کلام ہے کہ وزن اور قافیہ رکھتا ہو اور شاعر نے اس کو شعر کے قصد سے کہا ہو۔ پس اگر ایک کلمہ ہو، یا زیادہ ہو، یا کوئی وزن اوزان مقررہ میں سے قافیہ نہ رکھتا ہو یا شاعر نے اوس کو شعر کے قصد پر نہ کہا ہو موافق اصطلاح کے وہ شعر نہیں۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ردیف کی ماہیت میں داخل نہیں۔ پس شعر بدون قافیے کے تمام نہیں ہوسکتا

ہے اور بدون ردیف کے تمام ہوسکتا ہے۔اور یہ ۹ مذہب ہے جمہور کا۔اسی واسطے بہت اشعار میں ردیف نہیں ہوتی۔چناں چہ یہ شعر سودا کا:

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا
تو آب و دانہ کو لے کر نہو گہر پیدا

کہ ''کا'' اور 'پیدا' قافیہ ہے اور اس کے بعد ردیف نہیں ہے۔(ص ۱۔۲)

گلستان سخن

پہلا مطلب حد شعر: جاننا چاہیے کہ شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں،یعنی دانستن اور اصطلاح میں کلام موزون مقفی کو۔جو کہ شعر کی تعریف کے تین جز ہیں کلام اور موزوں اور مقفی۔کلام اور وزن اور قافیے کے معنی کا بیان واجب ہوا تا کہ تعریف ما ینبغی دل نشین اور خاطر سامع میں جاگزین ہو جاوے۔اس واسطے لکھا جاتا ہے کہ کلام علم نحو کی اصطلاح میں ان دو کلمے یا زیادہ کا نام ہے کہ اسناد رکھتے ہوں،یعنی ایسی نسبت کہ مخاطب کو بعد سکوت قائل کے فائدہ تامہ حاصل ہو جاوے اور اس کو مرکب مفید بھی کہتے ہیں،جیسے زید قائم ہے لیکن تعریف مذکور میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ کلام سے مطلق الفاظ با معنی مراد ہیں،اسناد پر مشتمل ہوں یا نہ ہوں۔اسی واسطے بعضے اس تعریف میں بجائے کلام کے الفاظ با معنی ابراد کرتے ہیں،تا مرکب غیر مفید بھی، بشرط وزن و قافیہ،شعر کی تعریف میں داخل رہے۔جیسے یہ شعر:

وہ شوخ ستم کیش کہ اغوائے عدو ہے
عاشق کی دم مرگ بھی بالیں پہ نہ آیا

(صفحہ ۱۲۹)

پہلے جس شخص نے شعر وضع کیا ہے۔اس میں بہت اختلاف ہے۔بعضے کہتے ہیں اول شعر حضرت آدم نے کہا ہے۔چناں چہ دو تین شعر عربی کے کہ ان کی طرف منسوب ہیں،ترجمہ ہیں ان اشعار کا جو ہابیل کے مرثیہ میں کہے ہیں،جب قابیل

نے اوس کو قتل کیا تھا، اور وہ سریانی زبان میں تھے۔ اور کہتے ہیں کہ اول شعر عربی میں ایوب بن قحطان نے کہا اور فارسی میں بعضوں کے قول کے موافق بہرام گور اور بعضوں کے موافق ابو حفص حکیم سمرقندی نے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اردو میں پہلے اور کوئی شعر کہنے والا متحقق نہیں ہوسکتا، والا باقی شعرا جن کو واضع اشعار کا اور زبانوں میں قرار دیا جاتا ہے، اس میں اختلاف ہے کیوں کہ بعد تلاش کے ان سے پہلے بھی اور شاعر معلوم ہوئے ہیں۔ چناں چہ کتابوں میں اس کا حال مفصل لکھا ہے۔ اور ولی نے اپنے اشعار میں اور شعراء پر طنز کی ہے۔

(ص ۳۰۲)

ذکر موجد اشعار: بعضے ارباب تواریخ لکھتے ہیں کہ ایجاد شعر کا حضرت آدم علی نبینا وعلیہ السلام سے وقوع میں آیا ہے۔ جس وقت قابیل نے ہابیل کو قتل کیا، حضرت بابرکت نے اس کے مرثیے میں چند شعر فرمائے۔ جو کہ وہ اشعار عربی ہیں، عبارت اردو میں ان کا ایراد مناسب معلوم نہ ہوا۔ وہ اشعار کثرت شہرت سے اس مقام کی تحریر سے مستغنی ہیں۔ (ص ۱۳۲)

معلوم کیا چاہیے کہ نظم بہ اعتبار قافیہ او روزن اور قلت اور کثرت مصرعوں کے کئی قسم ہو جاتا ہے اور کئی قسم علیحدہ ہو جانے میں اس نظم کے معنی کو بھی دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے موقع پر اشارہ کر دیا جائے گا۔ بہر کیف ان اعتبارات سے نظم کی یہ قسمیں ہیں: فرد، غزل، قصیدہ، تشبیب، قطعہ، رباعی، مثنوی، ترجیع بند، مسمط مستزاد اور واسوخت۔ (ص ۳)

معلوم کیا چاہیے کہ نظم کوئی قسم ہے۔ فرد، رباعی، غزل، قصیدہ، نسیب، قطعہ، مثنوی، مسمط، ترجیع، مستزاد۔ ہر چند نسیب شعر کی قسم علیحدہ نہیں ہے بلکہ قصیدہ کا جزو ہے کہ باعتبار ایک حیثیت کے باقی اشعار سے ممتاز ہے۔ اور اسی طرح مستزاد کہ بعضے اصناف شعر مثل فرد اور رباعی اور غزل ایک صورت خاص میں اس اسم کے

ساتھ مسمی ہو جاتے ہیں۔ اور حال اس کا اپنے اپنے محل میں مشروحاً دریافت ہو جاوے گا۔ آسانی فہم اور مبتدیوں کی تفہیم کے واسطے اقسام میں داخل کر کے ہر ایک کا بیان علیحدہ کیا جاتا ہے:

فرد

دو مصرعے کے شعر کو کہتے ہیں مطلقاً۔ خواہ دونوں مصرعہ میں قافیہ ہو خواہ ایک میں۔ اور اس کو بیت بھی کہتے ہیں، لیکن ان دونوں ناموں میں اس قدر فرق ہے کہ شعر کے تنہا ہونے کی صورت میں فرد نام رکھا جاتا ہے اور بیت خواہ تنہا ہو، خواہ منجملہ اور اشعار کے، جیسے کہ ایک شعر غزل یا قصیدہ یا قطعہ کا... پس فرد خاص ہے اور بیت عام۔ فرد بہ سبب تنہا ہونے کے کہتے ہیں۔ اور بیت میں کئی قول ہیں، سب کا لکھنا موجب تطویل کلام کا ہے۔ ان میں سے ایک وجہ قوی یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیت گھر کو کہتے ہیں اور عرب کے صحرانشینوں کا اکثر کنبل کا ہوتا ہے، جس کو پال کہتے ہیں، اور وہ میخ اور رسی اور ستون سے مرکب ہوتا ہے۔ اور بیت بھی وتد اور سبب اور فاصلہ سے مرکب ہوتا ہے۔ اور وتد میخ اور سبب رسی اور فاصلہ ستون کو کہتے ہیں۔ اور ان اجزاء کا حال علم عروض میں منفصل لکھا ہوا ہے۔ پس بیت یا فرد ہونے میں فقط مصرعوں کی قلت کو دخل ہوا، نہ وزن اور قافیے کو۔

فردا

ایک شعر کو کہتے ہیں کہ کوئی اور شعر اس کے ہم راہ نہ ہو، خواہ دونوں مصرعے مقفی ہوں، خواہ مصرع آخر۔ مثال اس کی ظاہر ہے۔

رباعی

رباعی دو بیت ہیں کہ مصرع اول اور دوم اور چہارم ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اور کبھی چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس کو چار مصراعی ''اور'' دو بیتی بھی کہتے ہیں اور رباعی کے واسطے چوبیس وزن مقرر ہیں۔ اگر وہ چار مصرعے ان اوزان میں سے کسی

وزن پر ہوں گے، پس اس کو رباعی کہیں گے ولاً چار مصرع کو رباعی کہنا درست نہیں ہے۔ جیسے کہ عادت عوام کی ہے کہ چار مصرعہ کہ ان میں سے پہلا اور دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہو ان کو رباعی کہہ دیتے ہیں۔ اور تفصیل اوزان رباعی کی حدائق البلاغت کے اردو ترجمہ میں موجود ہے، اس میں مطالعہ کریں۔ بہر کیف رباعیات اس منتخب میں ان اوزان میں سے اکثر وزن پر مرقوم ہیں۔ بروقت مطالعہ کے معلوم ہو جائیں گی۔ (ص ۷)

رباعی

رباعی دو بیت کا نام ہے۔ خواہ مصرع اول اور ثانی اور رابع ہم قافیہ ہوں، خواہ چاروں مصرعے۔ اور رباعی کے واسطے چوبیس وزن خاص معین ہیں کہ ان کا بیان عروض میں ہو چکا ہے۔ اس نظم کی دو بیت پر بنا ہونے کی وجہ یوں لکھتے ہیں کہ جس وقت شاعر نے یہ وزن اختراع کیا اس وقت نہایت فرحت اور انبساط میں تھا اور زھرہ اور عطارد میں نظر تسدیس یا تثلیث اور آفتاب و مشتری میں نظر تثلیث تھی اور خاص و عام اس وزن سے نہایت محظوظ تھے۔ اس نے اس نظم میں دو بیت پر اختصار کیا کہ طول سخن سامع میں ملال پیدا نہ کرے۔

غزل

غزل لغت میں عورتوں کی باتیں اور عورتوں کے عشق کی باتیں کرنے کو اور اس سخن کو بھی کہتے ہیں جو عورتوں کی تعریف میں کہا جاوے، اور اصطلاح میں کئی بیتوں کا نام ہے کہ سب کا وزن ایک ہو اور پہلے بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور باقی ابیات کے دوسرے مصرعے۔ پہلے بیت کو مطلع کہتے ہیں اور دوسرے بیت کو جو مطلع کے بعد ہے حسن مطلع اور بیت آخر کو مقطع۔ اور شعرائے متاخر قاطبۃً اپنا نام جس کو تخلص کہتے ہیں مقطع میں داخل کرتے ہیں اور شعرائے مقدم اس امر کے مقید نہ تھے۔ معلوم کیا چاہیے کہ عرب میں مرد کا عشق عورتوں پر ہوتا ہے اور فارس میں مرد کا

عشق غالباً اطفال پر اور کبھی عورت پر بھی۔ اور فارسیوں کے اتباع سے اردو گو بھی یہی رویہ برتتے ہیں، اگر چہ ہند میں عورت کا عشق مرد پر شائع ہے اور یہ امر کبت اور دوہڑوں سے ظاہر ہے اور از بس کہ عربی غزلوں میں حدیث عورتوں کی ہوتی ہے، اسی واسطے اس کا نام غزل رکھا اور فارسی اور اردو گویوں نے بھی ان ابیات مخصوصہ پر وہی نام مسلم رکھا۔ لیکن غالباً غزل مضامین عشقیہ سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن بعد مرور ازمنہ کے غزل میں پند اور نصائح اور معرفت کے مضامین یا تعریف شراب کی بھی باندھنے لگے۔ اور غزل کے ہر بیت کا مضمون علیحدہ ہوتا ہے، یعنی اگر ایک بیت میں ہجر کا بیان ہے تو دوسرے میں وصل کا ہوتا ہے یا اگر ایک میں اپنا فخر ہے دوسرے میں اپنا عجز بیان ہوتا ہے اور یہ بھی نہیں پایا جاتا کہ مثلاً اگر اول سے ہجر کا بیان شروع کیا ہے، مقطع تک اسی کا ذکر چلا جاوے۔ اور شعراء فارس متاخر نے غزل میں ایک طرز نئی ایجاد کی ہے اور وہ یہ ہے کہ معشوق کو کسی اور کا عاشق قرار دے کر اس کے سوز و گداز کے مضامین غزل میں باندھتے ہیں اور اردو غزل گویوں نے بھی ان کے اتباع سے اس طرح کی غزل طرح کی ہیں۔ چناں چہ سودا کی غزل جس کا مطلع یہ ہے:

جو طبیب اپنا تھا دل اس کا کسی پر زار ہے
مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

اور باقی ابیات دیوان کے مطالعہ کرنے والوں پر ظاہر ہیں۔ بہر کیف غزل کی بیتوں کی حد میں اختلاف ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ گیارہ بارہ بیت سے زیادہ نہ چاہیے، کس واسطے کہ کثرت اشعار کی قصیدہ کے واسطے مناسب اور زیبا ہے۔

(ص ۴،۵)

غزل ایسے چند بیت متحد الوزن کو کہتے ہیں کہ بیت اول کے دونوں مصرع کا قافیہ باقی ابیات کے مصرع اخیر کے قوافی کے ساتھ متحد ہو۔ بیت اول کو مطلع کہتے ہیں۔اور یہی تعریف ہے قصیدے کی۔لیکن فاصل اور فارق ان دونوں میں یہ ہے کہ غزل بارہ تیرہ بیت سے متجاوز نہیں ہوتی اور قصیدے کے واسطے نہایت نہیں۔مگر غالباً ڈیڑھ سو بیت سے زیادہ نہیں کہتے اور اس زمانے میں غزل بیس پچیس بیت تک بھی کہتے ہیں اور غزل وقصیدہ میں اس طرح سے فرق کرتے ہیں کہ اگر مضمون ہر بیت کا مختلف یا عاشقانہ ہو تو اس کو غزل جانتے ہیں اور اگر مدحت یا نصائح اور مثل ان کے ہو تو قصیدہ۔اور متاخرین غزل میں تخلص یعنی نام شاعر کا مقطع میں اور قصیدے میں جس بیت میں چاہتے ہیں ذکر کرتے ہیں۔اور قدماء غزل میں بھی نام کو مقطع کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے تھے۔اور بہتر یہ ہے کہ مضمون غزل عاشقانہ ہوتا کہ غزل کی مناسبت باقی رہے، کس واسطے کہ غزل لغت میں عورتوں سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں اور قصیدہ مغز غلیظ کو کہتے ہیں۔جو کہ عادت قدماء کی یہ تھی کہ قصیدے میں الفاظ متین، جو ممدوح کے تحشم اور علو شان پر دلالت کریں، استعمال کرتے تھے، اس نام کے ساتھ موسوم کیا۔

مثنوی

ایسی بیتیں ہیں کہ وزن سب کا ایک اور قافیہ دو دو مصرعہ کا متفق اور ہر بیت قافیہ جداگانہ رکھتی ہے۔حد مثنوی کی معین نہیں، جیسے اردو میں مثنوی میر حسن کی جس میں بدر منیر اور بے نظیر کا قصہ مسطور اور تمام عالم میں مثل بدر منیر کے مشہور ہے۔

(ص ۷)

مثنوی

وہ ابیات ہیں کہ وزن سب کا متحد اور قافیہ علیحدہ ہو، لیکن ہر بیت کے دونوں مصرعے قافیہ رکھتے ہوں۔چند بیت مثنوی میر سے بہ طریق نمونے کے مرقوم ہیں۔

مسمط

لغت میں موتی کی لڑی کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں اس طرح کی نظم کو کہتے ہیں کہ اول چند مصرعہ قافیہ میں متفق ہوں اور بعد اس کے اسی قدر مصرع اور اس طرح کے ہوں کہ قافیہ مصرع ءاخیر کے موافق ان چند مصرع کے ہو اور باقی مصرع کا ان سے مخالف، اسی طرح پر جس قدر چاہیں کہیں۔ اس کے خانوں کی حد معین نہیں۔ پس اگر ہر خانہ تین تین مصرعہ کا ہو تو اس کو مثلث کہتے ہیں اور اگر چار مصرع کا اس کو مربع اور اگر پانچ مصرعہ کا اس کو مخمس اور اگر چھ مصرعہ کا اس کو مسدس اور اگر سات مصرع کا اس کو مسبع اور اگر آٹھ مصرعوں کا اس کو مثمن اور اگر نو کا اس کو مستع اور اگر دس کا اس کو معشر کہتے ہیں اور حد مصرعوں کی دس تک ہے۔ اردو گو مخمس اور مسدس بیشتر کہتے ہیں اور باقی اصناف کم، اور بعضوں نے مثلث بھی کہے ہیں۔

(ص ۱۰۔۱۱)

مسمط

وہ چند مصرعے ہیں کہ وزن و قافیہ میں متفق ہیں، ہم راہ ایسے ایک مصرعے کے کہ وزن میں ان مصارع سے موافق اور قافیے میں مخالف ہوتا ہے۔ اور گاہ گاہ یہ مصرع بھی ان مصارع کے ساتھ قافیے میں اتحاد رکھتا ہے۔ اور یہ امر اس مسمط کے پہلے بند سے ظاہر ہے کہ اس کے چند مصرعے مطلع غزل کے ساتھ الحاق کیے جاویں۔ مصنف مناظر الانشاء لکھتا ہے کہ مولانا وحید تبریزی کے رسالے میں کہ عروض اور قافیہ اور بدیع پر مشتمل ہے، مرقوم ہے کہ مسمط چار مصرع سے دس مصرع تک ہوتا ہے۔ پس یہ تعریف مربع اور مخمس اور مسدس اور مسبع اور مثمن اور مستع اور معشر کو شامل ہے (یہاں تک کلام اس کا منتہی ہوا)۔ لیکن مثلث بھی پایا جاتا ہے اور جاننا چاہیے کہ جب ابیات مسمط کے مکرر ہو جاویں تو چاہیے کہ اخیر مصرعے قافیے میں متحد ہوں۔ مثلث اور مربع اور مخمس کی مثال مرقوم ہوتی ہے کہ کثیر الوجود ہے اور

باقی اشعار کم پائے جاتے ہیں۔

(ص ۱۷۶ تا ۱۷۸)

ترجیع

لغت میں ترجیع بہ معنی الٹنے اور پھرنے کے ہیں اور اصطلاح میں وہ چند شعر ہیں کہ خانہ خانہ ہوویں اور ہر خانہ ایک غزل کے برابر ہو۔ قافیہ اس خانہ کا بعینہ مانند قافیہ غزل کے، یعنی مطلع کے دونوں مصرع اور باقی ابیات کے بھی مصرع ہم قافیہ ہوں اور قافیہ ایک خانہ کا دوسرے خانہ کے قافیہ سے مخالف ہوں، اور تمام ہونے کے بعد ایک اجنبی بیت لاویں اور چاہیے کہ وہ بیت اجنبی بہ اعتبار معنی کے پہلے بیتوں سے ربط رکھتی ہو۔ پس اگر بند کی بیت بار بار بعینہ مکرر ہو، اس کو ترجیع بند کہتے ہیں اور اگر مختلف ہو ترکیب بند۔ اور ترکیب بند دو طرح ہے، ایک یہ کہ بند کے ہر بیت کا قافیہ علیحدہ ہو، چناں چہ اگر جمع ہوویں مثنوی ہو جاوے اور دوسرے یہ کہ سب بیتیں ایک قافیہ پر ہوں، چناں چہ اگر جمع ہوں سب مل کر ایک خانہ ہو جاویں۔

(ص ۱۰)

ترجیع بند

مصنف 'مناظر الانشاء' نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ ترجیع وہ شعر ہے کہ حصہ کیا جاوے ایسی بیت کے ساتھ کہ اس کے ہر مصرعے میں قافیہ ہو اور ہر حصہ اس کا چند بیت صاحب مطلع ہوتے ہیں کہ وزن اور قافیے میں اتحاد رکھتے ہوں۔ اس حصہ کرنے والی بیت کو بند ترجیع کہتے ہیں اور وہ بند غالباً ہر جگہ ایک ہی بیت ہوتی ہے، اور گاہ گاہ غیر اول کی اور بند چاہیے کہ ابیات سابق سے با اعتبار معنی کے مرتبط ہو۔ اور شمس فخری معیار جمالی میں لکھتا ہے کہ ترجیع کئی قسم ہے، اول یہ کہ شاعر پانچ یا سات یا نو یا گیارہ بیتیں جس وزن اور قافیہ اور ردیف میں چاہے کہے اور بعد ان کے ایک اور بیت لاوے کہ اس قافیہ اور ردیف پر نہ ہو، اور پھر اسی قدر بیتیں کہ پہلے کہیں

تھیں، کہہ کر ایک اور بیت لاوے اس طرح آخیر تک تمام کو پہنچاوے۔ ان ابیات کو خانہ اور اس بیت کو بند کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعد ہر خانہ کی ابیات کے بند آئے ہوں کہ قافیہ اور ردیف میں اتحاد رکھتے ہوں، اگر ابیات بند کو جمع کریں ایک قطعہ ہو جاوے۔ تیسرے یہ کہ بند ہر جگہ ایک ہی بیت ہو۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ سب خانوں کی ردیف ایک اور قافیہ مختلف ہو یا بالعکس (یہاں تک شمس فخری کا کلام تمام ہوا) مؤلف کہتا ہے کہ صاحب 'مناظر الانشاء' کے لکھنے سے کہ بند گاہ گاہ غیر مکرر رہتا ہے اور اقسام اربعہ مذکورہ کی پہلی اور تیسری قسم کی عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ ترکیب بند بھی ترجیع کی ایک قسم ہے۔ اور ماہران فن پر واضح ہے کہ ترکیب بند انہیں اشعار کو کہتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت پر ہو۔ اور شمس فخری کے اس قول سے کہ اگر ان ابیات کو جمع کریں تو ایک قطع ہو جاوے، معلوم ہوتا ہے کہ بند کے دوسرے ہی مصرع میں قافیہ ہو، نہ یہ کہ پہلا بند بہ شکل مطلع کے اور باقی ابیات، ابیات غزل کے طور پر۔ اور شعرائے قدیم و حال کا مشاہدہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ اور دو بیت پر بھی خانہ کی بنا رکھتے ہیں۔ اس روزگار میں یہ اشعار مسدس کے نام سے مشہور ہیں۔ (ص ۱۷۹ تا ۱۸۱)

مستزاد

ایسی نظم کو کہتے ہیں کہ بعد ہر مصرع یا بیت کے ایک فقرہ نثر کا زیادہ کرلیں لیکن بہ شرطیکہ وہ فقرہ اس نظم سے بہ اعتبار معنی کے مربوط ہو اور وہ نظم بغیر اس فقرہ کے بھی تمام ہو سکتا ہو، یعنی اگر وہ فقرہ نہ ہو تب بھی معنی درست ہوں۔ اور اس فقرہ پر نثر کا اطلاق اس واسطے ہے کہ اگر چہ وہ بھی کسی ایک دو رکن کے وزن پر ہے، لیکن وزن تمام مصرع کا نہیں ہے۔

مستزاد

مستزاد ایسا کلام منظوم ہے کہ اس کے مصرع یا بیت کے بعد اس طرح سے ایک

پارہ کلام زیادہ کیا جائے کہ بہ حسب معنی اس نظم سے مرتبط ہو۔ مگر جاننا چاہیے کہ مستزاد رباعی اور غزل وغیرہ کے مقابل نہیں ہے بلکہ رباعی وغیرہ کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا ہے، یعنی رباعی و غزل مستزاد ہوتی ہیں، اور اگر مقابل ہوتے تو ان دونوں کا جمع ہونا محال تھا۔ اور یہ امر کہ وہ پارۂ کلام جو زیادہ کیا جاتا ہے، نثر ہے یا نظم؟ ایک بحث دور و دراز رکھتا ہے۔ اس کی تفصیل استاذی و مولائی جناب مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالی کے رسالۂ قافیہ سے جس کا نام 'وافی' ہے، دریافت کریں کہ اس سے بہتر کسی کتاب میں مرقوم نہیں ہے۔ ملخص کلام یہ ہے کہ وہ پارہ بھی نظم ہے نہ نثر، جیسے کہ بعضوں کا گمان ہے۔

(ص ۱۹۳)

نسیب

(جہاں شاعر قصیدے میں چند شعر کے بعد مدح کی طرف متوجہ ہوتا ہے) ان اشعار کو تشبیب کہتے ہیں۔ تفعیل کے وزن پر اور اس کا نام نسیب بھی ہے۔ سین بے نقطہ سے فعیل پر نسیب کے معنی ایام جوانی کا ذکر کرنا اور نسیب عورتوں کا ذکر کرنا۔ اس نام سے معلوم ہوا کہ اول یہی اسم تھا کہ قبل از مقصود اشعار عاشقانہ لکھتے تھے، لیکن اب خصوصیت ایسے اشعار کی نہیں رہی بلکہ مقصود سے پہلے جس قسم کے شعر ہوں ان کو نسیب کہیں گے اور جس قصیدہ میں تشبیب نہ ہو یعنی اول سے مدح یا ہجو مثلاً شروع کریں اس کو مجذو کہتے ہیں اور جس میں تخلص یعنی گریز نہ ہو مقتضب کہتے ہیں)۔

(ص ۶)

نسیب

چند بیت کا نام ہے کہ قصیدے میں مقصد سے پہلے بہ طور تمہید کے مذکور کریں اور جو کہ ان ابیات اور اشعار مدح وغیرہ میں کوئی واسطہ چاہیے، بعد ان ابیات کے ایسے

ایک دو بیت ہوتے ہیں کہ مقصد کی طرف متوجہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں، ان بیتوں کو عربی میں تخلیص اور فارسی میں گریز گاہ کہتے ہیں۔نسیب کو تشبیب بھی کہتے ہیں۔اور جو کہ نسیب لغت میں عورتوں کے باتیں کرنے کو کہتے ہیں اور تشبیب ذکر ایام شباب کو، غالباً اوائل حال میں یہ بیتیں صرف عاشقانہ ہوتی ہوں گی، پھر رفتہ رفتہ اور مضامین مثل شکایت روزگار یا فخریہ وغیرہ پر بھی مشتمل ہونے لگیں۔راقم غزل و قصیدے کی مثال پر قناعت کر کے سودا کے اس قصیدے سے جو بسنت خاں کی مدح میں لکھتا ہے۔ (ص ۱۷۲ تا ۱۷۵)

قطعہ

لغت میں کسی چیز کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ان چند بیت کا نام ہے کہ وزن اور قافیہ میں متحد ہوں، مثل غزل کے، لیکن مطلع نہ ہو۔کس واسطے کہ اگر مطلع ہوگا، پس دو حال سے خالی نہیں، یا بیتیں اس کی غزل کی حد سے متجاوز ہوں گی یا نہ ہوں گی۔پہلی صورت میں قصیدہ ہے اور دوسری صورت میں غزل۔اور اغلب قطعہ میں مضمون ابیات کا ایک دوسرے سے علاقہ رکھتا ہے...اور کبھی ساری غزل یا اس کے اکثر شعر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں۔اسی غزل کو غزل قطعہ بند کہتے ہیں۔ (ص ۷)

قطعہ

ابیات متحدۃ الوزن و القافیہ میں بدون مطلع کے۔پس اگر مطلع ہو اور ابیات حد قصیدہ سے کم ہو تو غزل ولا قصیدہ۔

'انتخاب دواوین' کے یہ اقتباسات ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ گلستان سخن میں انتخاب دواوین کے صفحات معمولی ردوبدل کے ساتھ شامل ہیں۔سوائے اس کے کہ کہیں کہیں اجمال کی تفصیل کر دی گئی ہے۔بعض دیگر مطالب اسی طرح 'حدائق البلاغت' کے اردو ترجمے سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ذیل میں چند اقتباسات

درج کیے جاتے ہیں:

حدائق البلاغت

(اردو ترجمہ)

معلوم کیا چاہیے کہ خلیل ابن احمد اس فن کا اوستاد اور جمع کرنے والا ہے۔ اس نے کلام عرب میں تجسس اور تلاش کر کے معلوم کیا کہ اشعار عرب پندرہ بحر میں موزوں ہوتے ہیں..... اور بعد اس کے ابوالحسن اخفش نے سولویں اور ایجاد کی اور اس کا نام متدارک رکھا..... بہر کیف یہ سب انیس بحر ہوئے۔ معلوم کیا چاہیے کہ ان بحروں میں سے بعض ایک رکن کے تکرار سے حاصل ہوئی ہیں اور بعض دو رکن کی ترکیب سے۔ جو بحر کہ ایک رکن کی تکرار سے حاصل ہوئی ہیں یہ ہیں..... جو دو رکن کی ترکیب سے حاصل ہوتی ہیں وہ یہ ہیں...... [یہاں بحور کی تفصیل دی ہے جو گلستان سخن کے صفحہ ۱۴۴ کے عین مطابق ہے] اصل بحر جدید کی فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن ہے دو بار۔ اس بحر کو قریب بھی کہتے ہیں اور اس بحر کو بوزرجمہر نے نکالا ہے اور اصل قریب کی مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن ہے دو بار۔ کہتے ہیں کہ مولانا یوسف نیشاپوری نے یہ بحر نکالی ہے اور وہ یہ شخص ہے کہ فارسی علم عروض پہلے اسی شخص نے تصنیف کیا ہے اور یہ شخص خلیل ابن احمد سے دو سو برس کے بعد پیدا ہوا ہے۔ الخ

(ص ۱۱۹ تا ۱۲۰)

گلستان سخن

پوشیدہ نہ رہے کہ خلیل ابن احمد جب اوزان عرب میں تجسس کافی اور تفحص شافی عمل میں لایا، اوزان شعر کے ضبط کے واسطے پندرہ بحر مرکب کیں اور جو جو بحر کہ انفکاک میں مشترک تھیں ان کو ایک ایک دائرے میں رکھا۔ جو کہ بحر متقارب کے ساتھ کوئی بحر شریک نہ تھی، اس کو ایک دائرے میں رکھ کر اس دائرے کا نام مفردہ مقرر کیا۔ ابوالحسن اخفش نے جب اس میں نظر کی فعولن کے سبب کو وتد سے مقدم رکھ

کر بحر متدارک کو حاصل کیا اور متقارب کے ساتھ دائرے میں رکھ دیا۔ اور شمس فخری نے 'معیار جمالی' میں لکھا ہے کہ اس بحر کو ماہران علم عروض نے خلیل ابن احمد کے دو سو برس کے بعد استخراج کیا۔ جدید کو بوزر جمہر اور قریب کو مولانا یوسف عروضی نیشا پوری نے پایا اور مولانا اوزان فارسی میں خلیل ابن احمد سے پایہ کم نہیں رکھتا۔ الخ

(ص ۱۴۵، جلد اول)

فصل، ردیف کے بیان میں

ردیف وہ لفظ ہے کہ بعد قافیہ کے واقع ہو۔ خواہ کلمہ ہو، خواہ زیادہ۔ اکثر اس بات پر ہیں کہ ردیف سب جائے میں متحد المعنی چاہیے اور بعضے یہ کہتے ہیں کہ اگر ردیف بہ اعتبار معنی کے مختلف ہو تو مضائقہ نہیں اور یہ امر حق ہے۔

(ص ۱۸۹)

ردیف وہ کلمہ مستقل ہے کہ بعد قافیے کے مذکور ہو۔ خواہ متحد المعنی خواہ مختلف المعنی قسم اول جیسے لفظ نہ تھا اس شعر میں:

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

اور دوسری قسم جیسے اس شعر میں:

رہنے نہ اگر غیر دیتے تمہیں باہم
اس طرح سے ہوتے نہ کبھی تم سے جدا ہم

قافیہ 'با' اور 'جدا' ہے اور ردیف 'ہم' لیکن مصرع اول میں بہ معنی یک دگر ہے اور دوسرے میں ضمیر متکلم۔ اور کبھی ردیف لفظ غیر مستقل بھی ہوتی ہے جیسے قافیہ معمول میں۔ اس کی مثال کی کچھ حاجت نہیں۔

(ص ۱۷۰)

فصل عیوب قافیہ کے بیان میں

عیب قافیہ کے کئی طرح پر ہیں۔ ایک ان میں یہ ہے کہ ایک جائے میں وری حرف اصلی ہو، دوسری جائے میں حرف زائد کو بہ تکلف روی کرلیا ہو۔ مثلاً گالی لالی کی بائے تحتانی گالی کی اصلی ہے اور اس قبیل سے یہ شعر بھی ہے.....(اس کے بعد عیوب قوافی مع ناموں کے گنائے ہیں) الخ

(ص ۱۷۹ تا ۱۸۳)

جاننا چاہیے کہ ہر چند عیوب قافیہ کے، جن سے شاعران نازک کلام کو احتراز چاہیے، بہت ہیں، لیکن از بس کہ راقم اوراق کی نظر اختصار پر ہے۔ عیوب مشہورہ پر اکتفا کرتا ہے۔ وہ عیوب یہ ہیں: اقوا، اکفا، سناد، ایطا، معمول۔ ان عیوب کا بیان یہ ہے کہ اقوا حذو اور توجیہہ کے اختلاف کو کہتے ہیں۔ حذو کا اختلاف کئی طرح ہے، ایک یہ ہے کہ ہر جگہ حرکت روف کی ہو، لیکن جدا گانہ۔۔۔۔۔ الخ

(ص ۱۶۷ تا ۱۶۸)

رباعی

رباعی کا وزن مختص بحر ہزج کے ساتھ ہے اور اس میں نو زحاف آتے ہیں اور بہ سبب ان زحافوں کے چوبیس وزن حاصل ہوتے ہیں......اوزان رباعی کے یہ ہیں....'' الخ

(ص ۱۶۷ تا ۱۷۲)

معلوم کیا چاہیے کہ رباعی کے اوزان ہزج مثمن سے ماخوذ ہیں اور وہ اوزان دس رکن سے ترکیب پاتے ہیں۔ ایک ان میں سے سالم ہے یعنی مفاعیلن اور نو مزاحف اور وہ یہ ہیں......ان ارکان.......'' الخ

(ص ۱۶۰ تا ۱۶۱)

گلستان سخن اور حدائق البلاغت کا یہ اتحاد مطالب کئی مقامات پر حاوی ہے۔ اختصار کی خاطر اقتباسات کے صرف چند حصے دیے گئے ہیں۔ ان میں کئی اور

مثالوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، مثلاً گلستان صفحہ ۱۳۹ تا ۱۴۴ اور حدائق البلاغت صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۷ اور صفحہ ۱۶ ا بعد، صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۹ اور صفحہ ۲ ۷ ا بعد، صفحہ ۱۶۲ کے شجرے اور صفحہ ۱۷۴ کے شجرے، صفحہ ۱۶۳ اور صفحہ ۱۷۴، صفحہ ۱۶۶ اور صفحہ ۱۷۹ کا باہمی مقابلہ مذکورہ نتیجے کی تائید کرتا ہے ا۔

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا بے موقع نہیں کہ گلستان سخن کا یہ ابتدائی حصہ یا تو تمام تر صہبائی کی تحریر ہے یا اس کے ابتدائی خاکے کو استاد کے قلم نے یوں شکل و صورت دی ہے کہ یہ اسی کی شخصیت کا غماز ہو گیا ہے۔

۲۔ صابر نے جیسا کہ خود اپنے تذکرے میں لکھا ہے (صفحہ ۱۷) ابتدا میں حافظ عبدالرحمان خاں احسان سے تلمذ اختیار کیا۔ مدت تک ''افادہ و استفادہ کا ہنگامہ گرم'' رہا اور ''یہ صورت بہم پہنچی کہ ان کے اوقات بیشتر اصلاح تلامذہ میں مصروف ہونے لگے'' اور ''اپنے دردسر کو حضرت استاد کی تخفیف تصدیع کا باعث

ا۔ گلستان کے صفحات اس مطبوعہ متن کے حوالے سے ہیں اور حدائق البلاغت کا نسخہ مطبع سراجی دھلی کا ہے جس کے متن میں اصل فارسی کتاب اور حاشیے پر صہبائی کا اردو ترجمہ درج ہے۔ اوپر جہاں کہیں حدائق کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے یہی اشاعت مقصود ہے۔

جانا۔'' اس سے ''التفات عام لطف خاص'' میں بدل گیا اور استاد کی پوری توجہ معانی و بیان اور عروض و قوافی کے غوامض سکھانے میں بسر ہو گئی، اور بہ قول صابر ''ایک مدت تک نگاہ لطف میری ہی اصلاح میں ایک طرح سے مصروف رہی۔'' حافظ احسان کے انتقال کے بعد (جو بہ قول صفیر بلگرامی ۱۲۶۷ھ کا واقعہ ہے) شہزادہ صابر دو برس تک ''اپنے ہی جوش میں موجزن رہے'' اور حافظ احسان کے شاگرد بھی

شہزادہ صابر سے اصلاح لینے لگے اور شہزادہ صابر کا نام ''استادی کے ساتھ مشہور ہو گیا ۱۔''

بہر حال دو برس کے بعد انہیں مولوی امام بخش صہبائی سے رجوع کرنا پڑا اور وہ صہبائی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ گویا ۱۲۶۹ھ کے قریب انھوں نے صہبائی کی شاگردی اختیار کی ہو گی۔ گلستان سخن کا آغاز ۱۲۷۰ھ میں کیا گیا اور ۱۲۷۱ھ کو یہ تذکرہ تکمیل کو پہنچا۔ گویا مولانا امام بخش صہبائی سے استفادے کی مدت تذکرے کی تحریر تک بہ مشکل پندرہ مہینے ہوتی ہے۔ اتنے مختصر سے عرصے میں استاد کا اتنا اثر کہ شاگرد کی تحریر پختگی اور روانی میں استاد کی تحریر کا عکس ہو جائے اور شاگرد کا قلم فن کے اسرار و رموز پر اتنی کم مدت میں ایسی دست رس حاصل کر لے جیسی کہ تذکرہ گلستان سخن میں ہے، معجزے سے کم نہیں ا۔

ا۔ شہزادہ صابر کا یہ بیان مبالغے سے خالی نہیں ہے اس لیے یہ خود شعرائے دھلی میں بھی اس وقت انہیں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ شیفتہ نے ۱۲۴۸ھ تا ۱۲۵۰ھ میں اپنا تذکرہ ترتیب دیا۔ ان پر یہ الزام ہے کہ شعرائے دھلی کو اہمیت دی ہے لیکن شیفتہ کا تذکرہ صابر کے ذکر سے خالی ہے۔

۳۔ صابر کے بیان کا یہ حصہ قابل یقین معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس تذکرے میں جو کلام انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کی تدوین کا کام بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔
اثنائے مشق میں ریختہ گویاں پیشیں کا کلام کچھ جزودان حافظہ میں فراہم ہوتا جاتا، اور کچھ گنجینہ بیاض میں انتظام پاتا۔۔۔ اس اثنا میں سخن سنجان عصر کا کلام بھی، جو کہ طبیعت کو پسند آتا گیا۔ اور مقصد دل کو بھاتا گیا۔ اجزائے علیحدہ میں مخزون اور بیاض جداگانہ میں مشحون ہوتا گیا۔۔۔ ایک مدت بعد جو مجموع پر نظر کی تو دفتر سرمایا فراہم ہو گیا تھا۔ اور بیکراں خزانہ مجتمع۔ گاہ گاہ اپنے خیال میں گزرتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی دوست بھی

تحریک کرتا تھا۔ کہ اس نقودسرا سے اغماض اوراس زرخالص سے تغافل خوب نہیں۔۔۔ ایک ذخیرہ بطریق کچکول کے جمع کرلیا جاوے،اور ہر مقام پرنام قائل کا بطورعنوان کے ترقیم کیا جائے،،،،لیکن ہجوم موانع اور کثرت مشاغل سے یہ آرزو حاصل نہ ہوتی تھی۔حسن اتفاق سے۔۔۔۔فرزند سعادت مند محمد عمر سلطان۔۔۔۔کو شعرک اشوق دامن گیرہوا،،،،اس کی تربیت اب پیش نہاد ہوئی۔۔۔۔۔

ا۔ہاں فارسی کلام پراحسان کی زندگی میں صہبائی سے ضرور اصلاح لیا کرتے تھے۔(گلستان سخن صفحہ ۱۲۱)

خرد کامل نے دفتر انداز وا کیا۔۔۔ایک کتاب فراہم کرکے شعرائے معنی آفریں کا تذکرہ ہو،۔۔۔۔ایک معجون غریب مرکب ہوگئی۔۔۔۔جناب افادت ماب مولوی امام بخش صہبایمد ظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔۔عرض کیا۔۔۔کہ سرانجام اس امر دشوار کاکم استعداد سے معلوم،،اگرکم ترین تلامذہ کی تحریر خلعت اصلاح سے مشرف ہو جایا کرے تو یہ مشکل آسان،اور یہ رشتہ سر درکم نمایاں ہوجاوے،بارے عرض نیاز شعار کی زیورقبول سے آراستہ ہوئی،حلیہ اجابت سے پیراستہ ہوئی،،۔

(گلستان سخن صفحہ ۱۷ تا ۲۶)

یکم شعبان ۱۲۷۰ھ کواس تذکرے کی باقاعدہ داغ بیل پڑی،جس میں صرف معاصر شرکاء سے سروکار رکھا گیا ہے،اورابتدا میں ایک دیباچہ ہے،جس میں زبان کا ارتقا فصیح اورغیرفصیح الفاظ وکلمات کی بحث،علم وعروض وقافیہ اوراقسام نظم کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔یہ تذکرہ ۱۲۷۱ھ کواختتام کو پہنچا،ماہ شوال ۱۲۷۱ھ کا آخیر تھا کہ مطبع مرتضوی میں بہ اہتمام حافظ محمد غیاث الدین شائع ہوگیا۔

۴۔ مذکورہ بالا تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرے کا اصل متن (جس میں شاعروں کا حال ہے) تحریر کے وقت کئی مرحلوں سے گزر چکا تھا، اور اس کے ابتدائی خاکہ گمان غالب ہے کہ صابر ہی کا تیار کردہ ہو: نظر ثانی میں کہیں کہیں استاد صہبائی نے ترمیم کی ہو تو عجب نہیں، ورنہ ان شعرائے اردو کے بارے میں صابر اور صہبائی کے خیالات میں بین فرق موجود ہے۔ انتخاب دواوین میں صہبائی نے بعض معاصر شاعروں کو بھی شامل کیا ہے، اور ان کے حالات لکھ کر کلام کے بارے میں اپنی رائے دی ہے۔ یہ رائے صابر کی درج کردہ آرا سے مختلف ہے، یہ اختلافات ایک دوسرے کے محاذ میں ملاحظہ ہوں:۔

انتخاب دواوین

"نصیر، شاہ نصیر الدین، تخلص نصیر عرف میاں کلو ولد شاہ غریب کہ مشاھیر شعرا دھلی سے تھا، بلکہ بہت سے شاعران زبان اردو ساکنان دھلی اسی مغفور سے تاخذ ریختہ گوئی کا کرتے تھے، اور یہی صاحب عالم حیات میں اپنے تئیں مرزا محمد رفیع سودا، اور میر تقی میر پر فائق سمجھتے تھے۔

گلستان سخن

شاہ نصیر، نصیر تخلص، شہ سوار عرصہ سخنوری، فارس مضمار، معنی پروری، نخل بند، حدیقہ کمال، بانی، بنائے افضال، سخن سنج، سخن گو، میاں کلو، مشہور بہ شاہ نصیر الدین خلف صادق شاہ غریب سجادہ نشینی پر جہاں مرحوم کی اسی کی ذات بابرکات سے آسمان سا، اور خلافت اس عارف مغفور کی اسی کہ نہاد خیر بنیاد سے خورشید سایہ تھی۔ اور یہ مرحوم و مغفور وہ ہے کہ اس کا مزار پر انوار محلّہ روشنی پورہ میں کہ ایک محلّہ محلات مشہور شہ جہان آباد، نزہت آباد سے ہے۔ زیارت گاہ صاف باطنان پاک نہاد ہے۔ بہر کیف شاہ موصوف ہر چند استعداد علمی سے بہرہ مند نہ تھا۔ بلکہ سواد بھی چنداں روشن نہ تھی۔ لیکن روشنی طبع خداداد سے خلوت دل میں ھزار شمع معنی بزم

افروز تھی، کیا مرد میدان سخن وری تھا؟۔ کہ بارھا ہنگامہ مشاعرہ میں حریف ہنوز انشاد اشعار سے فارغ نہیں ہوا کہ اس نے اس کوتاہ مدت میں شمع مقابل رکھ کر اشعار سوزاں تر از شعلہ شمع بقدر دو تین غزل کے لکھ کر مشتاقان سخن کے گوش گزار کر دیئے۔ بیشتر تشبیہ نو اور استعارہ جدید بہم پہنچانے میں مصروف رہتا ہے، اور شعر طرز صائب پر کہتا ہے۔ بلندی تلاش سے مشاعرے میں کسی کی غزل کو اس کی غزل پر تفوق نہ ہوتا تھا۔ سنگلاخ زمینوں کو دعویٰ داران کمال میں سے اس کے سوا کوئی بے سپر نہیں کرسکتا تھا۔ ایک بار سفر لکھنؤ اختیار کیا، جس دن یہ شہ سوار عرصہ سخن اس زمین میں وارد ہوکر کاروان سرا میں فروکش ہوا، دفعتاً درد گردہ میں مبتلا ہوا، قضارا خبر ورود فاش اور ہوس مطارحہ ہر ایک کے دل میں گرم تلاش ہوئی۔ ان دنوں میں مصحفی اور انشاء اللہ خان اور مرزا قتیل اور جرأت چار بالش حیات پر متمکن تھے۔ سب کے مشورے سے آٹھ مصرے مشکل زمینوں میں طرح ہوئے، اور اس مبتلائے کو وقت سفر کے پاس پہنچے، اتفاقاً مشاعرے میں تین دن باقی رہے تھے۔ معاذ اللہ سخت مشکل واقع ہوئی۔ زمین وہ سنگلاخ، طے راہ اس درد والم میں دشوار لیکن غیرت کے تقاضے نے معمور اور اس عرصہ قلیل میں اس فرمائش کے سرانجام میں مجبور کیا۔ ان میں سے ایک ردیف کا قافیہ، چمن سرخ ترا، اور دھن سرخ ترا، اور دوسرے کا افلاطوں ہیں گویا، اور جالینوس ہیں گویا۔ صیغہ جمع تھا، اس مہم ضروری سے فارغ ہوکر صرف اپنی طبع کے تقاضے سے ایک اور غزل کا فکر کیا۔ اس کا ردیف اور قافیہ چمن کی مکھی تھا، اور کفن کی مکھی تھا، حسن اتفاق یہ ہے کہ اس کی شہرت کی کشش نے ساکنین شہر لکھنؤ کو اس کے حلقہ شاگردی میں کھینچ لیا تھا، روز معہود ایک جم غفیر تلامذہ اعتقاد کیش کا ساتھ لے کر بساط مشاعرہ پر قدم رکھا۔ کملائے فن نے جب اس زور طبع اور تیزی فکر پر اطلاع پائی، صلہ تحسین وآفرین سے شاد کیا، اور حق انصاف ادا کیا، یہ تحسین وآفرین کہ اس شیریں کلام کی خوبی سخن نے ان بزرگ واروں سے بزور لی، اور پھر اس

غوغائے محشر نما کے ساتھ اصل انقساف کو ناگوار ہوئی، ایک کج طبع ستیزہ خو نے کہ شاگردان مصحفی کے زمرے سے تھا، باآواز بلند کہا کہ شاہ صاحب فی الواقعہ ان آٹھوں غزلوں کی داد حیز قدرت سے خارج ہیں، لیکن نویں غزل میں مکھی، کی ردیف سے نفیس مزاجوں کا جی متلاتا ہے۔'' اس یکہ تاز عرصہ ظرافت نے بدیہہ کہا کہ'' لطیف طبعان نفیس مزاج تو اس موائد لذیذہ کے نعما سے لذت ستان اور کام یاب ہیں، لیکن غالب ہے کہ علیل نہادان صفرائے حسد کو جوش غیرت سے ڈاک لگ جائے۔ اس کی شہرت میں مدعیان سخن کو ایسا خمول تھا، جیسے فروغ آفتاب میں چراغ کو، اس مقام میں حق کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے، کوئی اس کلام سے یہ نہ سمجھے کہ اس زمانے میں کسی کا پایہ شاعری اس کو نہ پہنچتا تھا، حاشاوکلا، اس بزرگ کا کلام عام فہم سے استعدادان تنگ مایہ کے ذہن میں بہت جم جاتا تھا، اور سہولت فہم سے ہر کس وناکس کی زبان حرف تحسین سے ہنگامہ قیامت برپا کرتی، اور معاصرین کا کلام از بس کہ خواص کی تحسین کے لائق تھا۔ خواص ہر زمانے میں قلیل ہوتے ہیں، نافہموں کے نزدیک اس کے سخن پر فائق معلوم نہ ہوتا تھا۔ العاقل تکفیہ الاشارۃ، اکثر شاہ زادگان والا شان اور امرائے بلند مکان اس کی فیض شاگردی سے بہرہ یاب تھے۔ بلکہ شاہ جہان آباد میں بیشتر شعرائے عالی طبع اور موزوں طبعان تیز فہم مثل شیخ ابراہیم ذوق اور محمد مومن خان مومن تخلص اور میر حسین تسکین اوائل حال میں اسی کی شاگردی سے مشرف تھے، الحاصل اطراف ہندوستان جنت نشان کی سیر وسیاحت سے کام یاب اورج سرزمین میں وارد ہوا، وہیں کے شعرائے شیریں کلام سے معرکہ آرا ہوا، چند بار حیدرآباد جا کر راجہ چندو لال مختار سرکار وزیر الممالک آصف جاہ ،نظام الملک، والی دکن کی قدر شناسی سے صلہ نمایاں پایا۔ آخر کار اسی سرزمین میں مضمون مرگ باندھا، اور سوس بہشت کی زبان بحرف تحسین جا سنا، سلسلہ اس کی شاعری کا ملک الشعراء مرزا رفیع سودا تک جا پہنچتا ہے۔ اس طرح سے کہ یہ شاگرد

ہے مائل کا، اور وہ قائم سے مستفیض اور قائم سودا کا شاگرد بلاواسطہ تھا۔ (صفحہ ۴۳۷ تا صفحہ ۴۴۰)

ممنون

ممنون تخلص، نظام الدین نام، بیٹا سید قمر الدین منت تخلص کا ہے، اس کی اصل قصبہ سونی پت اور مولد منشاء شاہ جہان آباد ہے۔ کسب فنون اپنے والد بزرگ وار سے کیا مدت تلک لکھنؤ میں رہا، ایک زمانہ جرگہ شعراء پایہ تخت حضور والا کے تھا، چنانچہ پیش گاہ خلافت سے فخر الشعراء خطاب عطا ہوا، من بعد ضلع اجمیر میں پیش گاہ کمیٹی بہادر سے عہدہ صدر الصدوری پر ممتاز رہا۔ مگر آج کل یہ باعث ضعف اعضا اور بینائی کے خانہ نشین یعنی شاہجہان آباد میں وارد ہے۔ اوس کے کلام کی طرز نہایت دل چسپ اور شیریں ہے۔ غرض کہ گلشن فصاحت کا بلبل ہزار داستان اور چمن بلاغت کا طوطی شکرفشاں، اسی واسطے یہ چند اشعار بطور نمونہ کے اوس کے دیوان سے منتخب ہوئے''۔

(ص ۱۹۱ تا ۱۹۲)

ممنون

ممنون تخلص، یگانہ روزگار زبدہ ، کملائے ہر دیار، والی اقلیم سخن وری مالک ملک معنی پروری، ہم آغوش معنی ، بکر، ہم دوش، شاہدان فکر چاشنی گیر مضامین دل نشین ، میر نظام الدین، منت غفر اللہ لھما،۔

اوصاف اس کامل صفات کے حوصلہ تحریر سے بیرون ہیں، ریختے میں ایک طرز تازہ اختراع کی، اور حق یہ ہے کہ بموجب اس فحوا کے کل جدید لذیذ، اس کی لذت کے روبرو نعمائے موائد قدما سے جی سیر ہو گیا۔ پیش گاہ عنایت سلطانی سے فخر الشعراء خطاب اور دبستان لطف ازلی میں حضرت رحمان سے تلمذ کا انتساب۔ طبیعت تالی شاہوار سخن کینیساں، دل گوہر آبدار معانی کا عماں، بلندی فکر

سے کنگرہ عرش پست، اور نشہ معانی سے اہل سخن کی طبیعتیں مست، شوخی غزل کے سامنے جوانوں کی طبع خجل متانت قصیدہ کے روبرو پیروں کی وضع منفعل، نمک کلام ایسا کہ ہر چند اجتماع مدادکثرت صناع کی امداد سے سعی کرے۔ زبان قلم کا زخم التیام نہ پاوے۔ اور شیرینی ادا ایسی کہ اگرچہ حیلہ حسد، طاقت لسان کی کمک سے اہتمام کرے۔ جز چارہ خاموشی ذائقہ ہاتھ نہ آوے۔ نقطہ اس کی غزل میں سوز و گداز کے اثر سے رنگ گل، اور طراوت شبنم پیدا کرے، اور دھان دوائر مضمون شور و فغان سے ھنگامہ قیامت برپا۔ تراکیب فارسی کو زبان ریختہ سے ایسا ارتباط بخشا، کہ کمال آشنائی سے بے گانگی کا اثر نہیں پایا جاتا، اور معانی درست کو الفاظ قریب الفہم سے اس طرح جلوہ دیا کہ ماہ سی روز کی مانند کوتہ نظر بھی اس کے نظارے میں دھوکا نہیں کھاتا۔ کور سوادان کم فہم، کہ اس کے سخن کم بلند کے معنی، غریب اور مضمون دل فریب اور نکات باریک کو سمجھ نہیں سکتے، خود اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اور ارباب فہم کہ سواد روشن اور طبع سلیم رکھتے ہیں۔ غرابت تشبیہ، واستعارات اور دور آھنگی، تلمیح واشارات اور متانت تراکیب اور رشاقت اسالیب اور برجستگی نکات اور بلندی ابیات میں تو کچھ سخن نہیں کر سکتے، لیکن اس غرض سے کہ ناخن دقت کی کاوش اور طبیعت رسا کا دخل ظاہر ہو، کہیں کہیں سرقے کے ساتھ متہم کرتے ہیں۔ یہ بزرگوار خیال نہیں کرتے کہ ایسا سخن سنج پر مایہ کہ اگر اس کے صندوق سینہ کو وا کریں، گنجینہ تحت العرش کے مقابل دوسرا خزینہ شمار میں آئے، معانی پیش پا افتادہ چند کو کس امید پر زمین بے گانہ سے التقاط کرتا۔ اور ان سے کس افزونی کی توقع پر اپنا خزانہ بھرتا۔ سخن چینیوں کی عنان طبیعت اگر تعصب کے ساتھ نہ ہوتی، اس کلام میں احتمال توارد کو راہ دے کر معزور رکھتے، اور باقی سخن کے لطف سے طبع انصاف کو مسرور اور اگر سرقے کو بھی تسلیم کر لیا جاوے۔ اور اس پاک دامن کو ناکردہ گناہ سے ماخوذ کریں تو بھی اگر حد اعتدال سے تجاوز اور دائرہ انصاف سے خروج وقوع میں نہ آئے تو ان دو چار شعرا کے سوا باقی

کلام کو دیکھیں، اور انصاف سے نظر کریں کہ اتنا سرمایہ کس صاحب قدرت کو حاصل ہوا؟۔

غزلوں کا ہجوم غزالان دشت ختن سے پیشتر قصیدوں کا انبوہ کوکبہ ء سلاطین سے اکثر مصرعہ ہائے رباعی سے عناصر اربعہ کی مانند ابعاد ثلاثہ مشحون اور ابیات قطعہ ء تضعیف بیوت شطرنج کی طرح شمار سے افزوں مدت مدید تک نواح اجمیر میں عہدہ صدو الصدوری پر ماموررہا۔ آخر ضعف پیری کے سبب سے اس مشغلے سے دست کش اور شہر شاہجہاں آباد میں خانہ نشین ہوا۔ دس گیارہ برس کا عرصہ ہوا کہ سفر آخرت اختیار کیا۔

(ص، ۳۷۸ تا ۳۸۰)

مومن

حکیم محمد مومن خان، تخلص مومن۔ فن شاعری میں مشاہیر دھلی میں اور نجوم و رمل میں بہت دست قدرت رکھتے تھے۔ غرض کہ ہر فن میں یعنی زبان فارسی اور عربی اور عروض وقوافی وغیرہ میں کامل ہیں، اور صاحب دیوان ہیں ۔

(ص۔ ۴۷۸)

مومن

مومن تخلص، سخن سنج بے عدیل محمد مومن خان مرحوم غفر اللہ لہ۔ زمین سخن، اس کی بلندی فکر سے رشک افلاک اور اوج فلک اس کے علو طبع کے مقابل پستی خاک ۔

عروس معنی اس کے حجلہ طبع میں شوخ و بر جستہ، راز غیب اس کے سینہ قلم میں سر بستہ، خامہ اس کے سوز معنی سے نخل طور، اور ورق اس کے فروغ مضامین سے مطلع نور، مصرع آہ اس کی غزل عاشقانہ میں تضمین اور اسرار الیقین اس کی ابیات عارفہ میں گوشہ گزین۔ سخن سنجان عصر ھرچند بالا دوی فکر سے عرش تاز تھے، لیکن چونکہ یہ والا نگہ اپنی ہمت عالی کے اوج سے سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا، ھر سر بلند اس کو پست

اورھر بزرگ اس کوخرد نظر آتا تھا۔وہ بے تصنع اس کا نام اسی پندار کے موافق زبان پر لاتا تھا۔اورھر چند مساحان اقلیم کمال منازل دورو دراز طے کر کے نشیب وفراز راہ سے واقف اور راہ پیراھء سخن سے آگاہ تھے۔لیکن بس کہ یہ چابک خرام کمال پیش بینی سے مراحل بے شمار باقی پاتا تھا،ان کو کاھل قدم اورشکستہ پا جان کر بے اختیار ریش خند کرتا،اوران تیز قدموں کونقش پائے نارساتر بتاتا تھا۔جو کہ کوتاہ بینان روز گاراس والا پاگی اورعلو ہمت سے آگاہ نہ تھے۔اس کی نگہ کوعیب میں اوراس کی زبان کوخرد گیرتصور کر کے زبان سرزنش دراز اورطومارشکوہ دراز کرتے۔ایک دیوان ضخیم کہ اصناف سخن پر مشتمل اوراس کے سامنے فصاحت سحبانی خجل ہے،اورمثنویات متعددہ مثل قصہ غم اورشکایت ستم بقول غمیں اورتف آتشیں،اس قادرالکلام سے صفحہء روزگار پر یادگار ہیں۔ھر چند زبان اردو میں تو علم یکتائی بلند ہی تھا،لیکن کمال مہارت فارسی سے کوس لمن الملک،کی صدا نے ھند سے فارس تک پہنچ کوطوطی ھندو بلبل شیرازکودم بخود کردیا تھا۔غزل ھائے فارسی،کاغذ ھائے پراگندہ پرمثبت اور بالفعل محبت طبیعی اورقرابت قریبیہ کے تقاضے سے اس کی تبییض میر عبدالرحمان آہی تخلص،خلف میر حسن تسکین کے عہدہ اہتمام میں ہے۔اور جو کہ وحید عصر نسیج اوحد جالینوس زماں،بقراط آواں،حکیم احسن اللہ خان سلمہ الرحمان کوشفائے مرضی کے اہتمام سے قتقدم بڑھا کر احیائے اموات اورمعجزہ مسیحائی کی ترویج پیش نہاد ہے،قریب ہے کہ وہ دیوان منصہ طبع میں جلوہ گر ہو کر شہرت تمام پیدا کرے۔اتفاقات قضاوقدر سے ایک روز ایک مکان ک بام بلند پرعروج معنی کے تصور میں تھا کہ ناگاہ لغزش پاءنے اوج سخن سے پستی زمین کی طرف مائل کیا۔اور مضمون پیش پا کی جانب متوجہ کیا۔ھر چند اس بام کی بلندی چنداں پایہ نہ رکھتی تھی۔لیکن کچھ آسماں کی کجروی اور کچھ زمین کی ناہمواری سے دست وبازو میں ضرب شدید پہنچی۔اس شدت الم میں اس حادثہ جاں کاہ کی تاریخ یہ پائی،گویا

پاؤں کا پھسلنا بام معنی کے نردبان تھا:۔

مومن فتاد از بام گفتم چہ رفت گفتا

خود با خروش گفتم بشکست دست و بازو۔ چند ماہ شدائد نے رنج دیا کہ ان کا تحمل حد بشر سے خارج تھا۔ آخر الامر اسی سال میں کہ بارہ سو اٹھسٹ (اڑسٹھ) ھجری تھی، سفر آخرت اختیار کر کے وابستگان جگر فگار کے دل کو رنج اور داغ میں مبتلا اور حوران فردوس کو سعادت استقبال سے مستعد کیا۔ اس امر ناگزیر کے کئی مہینے بعد نواب مصطفی خان بہادر شیفتہ تخلص، کہ انسان صورت و ملک سیرت ہیں، رویائے صادقہ میں دیکھتے ہیں کہ گویا مومن خان کا خط آیا ہے۔ اور اس کے خاتمے پر خط سبز سے مرقوم ہے، ''مومن اھل الجنۃ''۔ وسعت رحمت سے کیا بعید ہے کہ جوش دریائے مغفرت نے اس مستحق کرامت کے دامن کو لوث عصیاں سے پاک کر دیا ہو۔ صدق اللہ عزوجل۔ قال عذابی اصیب آمنا شاء ورحمتی وسعت کل شیء:

ابر رحمت سخت بے پرواہ خرام است اے صدف

تا کدامی قطرہ ایں جا باز گرداند عناں

(ص۔ ۹۱، ۳۸۹)

ذوق

ذوق تخلص، شیخ محمد ابراہیم نام، دھلوی، خطاب خاقانی ہند، تیس برس کے عرصے سے ملازم درگاہ حالت ولی عہدی سے شاہ حال دھلوی کے ہیں۔ اور فن شعر میں بھی ابتدائے عمر سے مصروف ہیں۔ اب اس زمانے میں خصوصاً دھلی میں کوئی ان کے مقابلے کا نہیں، اور اکثر مشاعروں میں اوس کی آتش زبانی کے آگے اور شعراء مثل خس و خاشاک کے جلتے ہیں، اور اس کے الفاظ برجستہ کے رشک سے جب کہ وہ محفل مشاعرہ میں غزل پڑھتا ہے شرمندہ ہو کر بے تابانہ کف افسوس ملتے ہیں۔ لہذا یہ چند اشعار جو ایک بیاض میں تھے بہ طریق یادگار لکھے جاتے ہیں

(ص۔۲۴۹ تا ۲۵۰)

ذوق

ذوق تخلص، طوطی شکرستان شیریں زبانی، بلبل چمن زار، رنگین بیانی، صیرفی نقود کمال، دستہ بند رنگینیِ مقال، بانی بنائے فصاحت، میزاب گلشن بلاغت، فارس مضمار سخن وری شہ سوار، عرصہ ءمعنی پروری، مسند نشین ایوان دانش وآگاہی، استاد حضرت ظل سبحانی، شیخ ابراہیم مخاطب بہ خاقانی ہند، سایہ تربیت ظل سبحانی میں، شب جوانی کو صبح پیری تک پہنچا دیا، اور رضائے مرشد آفاق میں اپنی ہوائے نفسانی کو یک قلم مٹا دیا۔ خسرو روزگار کی بدولت جس قدر درجہ اعتبار کا بلند ہوا، مرتبہ پندار کا پست، اور جتنا دبستان کمال میں ہوشیار ہوا، مے کدہ عرفان میں مست کوہ اس گراں قدر کے پلہ وقار میں کاہ، آفتاب روشن اس صاف دل کے فروغ ضمیر کے مقابل سیاہ۔ بلندی مرتبہ کو لباس خاکساری میں ایسا چھپایا تھا کہ جیسے گرد میں آسمان، رعونت تونگری کو فقر میں ایسا دبایا تھا، جیسے زمین کے نیچے گنج شایگان۔۔۔ سبحان اللہ اس تازہ گفتار کی طبیعت کیا گلشن سراسر بہار اور کیا گلزار سراپا نگار تھی۔ کہ فضلہ اس کا سبزہ وریاحین سے بہتر اور خاشاک اس کا بنفشہ وسنبل سے خوش تر۔ ہجوم قافلہ معنی سے ہر بیت میں معانی کثیر منزل گزیں، اور کثرت ورود مضامین سے ہر مصرعے میں مضامین متعدد گوشہ نشین، ہر چند کثرت انواع سخن سے خود ترتیب دیوان کی طرف التفات نہیں کی۔ لیکن اکثر احبائے صداقت کیش اور تلامذہ اخلاص اندیش ان اشعار گوہر نثار سے بڑی بڑی بیاضیں فراھم رکھتے ہیں، اور شب وروز مانند فرزند عزیز کے سینے سے منضم۔۔۔ ماہ صفر سنہ بارہ سو اکہتر ھجری میں مرض اسہال نے اشتداد اور اعراض گوناں گوں، نے امتداد بہم پہنچا کر لشکر طبیعت پر شب خون کیا۔ اور ضعف سابق اس مرض کے سر بار اور اس علت کا علاوہ

تھا۔ باوجودیکہ زبان کو یارائے حرف زنی اور لب کو طاقت جنبش باقی نہ تھی، صفائے باطن اور جلائے آئینۂ ضمیر کے اقتضا سے جو جو نگار خانۂ جہان قدس سے افاضہ ہوتا تھا، بے اختیار انفاس فیض اقتباس کے ہم راہ محفل اظہار میں جلوہ گری کرتا تھا۔ اس کے نفس مطمئنہ کو مبداء فیاض سے کیا نسبت خاص تھی۔ کہ وہ واردات غیبی جن سوانح سے مشعر تھیں، ان کا ظہور جلوہ گاہ وقوع میں بے تکلف معائنہ ہوا۔ اسی اثناء میں گنجینہ داران خزانہ تحت العرش نے یہ گوہر بے بہا اس جوہری سخن پر عرض کیا:۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا، خدا مغفرت کرے

اور طرفہ یہ ہے کہ جب وہ دن گزر گیا، اور شب چہار شنبہ آخری ماہ صفر نے (بہ آں کہ اس کی حیات سے ہنوز ایک رمق باقی تھی) نقاب سیاہ چہرہ روزگار پر ڈال دی۔ کشادہ پیشانی خراب آباد عالم صوری سے دل اٹھا کر مسجان صومعۂ نیل گوں کے ہم پا گلشن جناح کی طرف راہی ہوا۔

(ص ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴، ۴۴۶)

ناسخ

ناسخ تخلص، شیخ امام بخش نام لکھنوی، تمام عمر لکھنو میں بسر کی، ایک دفعہ وہاں کے حاکم سے کچھ رنجیدہ ہو کر الہ آباد چلا گیا، پھر وہاں سے کان پور میں آیا۔ بعد اوس کے زمانہ جو موافق ہوا، وطن میں پھر گیا۔ اب دو تین برس ہوئے کہ اس جہان فانی سے طرف عالم جاودانی کے رحلت کی۔ الغرض کہ ناسخ ناسخ تھا۔

(ص ۲۱۲)

ناسخ

ناسخ تخلص، سخن سنج بے عدیل و نظیر، شیخ امام بخش ناسخ، ساکن خاک لطافت بنیاد لکھنو۔ مشاہیر شعرائے خوش سخن اور نام آوران کامل فن سے تھا۔ اس کے فکر سے معنی کو تاب و بہا اور اس کی زبان سے الفاظ کو رونق و صفا۔ ذہن کی صفائی، یوسف رخان غیب کا آئینہ، قلم کا شگاف، ارباب کشف کا سینہ۔ رسائی فکر گوہر، وحی صندوق سینہ ء جبریل سے تاراج کر لیتی تھی، اور صید افگنی غور نخچیر وقت کو کمین گاہ گوش قارون سے آماج کر لیتی۔ وحشی مضمون ہنوز دام خرد میں صید نہیں ہوا کہ اس کے اندیشے کی کمند نیم تاب کی کشاد میں صحرائے عدم کی اس سرحد میں پہنچ کر حمائل گردن ہو جاتی تھی، اور طائر معانی اب تک عقل فعال قفس میں قید نہیں، کہ اس کی طبیعت کی رسائی ایک پرواز میں آشیانہ غیب مطلق سے شکار کرا لاتی تھی، معنی پست اس کی طبع کی اوج بخشی سے بلند اور الفاظ مکروہ اس کی تراکیب کے حلیے سے دل پسند۔ اگر غریب نواز نہ ہوتا، معنی کی طرف اس قدر التفات نہ کرتا۔ اور اگر آشنا پروری منظور نہ ہوتی، الفاظ کی اتنی رعایت نہ کرتا۔ معنی ء مبتذل اس کے تصرف سے غریب اور اوج فلک اس کی فکر کے سامنے نشیب، گرسنہ چشمان ہنر اس کے مائدہ سخن سے زلہ بردار، دعوے داران کمال اس کی شوکت الفاظ سے پائمال۔ اہل انصاف اس کو استاد مانتے ہیں۔ اور ارباب فہم اس کے شعر کو سحر جانتے ہیں۔ متانت مزاج سے مضامین شوخ، باوجود آمد کے آورد کے محتاج، اور تمکین طبیعت سے معانی ء برجستہ کو خلوت خیال سے دروازہ لب تک آنے میں تکلیف کی احتیاج، ہر چند طریقہ مختار اس کا تمثیل ہے۔ اور فی الواقع اس طرز میں بے مثل و عدیل ھے۔ شعر عاشقانہ بھی اگر بے اختیار زبان قلم سے نکل گیا۔ شعلہ شمع کی طرح سے پروانہ طینتوں کی طبع میں آتش فگن، اور برگ گل کی مانند عندلیب مزاجوں کو ناخن بہ دل زن ہے۔ اخیر عمر میں غلبہ خرافت سے جرات کی وضع کو اختیار اور معاملہ بندی کو قصد کیا۔ اور ایک، دفتر، پریشاں، نام اسی طرز کے اشعار سے مشحون اور اسی ڈھنگ کے ابیات

سے مالامال لکھا ہے۔ ہر چند جرأت کی شاعری کا حال جیسا ہے، اہل بصیرت اور ارباب بصارت کہ کامل استعداد اور سلیقہ سخن کے نقاد ہیں، خوب جانتے ہیں لیکن جو کہ ہمیشہ مضامین بوس و کنار کے اس کے منہ چڑھے ہوئے، اور مدام اس کی فکر سے ہم کنار تھے۔ اور یہ اس ہوس کے دام میں نوگرفتار۔ یہ تقلید خوب بن نہ آئی۔ اور بعض مقام میں یہ تو ناز و ادا میں محو ہوا، اور شاہد معنی نے اس کو غافل کر کے بے باکانہ حجلہ گاہ ابیات سے اپنے گھر کی راہ لی۔

حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاءٗ

لیکن دردمندان سخن جانتے ہیں کہ اتنی نا سرہ کاری سے اس کے نقد کمال کو بٹا نہیں لگتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بود و باش خطہ خوش آب و ہوائے لکھنو سے دل گرفتہ ہو کر الہ آباد کی سرزمین میں نشیمن اختیار کیا۔ لیکن بعد ایک عرصے کہ کان پور میں آیا۔ اور وہاں وقفہ آسائش کر کے پھر وطن مالوف میں منزل گزین ہوا، اور جب تک آغوش لحد میں آرام نہ کیا، اس گل زمین سے قدم باہر نہ نکالا۔ اس کے سفر آخرت کو تخمیناً آٹھ، سات برس کا عرصہ ہوتا ہے۔

(ص، ۴۱۳، ۴۱۵)

گلستان سخن کے یہ اقتباسات شعرا کے بارے میں زیادہ تفصیلی اور گہری معلومات کے علاوہ انتخاب دواوین کی بیان کردہ آرا سے مختلف بھی ہیں، خصوصاً ممنون اور ناسخ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار ہوا ہے، وہ صہبائی کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہیں، اور اس بدلے ہوئے ذوق کی نمائندگی کرتے ہیں، جو صابر اور اسی عمر کے بعض دوسرے نقادان فن کے ہاں جلوہ گر ہے۔ گلستان سخن میں شعراء کے حالات و کوائف بھی صہبائی سے جداگانہ ذوق کے آئینہ دار تھے، اب ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ گلستان سخن کا اصل متن صہبائی کی اصلاح سے مزین تو

ہو گا،لیکن صابر کا اپنا تالیف کردہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ہاں دونوں کے اسلوب میں مشابہت ضرور ہے۔اوراسلوب کی مشابہت کا سبب اصلاح ہوسکتا ہے،،لیکن نفس نضمون استاداورشاگردکاجدا ہے۔

صفحہ نمبر ۱۰۲ کتاب تک۔۔۔۔۔۔

(۳)

گلستان سخن کی مختلف حیثیوں کے بارے میں قاضی عبدالودود صاحب نے معاصر میں جوکچھ لکھا ہے اس میں سے بعض ضروری اجزاء ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

(۲) گلستان سخن میں شعرا کے مستقل تراجم ہیں۔مسلمان ۴۸۲، ہندو ۵۶، عیسائی ۲ اوران میں عورتیں صرف دو ہیں اور دونوں مسلمان (پہلی یقینی طور پر، دوسری قیاساً) مسلمانوں میں ایسے شعراجن کے فارسی اوراردو دونوں زبانوں کے اشعارتذکرے میں ہیں ۱۶ ہیں......

ایسے شعراجن کاصرف فارسی کلام ہے،۲۳ ہیں۔باقی وہ ہیں جن کاصرف اردو کلام دیا گیا ہے۔ ہندوؤں میں صرف ایک شاعر کا اردو فارسی کلام تذکرے میں درج ہے، ۱۷ کے صرف فارسی اشعار ہیں۔اورایسے شعراجن کاصرف اردو کلام ہے،۳۸ ہیں۔عیسائیوں اورعورتوں کے صرف اردواشعار ہیں۔

(۳) مقامی حیثیت سے دیکھیے تو دہلی، جہان کے ۱۳۷۵ شعرا تذکرے میں ہیں، اورتمام مقامات پر غالب ہے،لکھنو کے صرف ۱۶ اشعرا قابل شمول سمجھے گئے ہیں، باقی شعرا دوسرے مقامات کے ہیں جن میں غالباً سب سے زیادہ آگرے کے ہیں۔

سری رام کا یہ قول تو صحیح نہیں کہ مصنف نے دہلی سے باہر قدم رکھنا عار سمجھا ہے لیکن یہ ضرورصحیح ہے

۱۔بعض اوقات یہ فیصلہ مشکل ہے کہ کون شاعر کہاں کا ہے۔ میں۔بعض صورتوں میں قیاس سے بھی کام لیا ہے۔

کہ بہ کثرت بیرونی مشاہیر مثلاً برق، رشک، صبا، نوازش وغیرہ نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ دہلی کے بارے میں مصنف کو ایک حد تک دعویٰ تھا لیکن وہاں کے بھی متعدد خوش گو شعرا (مجروح، ظہیر، انور وغیرہ) کسی نہ کسی وجہ سے گلستان سخن میں داخل نہ ہو سکے، ہاں ایسے لوگ جس کا صابر و صہبائی سے تعلق ہے (خواہ ان کی مشق چند روز ہی کیوں نہ ہو) تذکرے میں شامل ہیں۔

(۴) زمانہ تالیف تذکرہ میں دہلی کے ہر طبقے کے لوگ شعر گوئی کی طرف مائل تھے اور صوفیہ، اوباش اور رند مشرب، امرا اور بازاری، بادشاہ اور شاہ زادے سب کو اس کا ذوق تھا۔ تیموری خاندان کے شعرا جن کا اس تذکرے میں ذکر ہے، ۷۰ ہیں۔

(۵) اس امر سے کہ پہلے تذکرے کا نام آثار المعاصرین رکھا گیا تھا، یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں صرف وہی شعرا ہیں جو اصطلاحی معنی میں صابر کے ہم عصر تھے، اس لیے کہ اس میں فراق و قاسم وغیرہ ہیں جو صابر کیا صہبائی کے بھی ہم عصر نہیں کہے جا سکتے۔

(۶) گلستان سخن (مقدمہ مقصد) میں دہلی کے جن اساتذہ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو زمانہ تالیف سے بہت قبل وفات پا چکے تھے (نصیر، ممنون) اور وہ بھی جو اس قدر کم عمر تھے کہ شاید صہبائی کے خاص حلقے سے باہر انہیں استاد نہ سمجھا جاتا ہو (مثلاً سوز)۔ آزردہ کا ذکر سب سے علیحدہ کیا ہے اور انہیں سب سے بڑھایا ہے لیکن یہ غالباً مصلحت کی بنا پر ہے۔ نہ وہ اس کے مستحق ہیں اور نہ

صہبائی وصابر انہیں واقعی اتنا بڑا سمجھتے ہوں گے۔

تذکرے کا آغاز بھی انہیں سے ہوا ہے (حالانکہ مقررہ قاعدے کے مطابق آباد سے ہونا تھا)۔ اساتذہ کی تعریف میں بڑے مبالغے سے کام لیا ہے اور کہیں کہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کھل کر بات نہیں کہنا چاہتا، یا کم از کم اس کی ذمہ داری خود قبول کرنا نہیں چاہتا، مثلاً مومن کی خود بینی کا ذکر۔ اظہار رائے میں ذمہ داری کا احساس کارفرما نظر نہیں آتا۔ صہبائی سوز و صابر کی آوازگری (پروپیگنڈہ) تالیف تذکرہ کی سب سے بڑی غرض معلوم ہوتی ہے۔

(۷) بعض غیر مشہور شعرا کے حالات میں واقعہ نگاری سے کام لیا ہے لیکن بیشتر مشاہیر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ تاہم بہت سی کام کی باتیں اس تذکرے میں ملتی ہیں اور آزاد نے آب حیات میں اس سے کئی جگہ کام لیا ہے (مثلاً حالات شاہ نصیر)، گو اس کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ تذکرہ سخن شعرا کے بھی ماخذوں میں ہے۔ خود اس تذکرے میں گلشن بے خار کے سوا کسی تذکرے سے کوئی بات نہیں لی گئی، بعض اور تذکروں کا ذکر اس میں ضرور ہے۔

(۸) گلستان سخن میں التزاماً تلمذ کا ذکر نہیں، خاص خاص شعرا کے شاگردوں کی تعداد جو مجھے اس کتاب سے معلوم ہوئی، یہ ہے: صہبائی ۴۸ (اس میں درسیات پڑھنے والے بھی شامل ہیں) نصیر ۲۹، احسان ۳، ذوق ۲۲، مومن ۲۱، مشیر ۱۵، صابر ۱۴، غالب (بہ شمول حزیں) ۱۲، ممنون ۸،......سوز ۳، تنویر ۳، آزردہ ۲، عارف ۲، ثابت (موخر الذکر کے بارے میں لکھا ہے کہ اولاد تیموریہ میں بیشتر اسی صاحب طبع کی شاگردی سے ممتاز ہیں)۔

واضح رہے کہ میں نے احتیاط سے گنا ہے لیکن شمار کرنے میں غلطی کا احتمال ہے میں نے صرف ان شعرا کو لیا ہے جن کے بارے میں صراحتاً لکھا ہے کہ کس کے شاگرد ہیں۔ اپنے معلومات یا قیاس سے کام نہیں لیا۔ اگر کسی شاعر کو ایک سے زیادہ

استادوں سے تلمذ ہے تو اس کا شمار سب استادوں شاگردوں میں کیا گیا ہے۔

(۹) واقعات جب بیان کیے جاتے ہوں کتاب میں زیادہ تر ایسے لوگوں کا ذکر ہو جنہیں جاننے کے مواقع حاصل ہیں تو اغلاط زیادہ نہیں ہو سکتے، لیکن دہلوی شعرا ہوں یا بیرونی، تھوڑے بہت اغلاط ان کے متعلق موجود ہیں، مثلاً سرور کے استاد کا تخلص سامی لکھا ہے حالاں کہ یہ ساقی ہے (تذکرہ سرور) میر ببر علی انیس کا نام میر پیر علی لکھا ہے۔

اور تذکرہ نگاروں کی طرح گلستان سخن کے مؤلف نے بھی حالات کی فراہمی میں میں زیادہ زحمت اٹھانی گوارا نہیں کی اور سرسری طور پر جو کچھ معلوم ہو سکا ہے پیش کر دیا ہے، مثلاً حزیں دہلوی کے متعلق لکھا ہے کہ اسے عارف سے تلمذ تھا، غالب ہے کہ اب غالب سے اصلاح لیتے ہوں گے۔ خلاصہ یہ کہ ولی عہد کے نوکر تھے بہ آسانی تحقیق کی جا سکتی تھی کہ وفات عارف کے بعد کس کا تلمذ اختیار کیا تھا۔

(۱۰) شاعروں کے تراجم کے ساتھ جو ان کے اشعار ہیں ان کی تعداد یہ ہے: فارسی ۹۲۹۔ سید کے دو مصرع (و مادھائے تاریخ) مزید برآں، اردو ۳۶۱۴، مخمس کے ۲۶ بند۔ ان کے علاوہ مقدمے میں جو اشعار ہیں وہ اس تعداد میں شامل نہیں۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر ایسے لوگوں کے اشعار بھی بھر دیے ہیں جن کے اشعار کچھ بلند پایہ نہیں۔ غلط انتساب کی صرف ایک مثال اس وقت میرے علم میں ہے: ہوا ہے ابر ہے ساقی ہے مے ہے پر اک تو ہی نہیں افسوس ہے ہے یہ میر انیس کی طرف منسوب ہے لیکن تذکرہ قدرت اللہ شوق میں جو میر انیس کی ولادت سے قبل کی تالیف ہے، ایک گمنام شاعر کے نام سے ہے۔

(۱۱) کتاب کی عبارت نامانوس عربی و فارسی مفردات و مرکبات سے مملو ہے اور اس میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس میں اردو کا لطف ملتا ہو۔ بے نمک استعارات، خنک تشابیہ، دور از کار کنائے، مزید برآں ظاہر ہے کہ اس صورت

میں بے ارادہ حقیقت سے انحراف ہو جانے کا بہت کچھ احتمال ہے اور ایسا ہوا ہے۔

(۱۲) مقدمے میں بہت سی غیر ضروری باتیں ہیں لیکن جس زمانے میں لکھا گیا ہے اس لحاظ سے غنیمت ہے۔ توافق لسانین پر مؤلف کی نظر ہے، اگر چہ غلط مثالیں بھی دی ہیں۔ لفظوں کی اصل معلوم کرنے کا بھی شوق ہے، اگر چہ اس میں بعض جگہ دھوکا کھایا ہے۔ دساتیر سے متعلق طویل بحث ہے۔ دساتیر سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے مگر یہ تعجب کی بات نہیں کہ اپنے معاصرین کی طرح مؤلف کو بھی یہ خیال نہ ہوا کہ یہ جعلی ہے۔ اور حواشی وغیرہ میں جن کتابوں کا ذکر ہے یا تو ان کا وجود ہی نہیں یا یہ بھی جعلی ہیں اور شکل اول میں اقتباسات محض فرضی ہیں ا۔

(۴)

قاضی صاحب کے ان اقتباسات سے گلستان سخن کی اہمیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ صابر نے اگر چہ مشاعروں کے حالات دینے میں زیادہ محنت سے کام نہیں لیا، تاہم اپنے معاصرین کے بارے میں انہوں نے بعض نئی معلومات ضرور مہیا کی ہیں۔ مثلاً دلی میں منعقد ہونے والے بعض مشاعروں کے بارے میں ہمیں باخبر کیا ہے۔ چناں چہ مندرجہ ذیل مشاعروں کا حال گلستان سخن سے معلوم ہوتا ہے:

صفحہ ۲۲۹ : مشاعرۂ مدرسۂ غازی الدین کا ذکر اور آشفتہ کے انتقال کا واقعہ

صفحہ ۲۴۶: مشاعرۂ دیوان خانۂ والد مرزا وجیہ الدین اختر۔

صفحہ ۳۱۷: مشاعرۂ مدرسۂ غازی الدین کا تفصیلی

ا۔ غالب نے قاطع برہان میں ایک معلم (صریح اشارہ بہ صہبائی) کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خوشتاب اور زندہ رود کے مطالعے کا فخریہ ذکر کرتا ہے حالاں کہ ان سے فارسی نہیں آسکتی (صہبائی اس کا مدعی نہیں)۔ صہبائی کی کسی کتاب میں جوان

کے نام سے چھپی ہے اور میری نظر سے گزری ہے ان کتابوں کا ذکر نہیں اور غالب نے گلستان سخن ہی کو دیکھ کر قاطع میں ان پر الزام لگایا ہے۔

ذکر اور شاہ نصیر کا طرحی غزلیں کہنا۔

صفحہ ۴۱۵: مشاعرہ دربار عام۔

صفحہ ۴۹۴: مجلس مشاعرہ۔

صفحہ ۵۳۱: مشاعرہ بر مکان شیفتہ۔

اس کے علاوہ اس تذکرے کی تاریخی اہمیت بھی اس زمانے میں استاد شاگرد کی روایت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اس لیے جا بجا مختلف شعرا کے استاتذہ کا بھی پابندی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اپنے دوسرے معاصر تذکرہ نگاروں میں یہ تذکرہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں شعرا کے حسب نسب کو بھی بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اگرچہ تذکرہ نگار اس بات کا پابند نہیں کہ ہر معاصر کے بارے میں جو تحریر تذکرہ سے پہلے یا دوران میں فوت ہوا ہے، پابندی کے ساتھ سنۂ وفات دے، لیکن بعض شعراء کے حال میں صابر سنہ بھی درج کر گئے ہیں، جس سے مورخ کے لیے آسانی پیدا ہو گئی ہے۔

اس تذکرے کی تیسری خوبی یہ ہے کہ لکھنے والے نے شخصیت نگاری کو خاص اہمیت دی ہے۔ چناں چہ اپنے بعض معاصر شعراء کے بارے میں ان کی آرا دل چسپ ہیں، مثلاً:

صفحہ ۲۵۸: احمد۔ مروت و دوست نوازی میں یکتائے زمانہ۔

صفحہ ۲۶۵: ارشاد۔ درویش صاف طینت، پاک نہاد۔

صفحہ ۲۷۱: اشکی۔ فکر خوش، طبع رسا، ذہن سلیم، اطوار حمیدہ، عادات پسندیدہ

ایک ذات میں جمع ہیں۔

صفحہ ۲۷۵: امین۔ باوجود ان کمالات کے حلم مجسم اور ہمہ تن اخلاق۔ ان کے لب

کو برگ گل کی طرح سے کبھی تبسم سے اور ان کی پیشانی کو شگوفے کی مانند شگفتگی سے خالی نہیں پایا۔

صفحہ ۲۷۸: امیر۔ تقریر شستہ اور گفتگوے شائستہ اور روزمرۂ صاف پر قادر تھا۔

صفحہ ۲۸۱ پر میاں اوج کا خاکہ کمال فن کا ثبوت ہے۔

صفحہ ۳۰۶ جلیس۔ مرد سپاہی وضع، مودب، کم گو تھا۔

صفحہ ۳۰۴: داغ۔ صاف دل، نیک نہاد۔

صفحہ ۲۱۸: آباد۔ ہم صحبتاں آوارہ مزاج کے اختلاط سے تحصیل کمال کی طرف قاطبتاً توجہ نہیں۔

صفحہ ۲۱۹: آتش۔ باعتبار تخلص کے آتش تھا، باعتبار تواضع کے خاک، باعتبار تن سست تھا، باعتبار فکر کے چالاک۔

صفحہ ۲۲۶: آزاد۔ خوش فکر، ذکرالطبع، شوق علم تصوف نے ضمیر حقیقت تخمیر پر استیلا پایا ہے۔ جوان خوب صورت، وجیہہ، رند مشرب، بے باک مزاج، آزاد وضع، گویا اسم بامسمی ہیں۔

صفحہ ۲۳۶: آصف۔ مرد صاحب اخلاق و رنگین صحبت۔

صفحہ ۲۳۷: آفی۔ یاد حق میں مشغول.... آزادانہ بسر کرتے ہیں اور بیشتر اوقات سیاحت و سفر خصوصاً زیارت اولیا میں گزارتے ہیں۔

اشراف پرستی کے اس زمانے میں جب حسب نسب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ مغلیہ تمدن کے باقیات میں سلیقے اور آداب مجلس کو بڑی شہرت ملی۔ گلستان سخن کا مرتب بھی مغلیہ تمدن کی مٹتی ہوئی قدروں کا امانت دار ہے۔ مختلف شعرا کی

شخصیتوں میں ہو مجلسی زندگی کے اصول تلاش کرتا ہے اور ان کی مدد سے ہمیں اس معاشرتی فضا کی جھلک دکھاتا ہے، جس کے ٹوٹے ہوئے رشتے تاریخ، مکتوبات، تذکروں وغیرہ میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے گلستان سخن اردو تذکروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جن شعرا کا ذکر اس میں کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کے ساتھ مرتب کے تعلقات اس لیے اس کی بیان کردہ معلومات قابل اعتبار ہیں اور آخری مغلیہ دور کو سمجھنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔

(۵)

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اپنی کتاب شعرائے اردو کے تذکرے میں قدیم تذکروں کی مختلف خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد تذکرہ نگاری کو ارتقاء کے اعتبار سے دو بڑے طبقوں میں تقسیم کیا جو یہ ہیں:

طبقۂ اول: قدیم طرز کے تذکرے:

(الف) دبستان میر: یعنی وہ تذکرے جو میر تقی میر کی خصوصیات تذکرہ نگاری کا تتبع کرتے ہیں۔ واقعات میں اختصار اور اصلاح سخن ان تذکروں کے امتیازات ہیں۔ مثلاً:

(۱) نکات الشعرا میر تقی میر (۲) تذکرۂ ریختہ گویان، فتح علی حسینی۔ (۳) مخزن نکات، قائم (۴) تذکرہ میر حسن دہلوی (۵) مصحفی کے تذکرے۔

(ب) دبستان میر کے خلاف ردعمل: یہ ردعمل میر کی اختصار پسندی کے خلاف ہے اور اس کا نتیجہ اختصار کی بجائے ''جامعیت بہ لحاظ اسماء و افراد ہے۔'' عیار الشعراء اس جامعیت کا بڑا نمائندہ ہے۔ جامعیت پسند تذکروں کی فہرست یہ ہے:

(۱) عیار الشعراء، ذکا۔ (۲) عمدۂ منتخبہ، اعظم الدولہ سرور (۳) مجموعہ نغز، حکیم قدرت اللہ قاسم۔ (۴) گلشن بے خار، شیفتہ۔ (۵) گلستان بے خزاں، باطن۔

طبقۂ ثانی: جدید اثرات کے حامل تذکرے:

(الف) ان تذکروں میں سوانحیت کا رنگ غالب ہے۔ ان میں صرف منتخب شعراء کے **مفصل** حالات زندگی ملتے ہیں اور واقعات کی تاریخیں بھی معین کی گئی ہیں۔ ان تذکروں کے نام یہ ہیں:

(۱) گلزار ابراہیم۔ (۲) گلشن ہند علی لطف۔

(ب) دتاسی، کریم الدین اور صہبائی کے تذکرے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سوانحیت کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اردو شاعری کا ارتقاء بھی مطالعے میں آ جائے۔

(ج) آب حیات، آزاد۔ تذکرہ نویسی میں لٹریری ہسٹری کا رنگ۔ بعد کے بیشتر تذکرہ نویس اس معاملے میں مولانا آزاد کا تتبع کرتے ہیں۔''

(شعرائے اردو کے تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۱۲۔۱۳)۔

گلستان سخن اس تقسیم میں طبقۂ ثانی کی ب شق میں آتا ہے۔

(۶)

اردو شعرا کے تذکروں میں فارسی تذکروں کی طرح ایک ہی روایت چلتی رہی ہے جس کے بارے میں اب تک بعض غلط فہمیاں ادباء میں رائج ہیں۔ چناں چہ تذکروں کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر کلیم الدین احمد ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں اس روایت کا خاص طور پر مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کی رائے میں اردو تذکرے عبارت آرائی کا شکار ہیں اور ہر جگہ الفاظ کا سیلاب رواں ہے ۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے میں مشرق میں تنقیدی نظریات کا کوئی منظم، **مسلسل** اور مربوط سلسلہ نہیں ملتا ۲۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالقیوم ''تنقیدی نقوش'' میں ہمارے تذکروں میں تنقیدی شعور کی کمی کا رونا روتے ہیں۔ لیکن ان صاحبوں

۱۔ اردو تنقید پر ایک نظر: طبع اول، صفحہ ۱۸۔

۲۔ اردو تنقید کا ارتقاء: صفحہ ۶۲۔

کی آراء زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں، اس لیے کہ انہوں نے اردو تذکروں کو اس دور کی ادبی اور معاشرتی فضا سے الگ کر کے دیکھا ہے۔ ان تذکروں میں بیان کیے گئے تنقیدی خیالات کی صحت یا عدم صحت کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اردو شاعروں اور ادیبوں میں سرے سے تنقیدی شعور ہی موجود نہیں ، درست نہ ہو گا۔ مسیح الزماں صاحب نے قدیم تذکروں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بالکل بجا کہا ہے:

''کون کہہ سکتا ہے کہ غدر سے پہلے کے اردو شاعروں میں تنقیدی شعور نہیں تھا۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے جب خیال سے زیادہ الفاظ پر زور دیا جاتا تھا۔ جب بات کہنے کا طریقہ بات سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا۱''

اردو تذکرہ نگاروں کے ہاں یہ تنقیدی شعور مختلف ادوار میں یکساں قوی نہیں رہا۔ میر تقی میر اور ان کے معاصرین کے ہاں الفاظ پر خیالات کو فوقیت حاصل ہے اور وہ تنقیدی اصطلاحات، جنہیں پروفیسر کلیم الدین احمد 'الفاظ کا سیلاب' کہتے ہیں، غیر محتاط طریقے پر استعمال نہیں ہوئیں، بلکہ ہر لفظ کا ایک مقرر اور معین معنی ہے، جس کے حوالے سے میر اور ان کے ساتھی اپنا مافی الضمیر ادا کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کے بنیادی تصورات محدود ہیں اور اسالیب کی باریکیوں میں یہ لوگ دور تک نکل جاتے تھے۔ میر کے بعد میاں حسن اور

۱۔ اردو تنقید کی تاریخ، جلد اول، صفحہ ۱۵۸۔

ان کے معاصرین کی تذکرہ نگاری کا زمانہ آتا ہے، جب تنقیدی سے سوانحی حصہ

زیادہ اہم ہوگیا اور تذکروں میں حالات وواقعات نے تنقید سے زیادہ اہمیت حاصل کرلی۔ لیکن اس زمانے میں بھی عروض ومعانی وبیان اور صنائع بدائع کے متعارف سانچے تنقیدی آراء میں دخل انداز رہے۔ اس تنقیدی روایت میں بھی تبدیلی آئی۔ مصحفی اور ان کے ساتھیوں نے غزل کی غنائی روایت کو خصوصی اہمیت دی۔ یہ نیا تنقیدی شعور اردو تذکرہ نگاری کی قدیم روایت میں نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ تنقید اب معاشرتی فضا سے ہم آہنگ رہ کر تنقیدی شعور کی تربیت میں لگی رہی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب فورٹ ولیم کالج میں تذکرہ نگاری کا ایک اور دبستان وجود میں آتا ہے جس نے سوانحی رنگ کو زیادہ نکھار دیا۔ یہ نیا انداز تذکرہ نگاری مسلسل نہ رہ سکا، تا آنکہ دلی اور لکھنؤ میں تذکرہ نگاری کا وہ انداز شروع ہوا جس میں شعراء کی تعداد کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ اسی زمانے میں گلشن بےخزاں، عیار الشعراء، خوش معرکۂ زیبا، سراپا سخن اور عمدۂ منتخبہ وغیرہ لکھے گئے۔ یہ قدیم دبستان تذکرہ نگاری کا آخری زمانہ ہے جب معاشرتی زندگی میں زوال پذیر عناصر کی کثرت کی وجہ سے، نیز زبان پر ضرورت سے زیادہ توجہ ہو جانے کے سبب، دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ادب متاثر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دلی اور لکھنؤ کے اس دور کی تذکرہ نگاری کا عام رجحان سوانحی حصے پر توجہ کی بجائے شخصیت اور تنقید کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے۔ گویا اس مرحلے پر اردو تذکرے شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے اوصاف سے متصف ہو کر اردو تنقید میں ایک نئے رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ شعرا کی شخصیت کے بارے میں رائیں تذکروں میں عام ہو جاتی ہیں، استادی شاگردی کے سلسلے اہمیت حاصل کر جاتے ہیں اور تنقید میں لفظی گرفت اور مناظرے اور مناقشے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ شعراء کی وفات کے سنین بھی غیر محتاط صورت میں قلم بند ہونے لگے۔ اس دور کے تنہا محتاط تذکرہ نگار عبدالغفور خاں نساخ ہیں جنہوں نے سخن شعراء میں شاعروں کی تاریخ وفات کو اکثر احتیاط کے ساتھ درج کیا ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ

نساخ دلی اور لکھنؤ کے شہروں سے بہت دور زندگی بسر کر رہے تھے اس لیے وہ ان شہروں میں پروان چڑھنے والی بعض قباحتوں سے بچ گئے۔ مجموعی اعتبار سے یہ دور سماجی اور سیاسی زوال کا ہے۔ معاشرتی زندگی کی ابتری کا اثر تذکروں پر بھی پڑا۔ اب تذکروں میں تنقیدی رائیں گروہ بندی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ شیفتہ اور ان کے معاصرین کی تحریریں اس طرح کے خارجی عوامل سے خالی نہیں ہیں جو معاشرتی زندگی کی بربادی اور بدنظمی کو آشکار کرتے ہیں۔ شیفتہ البتہ الفاظ کے استعمال میں Under tone کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ان کے تذکرے کی عبارتیں بظاہر غیر محتاط عبارت آرائی محسوس ہوتی ہیں لیکن درحقیقت لفظوں کے اس بے دریغ استعمال کی تہہ میں بعد دوسرے ضمنی اور ذیلی اشارے بھی پائے جاتے ہیں جن سے شیفتہ کا تذکرہ ایک دل چسپ دستاویز بن گیا ہے، ورنہ اس آخری دور کے قدیم رنگ کے تذکرہ نگاروں کے ہاں الفاظ کا سیلاب پایا جاتا ہے، اور یہ سیلاب (جس کے خلاف ڈاکٹر عبادت، کلیم الدین احمد وغیرہ نے زہر اگلا ہے) کچھ کچھ ان کتابوں تک بھی جا پہنچا ہے جنہیں جدید اثرات کے حامل تذکرے کہا جاتا ہے۔ ان نئے تذکروں میں سوانحیت کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے ارتقا کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے، اور ایک حد تک تنقید کی ان گم شدہ کڑیوں کو بھی جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس دور کے ادبا کے لیے بالکل سامنے کی چیزیں تھیں اور جنہیں عام طور پر قلم بند نہیں کیا جاتا تھا، لیکن آج ہمارے لیے ان کڑیوں کی موجودگی کے بغیر قدیم تنقیدی روایت کو سمجھنا خاصا مشکل ہوتا۔

تذکرہ نگاری کی یہ ترمیم شدہ روایت جس کا آغاز گارسیں دتاسی، کریم الدین، صہبائی اور گلستان سخن کے مرتب نے کیا ہے، شاعری کے تاریخی ارتقا کو مدنظر رکھتی ہے اور مختلف دور کے شاعروں کو ایک خاص پس منظر میں پیش کرتی ہے۔ اس سے اردو تذکرہ نگاری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دور کچھ تو نئی فضا کی خوبیاں

رکھتا ہے اور کچھ اس میں قدیم زوال پذیر تمدنی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔

ان تذکروں کا ڈھانچا بقول مسیح الزماں:

''تذکروں سے الگ تاریخ ادب کے ڈھنگ پر ہے۔ یہ تصور دتاسی کا مرہون منت ہے جس کا سوچنے کا ڈھنگ اور تجزیے کا طریقہ اردو کے دوسرے تذکرہ نگاروں سے مختلف تھا اور اسی وجہ سے اس نے اردو ادب کی ایسی تاریخ لکھی جو بہت کچھ مغربی طرز کی تھی جس میں مبالغہ کم اور بیان واقعہ زیادہ تھا۔''

دتاسی کی یہ احتیاط اس کے اپنے مقلدین کو بھی صرف ایک حد تک متاثر کر پائی، اور بشمول کریم الدین، ان تذکرہ نگاروں سے واقعات کی صحت کا اہتمام زیادہ نہیں ہو سکا۔ ان دانش مندوں کی تنقیدی آراء ایک حد تک نپی تلی ہونے کے باوجود لفاظی اور لفظوں کے بے ضرورت استعمال کی طرف راغب ہے۔ ان کی اکثر تنقیدی اصطلاحات مبہم اور غیر معین ہیں۔ گلستان سخن اس لحاظ سے اپنے معاصر تذکروں سے علیحدہ ہو جاتا ہے کہ اس میں معاصرین سے سروکار رکھا گیا ہے۔ اس فاضل تذکرہ نگار کی توجہ شعرا کی شخصیت اور ان کے استادی شاگردی کے سلسلوں کی طرف زیادہ رہی تنقیدی رائے میں وہ، اپنے دور کا ہونے کی وجہ سے، معروضی انداز اختیار نہیں کر سکا، اس لیے اس کی بیان کردہ آراء مجموعی طور پر زیادہ وقیع نہیں ہیں۔ چنانچہ جن عبارتوں اور تنقیدی اصطلاحوں میں شعراء پر تنقید کی گئی ہے وہ مبہم اور غیر واضح بھی ہیں۔ چند مقامات پر البتہ ان کی رائے میں بھی وہی انداز آ گیا ہے جس کی وجہ سے ہم میر اور ان کے معاصرین کے تذکروں کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس تذکرے کا سلسلہ اپنے دور سے قدیم تر تذکروں کے ساتھ جا ملتا ہے،

---

(۱) اردو تنقید کی تاریخ، پہلی جلد، صفحہ ۱۲۳۔

تاہم دوسرے قدیم تذکروں کے مقابلے میں اس میں شعر کی ماہیت، تخلیقی عمل، شعری روایت اور انتقاد کا سرمایہ کم ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ مولوی امام بخش صہبائی باوجودیکہ دہلی سے متعلق تھے اور شاعری کا جو تعلق قدیم نظام معانی و بیان کے ساتھ تھا، نیز شعری عمل میں زبان کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس سے ایک حد تک واقف تھے اور انہوں نے اپنے انتخاب دواوین میں نہ صرف شعرا کے زمانی قرب کو قائم رکھا ہے بلکہ شاعری سے متعلق بعض مسائل کو بھی دیباچے میں بیان کر دیا ہے۔ پھر بھی ان کے ہاں تاریخ نگاری ہی کا پلہ بھاری ہے۔ گلستان سخن کا حالات والا حصہ بگمان غالب ان کے شاگرد کی تالیف ہے، اس لیے شعرا کا حال اس عیب سے خالی نہیں۔ کتاب کے شروع میں فن شعر سے متعلق جملہ معلومات درج ہیں اور یہ احساس ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار شعری سرمائے کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے باوجود یہ نقطۂ نظر شعرا کے حال میں آ کر ایک بڑی حد تک سرد پڑ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تذکرہ اپنے دور کی دونوں متضاد تحریکات کے زیر اثر ہے کہ ایک طرف اس میں گارسیں دتاسی کی قائم کردہ روایت کی جھلک موجود ہے اور دوسری طرف اس کا تنقیدی مزاج اپنے دور کی زوال آمادہ روایت سے منسلک ہے۔

سوانحی حصے پر اگرچہ اس تذکرے میں زیادہ توجہ نہیں کی گئی لیکن بعض دوسری ضمنی معلومات کی وجہ سے گلستان سخن کا مرتب ضرور اپنے بعض دوسرے ہم عصر تذکرہ نگاروں سے سبقت لے گیا ہے۔ تذکرے کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے غالب اور ان کے معاصرین کے بعض تنقیدی رجحانات اور ذوق ادب کی بعض بدلتی ہوئی صورتوں کا سراغ ملتا ہے۔ اس لیے آخری دور کے تذکروں میں گلستان سخن کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

تذکرہ گلستان سخن

(حصہ اول)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پلا ساقی مجھے جام مے ناب
کہ دل سینے میں ہے جوں برق بے تاب
کر اس مے کے لیے پیدا وہ انگور
کہ ٹپکے اس سے جوں مے خون منصور
وہ مے ظاہر میں گو آب خنک ہو
پہ بجلی اس کی اک موج تنک ہو
تجلی اس کی ہو گر پرتو افگن
جلا دے طور کا سارا وہ خرمن
پری کی طرح ہو مینا میں مستور
پہ جوں خورشید دے عالم کو اک نور
نہ کچھ تنہا وہ نقد جام جم ہو
چراغ دیر ہو شمع حرم ہو
اسی سے پر ہوا ہو صبح اور شام
جنید و شبلی و منصور کا جام
رہے دائم وہ جوں عشق جگر جوش
جنوں کی راہ بر اور رہ زن ہوش
ہر اک جرعہ ہو اس کا جان منصور
ہر اک قطرہ شرار آتش طور

یہ کچھ پر زور ہو وہ صاف گل رنگ
کہ موج اس کے دل مینا پہ ہو سنگ
اگر ہے صاف اگر درد اس سے اک جام
پلا دے مجھ کو اے غارت گر کام!
کہ میرے دل سے معنی جوش زن ہے
زباں کو گرمی شغل سخن ہے
اگر سیراب ہو جام مئے ناب
نہال گلشن معنی ہو سیراب
کر ایسا جام مے سے مجھ کو سر مست
کہ دل سے محو ہو سب نیست اور ہست
سدا رہوے زباں پر حمد کا ذکر
نہ رہوے دل کو جز توحید کچھ فکر

چمن چمن حمد اور گلشن گلشن ثنا کے لائق وہ بہار پیرا ہے، جس کی نسیم قدرت نے سمن رویوں کے رخسار کو گل سے شگفتہ تر کیا اور مسلسل مویوں کی زلف کو سنبل سے آشفتہ تر۔ اسی چمن آرائے قدرت کا ایجاد ہے کہ چشم نرگس باوجود نابینائی کے باز اور سرو باوجود پا در گل ہونے کے آزاد ہے۔ سوسن اس کی رازداری سے باوجود دہ زبانی کے خاموش اور زبان بر قفا۔ اس کے نفاذ امر سے باوصف نافرمانی کے اطاعت میں سخت کوش۔ اس کے نیسان عطا سے صدف گل گوہر شبنم سے آبستن اور اس کے کان سخا سے خاک چمن زر جعفری کے مخزن۔ سبحان اللہ کثرت کو آئینۂ وحدت کیا، اور دوئی کو مظہر عینیت بنایا۔ نظر تحقیق میں قطرہ و موج و حباب کی اصل آب ہے اور نگاہ تامل میں شرار اور شعلہ سرکش کی وہی آتش ہے کہ رگ ہر سنگ میں مثل خوں جاری ہے اور وہی بہار ہے کہ ریشۂ ہر نہال میں مثل آب ساری ہے۔

ہاں مگر تفاوت مراتب کا درمیان ہے اور یہ تفاوت مثل ذرہ وآفتاب عیاں ہے۔ مظہر تام وہ یگانہ ہے کہ معنیٔ لولاک اس کی وسادۂ عظمت سے ایک طراز ہے اور سیر افلاک اس کی شوخیٔ سمند کا ایک انداز ہے۔ انا افصح رنگ ہے اس کے گلزار مقال کا، اور انا املح نمک ہے اس کے خوان جمال کا۔ قاب قوسین گواہ ہے کہ 'ما عرفناک' صرف سلوک ہے طریقۂ انکسار میں اور 'انا احمد' بلا میم شاہد ہے کہ 'لا احصی' محض اہتمام ہے اخفائے اسرار میں۔ خاکی کو اس فلک مرتبت کے مدارج نعت پر صعود کرنا ایسا محال ہے جیسے گرد اوصاف میں لب کھولنا اس طرح دشوار ہے جس طرح بندے کو خالق کا راز زبان پر لانا۔ حق یہ ہے کہ نہ ادائے حمد کے لائق زبان ہے اور نہ گزارش نعت کے سزاوار بیاں۔

پس واجب ہے کہ بارگاہ معبود میں ادائے سجود اور پیش گاہ نبوت میں گزارش درود کی سعادت حاصل کر کے کارکنان مملکت شریعت اور پیشوایان راہ طریقت یعنی چار یاران خلافت مرتبت کے حق میں رحمت کی استدعا کرے اور پھر فکر تیز پا اور اندیشۂ رسا کی اعانت سے ایسے دست گیر خلائق اور دست گرفتۂ خالق کا ثنا طراز ہو کہ اس عہد میں بعد خلفائے راشدین کے چار بالش خلافت پر جاگزیں ہے اور ایوان ریاست میں مسند نشیں، یعنی گوہر دریائے سلطنت و تاج داری افسر فرق سعادت و بختیاری زیبندۂ اورنگ ہفت کشور، طرازندۂ تخت و افسر، بانی بنائے معدلت، مروج قواعد نصفت، محیٔ مراسم عدل و داد، ماحیٔ آثار ظلم و بے داد، تیزیٔ تیغ شجاعت و بسالت، صفائی آئینۂ عظمت و جلالت، مسند آرائے قصر دولت و اقبال، چمن پیرائے گلشن جاہ و جلال رفعت مرتبت، معالی منزلت، نقاوۂ دودمان صاحب قرآنی، سلالۂ خاندان گورگانی، رافع لوائے انصاف، ہادم بنائے اعتساف، حضرت ظل اللہ ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ۔ دریا اس کے عہد انصاف میں ساحل کی بیخ کنی کے جرم پر حلقۂ موج سے پا

بہ زنجیر، صحرا اس کی عدالت کے دور میں خار کی پرورش کی گناہ پر آبلہ پایوں کے نقش قدم سے شکنجے میں اسیر۔ اس کی سیاست نے چوروں کی سازش سے رنگ حنا کو دست گیر کیا اور اس کی ہیبت نے حصار چمن میں نافرمان کو فرمان پزیر۔ فضائے چرخ اس کی پیش گاہ کی وسعت کے آگے ایک کف دست اور اوج فلک اس کے آستانے کی رفعت کے سامنے پست۔ چوب درباں درفش کاویانی کے روکش، دست و پائے اعدا چاوشان بارگاہ کے ہاتھ میں گرفتار کش مکش۔ اس کا ادنیٰ غلام دارا کو ایسی شکست دے کہ سکندر رشک سے مرجاوے اور اس کا کم تر بندہ ضحاک سے ایسا انتقام لے کہ فریدوں غیرت سے منہ نہ دکھاوے۔ شیر نے اس کے نہیب سے خانۂ روباہ میں پناہ لی اور گرگ نے اس کی دہشت سے گوسپند کے مقابل صحرا کی راہ کی۔

ازبس کہ چیر ظل الٰہی کے سایے میں تربیت پائی ہے، ظل ہما کو اس کے فرق بلند تک جرأت کرنے میں عین خجالت ہے، اور چوں کہ پایہ سریر کا فرق عرش سے بالاتر ہے چوب سدرہ وطوبیٰ کو سامان تخت کے مہیا کرنے میں ندامت ہے۔ اقبال اس کی ملازمت سے سربلند اور دولت اس کے آستانے سے ارجمند۔ فضائے بزم میں شعلہ ہر شمع فروزاں کا رقص ناہید سے نشاط انگیز تر اور میدان رزم میں موج ہر ریگ رواں کے خنجر سے خوں ریز تر۔ دست سخا ایسا سحاب ہے کہ ہر قطرہ اس کا گوہر سیراب ہے اور تخت مرصع ایسا باغ ہے کہ ہر گل اس کا گوہر شب چراغ ہے۔ اہل روزگار گنجیۂ سخا سے ایسے کام یاب کہ شبنم گوہر سے وظیفہ خوار اور گل زر سے روزینہ دار ہے اور خلق خوان عطا سے ایسی سیر کہ غنچۂ نرگس صحن مزعفر کی طرف آنکھ نہیں کھولتا اور گل سوسن دعوت شگفتگی میں باوجود صلائے نسیم کے اس زبان درازی پر منہ سے نہیں بولتا۔ دامن سائل کا اس کے سیل عطا سے ایک گرداب ہے آب گوہر سے مواج اور کشکول ہر گدا کی اس کے خزینۂ بخشش میں کثرت جواہر سے رشک افسر وتاج۔ رخ اعدا کا گل زرد اس کی شمشیر کی بہار طرازی سے گلگوں اور تن خصم کی رود خشک اس کے خنجر کی نیرنگ

سازی سے جوئے خوں۔ صبح اس کی پیش گاہ ادب میں ضبط نفس میں مجبور اور آفتاب اس کی روشن دلی کی خجالت سے پردۂ شب میں مستور۔ قیامت نمونہ ہے اس کی سیاست کا۔ پنجۂ آہنیں اس کے زور دست سے موم اور وجود اعدا اس کے صدمۂ گرز سے معدوم۔ چمن میں نسیم بغیر اس کی اجازت کے زرِ گل کو ہاتھ نہ لگا سکے اور صحرا میں بدوں اس کے حکم کے ایک تنکا نہ اٹھا سکے۔ اس کے عہد انصاف میں دریا تیغ موج سے نہنگ کو تہدید کرتا ہے کہ آشنا کشی سے باز آوے اور صحرا گرز گرد بار سے خار کو ڈراتا ہے کہ آبلہ پایوں کی خون ریزی سے ہاتھ اٹھاوے۔ اگر دبیر فلک اس کے سریر گردوں نظیر کے جواہر آبدار کو تسبیح کواکب پر ابد تک شمار کرے اور فرض و تقدیر کی اعانت سے لاتعین کو تعین اعتبار کرے، ایک پایے کی ترصیع کا حساب انجام کو نہ پہنچاوے اور اگر محاسب وہم اس کے تاج آسمان معراج کے لالی شاہوار اعداد غیر متناہی کی وساطت سے گنے اور عمر بر ہما کو بقدر تکرار انفاس اس حساب میں صرف کرے اس کے نیم گوشے کے موتیوں کے شمار میں عاجز آوے۔ یارب جب تک آسمان ہم صورت تخت اور آفتاب ہم شکل تاج ہے تخت شاہنشہی سے آسمان کو رفعت اور تاج حضرت ظل الٰہی سے آفتاب کو عزت رہے۔

مدح وارث تاج و نگیں، والیٔ مملکت زمان و زمین، ولی عہد خلیفۂ حق، سزاوار خلافت مطلق

ایک شب کنج مسکنت کو چراغ فکر نے منور کیا تھا اور گوشۂ فقر کو شمع معانی نے خانۂ آفتاب سے روشن تر۔ قوافل معنی کی آمد و رفت فرشتوں کی فوج سے افزوں تر تھی اور خلوت ضمیر افراط مضامین سے گنجینۂ جواہر سے مشحون تر۔ کبھی بلبل خامہ عندلیب خوش الحان سے ہم نوا اور کبھی طوطی نفس قمری سجع خوان سے ہم صدا۔ ناگاہ نسیم صبح گاہ نکہت ریاحین سے ہم آغوش اور روائح مشک سے ہم کنار، خلوت دماغ میں نافہ کشا ہوئی اور بزم مشام میں عطر بار۔ صیقل انبساط نے آئینۂ صفائے وقت سے زنگ زدائی کی

اور شاہد نشاط نے گوشۂ طبیعت سے جلوہ نمائی۔ جذبۂ پیام لاریبی جادۂ گریباں کی طرف راہ بر ہوا اور شوق تیز پا صحرائے خیال میں ہم سفر۔ فضائے گلشن قدس کو دل کشا دیکھا اور ہوائے چمنستان غیب کو جاں فزا۔ کہیں شاہدان اقدس شامہ جلوہ گری کرتے تھے اور خوب رویان رنگیں جامہ دل بری۔ ایک ہنگامۂ روا روگرم تھا اور موکب دوا دونی آزرم۔ حیرت نے خلوت چشم میں بساط آرائی کی اور تعجب نے گوشۂ خاطر میں پردہ کشائی۔ بے تابی شوق۔ پنجۂ شرم سے دامن جھٹک کر بڑھایا اور ایک گل رخسار نازک دماغ کے سامنے آیا مگر حرف آشنا کان میں آوے اور پردۂ تحیر چہرۂ نگاہ سے اٹھ جاوے۔ سبب کیا ہے کہ انجمن آرایان جمال گرم شب گیر ہیں اور چمن طرازان حسن آہنگ سفر میں صفیر۔ وہاں تو جس کو دیکھا نگاہ لطف سے زیادہ تر آشنا پایا اور پیام دوست سے زیادہ تر دل ربا۔ حیرت کہتی تھی کہ آس بیگانۂ دیار میں اس قدر آشنا کب بہم پہنچائے تھے اور اس ناشناسا ملک میں اتنے آشنا رو کس دن ہاتھ آئے تھے۔ اس وضع بے اختیاری اور اس خمصۂ اضطراری سے ان عروسان وفا شعار کا لب تبسم سے آشنا ہوا اور ان کا خندہ کنایہ آمیز ہوش ربا۔ تب تو ایک حیرت طاری ہوئی کہ آیا میرا ہی دل ہوش سے بے گانہ ہے یا ان نازنینان مشعبد صفت کی طبیعت ستم ظریفی میں یگانہ۔

آخر آواز آشنا گوش آشنا ہوئی اور صدائے دل نواز رہ بر مدعا کہ ہم وہی گل رویان سمن اندام ہیں کہ تیری صریر قلم کی صلا پر اس وادی دور و دراز میں مرحلہ پیما ہیں اور تیری محفل خیال کے عزم میں اس قدر تیز پا۔ کیا تو نے بزم سخن کو داور داد گر کے تفرج کے واسطے نہیں آراستہ کیا اور خوان معنی کو خدیو عدالت گستر کی ضیافت طبع کے لیے نہیں پیراستہ کیا؟ اسی محفل آرائی کی تقریب ہے کہ ملک نزاکت کے لطیف نہاد اس نقل و حرکت میں بے اختیار ہیں اور اسی بزم پیرائی کا سبب ہے کہ گلشن لطافت کے نازک دماغ اس بادیہ نوردی میں ناچار ہیں۔ ”فی الواقع کیوں کر ایسی بزم کا

شوق دامن گیر اور کس طرح ایسی انجمن دل پذیر نہ ہو کہ صابر صاحب سلیقہ اس کا میز بان ہو اور داور روزگار اس کا مہمان۔ وہ داور جس کی صیت کرم پژمردگان گلشن عالم کی خاطر کو ایسا شگفتہ کرتی ہے جیسے غنچے کو باد نسیم اور اس کی سموم قہر سرکشاں وادیٔ روزگار کے دلوں کو اس طرح جلاتی ہے جیسے اہل کفر و ضلال کو نار جحیم، یعنی حامی امم، ماحیٔ ستم، قاسم ارزاق عباد، ناظم معمورۂ بلاد روشن سواد صحیفہ تقدیر، نقش بند صحایف تدبیر، چمن طراز دولت و اقبال، گل دستہ بند بہارستان جاہ و جلال، زیبندۂ مسند خلافت پناہی، طرازندۂ تخت شوکت دست گاہی، ہادم اساس کفر و عصیاں، قامع بنیان سرکشی و طغیاں، ولی عہد حضرت ظل الٰہی سزاوار لقب عالم پناہی، مرجع شجاعت پیشگان، صاحب تہور مرزا فتح الملک بہادر دام اقبالہ و ضاعف اجلالہ، کہ جہاں اس کے سایۂ حمایت میں تقلب ادوار سے مامون ہے اور عالم اس کے حصار عنایت میں حوادث روزگار سے مصوٗن۔ سوال ہنوز لب تک نہیں آیا کہ اس کے گنجینۂ کرم سے زر و جواہر نے قدم بڑھا کر استقبال کیا اور حرص سے اب تک اظہار مطلب نہیں ہوا کہ نعمت الوان نے اس کے خوان عطا سے خود پہنچ کر زبان سوال کو لال کیا۔ شجاعت اس کی شیری سے دلیر، ہوس اس کی زیادہ بخشی سے سیر۔ اگر کسی کو پردۂ تقدیر سے اپنی خدمت کے واسطے طلب کرے ہنوز کاتب قدرت اس کی لوح پیشانی پر کوئی حرف لکھنے نہ پاوے کہ سرعت امتثال سے یک راست اس کے آستانے پر چلا آوے۔ گل اگر اس کے سامنے ہاتھ پھیلاوے زر سے مالا مال ہو جاوے۔ بس کہ اس کے حسن انتظام سے کسی نے مطلوب گم نہیں کیا۔ باغ بان نے قمری کی زبان سے بھی آج تک کو کو نہیں سنا۔ کمال غور اسی باغ بان پر تہدید ہے کہ باوجود دل نہ دینے کے فریاد صنوبر کا کیا سبب ہے اور داغ لالہ کا کیا باعث؟ کمال رعیت پروری سے شبنم کو پاس بانیٔ باغ عطا کی، تا کہ چشم نرگس کثرت بیداری سے بیمار نہ ہو جاوے اور نہایت پردہ داری سے زبان سوسن کو ساکت کر دیا تا کہ باغ بان سے گل چین کی چغلی نہ

کھاوے۔ باغ بان کو حکم ہے کہ گربۂ بید ا باغ میں نہ لگاوے تا کہ طیور کی طبیعت نام گربہ سے سراسیمہ نہ ہو جاوے اور نسیم کو تاکید ہے کہ گل آفتاب شب کو نہ کھلاوے تا کہ دن کے شبہے میں نرگس کے خواب راحت میں خلل نہ آوے۔ اعدا کا گلوئے تشنہ قطرۂ پیکاں سے سیراب ہو سکتا تھا۔ زیادہ بخشی سے آب تیغ کی رو بہا دی اور خصم کے دعویٔ لا طایل کا ابطال حرف گلوگیر کمند سے ممکن تھا، اظہار غلبہ کے واسطے زبان خنجر سے برہان قاطع

ا۔ بید کی ۷ قسموں میں سے ایک قسم 'گربہ بید' ہے۔

سنا دی۔ دشمن اگر چہ نخوت فرعونی رکھتا ہو اس کے اژدہائے شمشیر کے سامنے نہیں آ سکتا اور عدو ہر چند دیو سفید ہو اس کی تیغ رستمی کے آگے سر نہیں اٹھا سکتا۔ حق یہ ہے کہ اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ اس سرفراز عالم کے ظرف تقریر میں نہیں آ سکتے اور حوصلۂ تحریر میں نہیں سما سکتے۔ مناسب یہ ہے کہ سررشتۂ ثنا کو دعا پر تمام کروں کہ آمین گوش بر آواز ہے اور اجابت ارتکاب درنگ سے شکوہ طراز۔ الٰہی جب تک دعائے نیم شبی میں اثر اور آہ سحری میں تاثیر رہے، روئے زمین مانند انگشتر اوس کے زیر نگیں اور خصم سرکش مثل صید زبوں دست گیر رہے۔

احوال مصنف اور سبب تالیف کتاب

قلم نے جب خالق آسمان و زمین کے نقوش حمد سے دامن اوراق کو مالا مال کر لیا اور خلاصۂ ماؤطین کے جواہر نعت سے گنجینۂ کتاب کو مملو کر دیا، خداوند روئے زمین کی مدح سے سخن کو مزین کیا اور وارث تاج و نگین سلطنت کی ستائش سے کلام کو رشک چمن، اب سررشتۂ گفتگو ان مراتب سے کوتاہ اور پیک فکر کو عرض مطلب کے میدان میں روبراہ کرتا ہے کہ محتاج رحمت خالق، احقر افراد خلائق باوصف شاہ زادگی خادم

ارباب فضل وافضال، باوجود صاحب عالم بندۂ اہل کمال اضعف عباد، ناشناسائے بلاد، قادر بخش، صابر تخلص، ابن صاحب عالم و عالمیان، زبدۂ ملک زادگان والائے شان، فلک مرتبت، آسمان رفعت، جم اقتدار، فریدون اعتبار، فخر دودۂ گورگانی، شرف خانوادۂ صاحب قرآنی، صاحب والا پائے گاہی، مالک ازمۂ عالم پناہی ہمرجع اکابر عالم، مرزا اکرم بخت بہادر رفع اللہ قدرہ' وجلالہ وضاعف دولتہ و اقبالہ خلف یگانۂ دودمان سلطنت نشان مرزا خورد بہادر تغمدہ اللہ بغفرانہ ابن سرکردۂ خانوادگان دولت قرین، مرزا عزالدین بہادر مرحوم کہ میں برادر زہندۂ تخت وسریر حضرت عالم گیر ثانی اور فرزند ارشد کیواں ہمم، برجیس شیم فریدوں علم، جمشید حشم، مرزا معزالدین جہاں دار شاہ بادشاہ مغفور کے تھے۔

بدو شعور اور ابتدائے تمیز سے عمر عزیز کو نقد ہنر و جوہر کمال کی جستجو میں صرف کرتا تھا اور از بسکہ فیض الٰہی نے گنجینۂ نامتناہی سے گوہر گراں ارزش دریافت اور جوہر گراں بہائے ادراک عطا فرما کر صغرسن میں اشباہ و امثال سے ممتاز کیا تھا۔ منظر شاخ میں گل کو جلوہ گر دیکھا اور خلوت ریشہ میں برگ و بار کو مشاہدہ کرتا۔ نقطے سے خط اور خط سے سطر کا مضمون سمجھ لینا دشوار نہ تھا اور تخم سے ریشے اور ریشے سے نہال کا حال دریافت کرنا کچھ کار نہ تھا۔ چشم دریافت سے زنگ میں وہ صورت دیکھتا کہ سکندر آئینۂ مصفا میں اور رسائی طبیعت سے سفال میں وہ کیفیت پاتا کہ جمشید جام جہاں نما میں ناخن فکر لغز و چیستاں کی گرہ آسان کھل جاتی اور طبع رسا دقایق اور غوامض کو جلد پہنچ جاتی۔ طبیعت کو مناسبت ایسی تھی کہ اگر عبارت میں الفاظ غیر متعارف سنگ راہ نہ ہوتے وقت معانی کی مزاحمت پیش نہ جاتی اور ذہن کو رسائی اس قدر تھی کہ اگر حذف و تقدیر کی افراط سخن کو حد اہمال تک نہ پہنچا دیتی، پیچ وخم راہ سے منزل مقصود تک پہنچنے میں کچھ خرابی وقوع میں نہ آتی۔ جوں جوں نقد ہنر کا عیار کامل ہوتا جاتا اقران و امثال کو رشک حاصل ہوتا جاتا۔

اوائل حال میں ہر چند نہ شعر کی کیفیت سے آگاہ تھا اور نہ عروض و قافیہ کی حقیقت سے مطلع۔ اکثر اثنائے گفتگو میں شاہد سخن زیور موزونی سے آراستہ ہوتا تھا اور نگارِ کلام حلیۂ وزن سے پیراستہ۔ جب رفتہ رفتہ نہالِ استعداد نے نشو و نما پائی اور رشتۂ سواد خوانی نے رسائی، فہم خداداد نے خودرہ بری کی کہ ایسا انتظام زیورِ کلام ہے اور اس قدر قیود کلام کے واسطے مایۂ انتظام اور یہ صرف اس سبب سے تھا کہ کلام منظور کے طرز و طور کو ملحوظ اور اس انداز کو خزانہ خیال میں فراہم کرتا جاتا۔ جوں جوں کتب درسی میں اصناف سخن نظر میں آتے ایک پردہ اٹھتا جاتا اور یوں منکشف ہوتا کہ کلام موزون میں مدارج کثیر جلوہ نما ہیں اور مراتب بے شمار چہرہ کشا اور تراکیب الفاظ و طریق تشبیہ و وضع استعارہ و اسلوب کنایہ و طرز خطاب و انداز جواب و آسامی عاشق وصفات معشوق سے تو تحصیل کے وقت ہر مقام میں طبیعت آشنا ہوتی ہی جاتی تھی۔ ان سب مراتب کے فراہم ہونے سے طرفہ معجون نے ترکیب پائی اور عجیب کیفیت کی مفرح ہاتھ آئی۔ قدرت کو اور ہی قدرت جلوہ گر ہوئی اور طاقت میسر، استعداد خداداد اور تمیز مادرزاد نے سب اسباب کو اپنے اپنے محل میں اور ہر پیرایے کو اپنے اپنے مقام میں صرف کرنا شروع کیا۔ کبھی ایک مصرع کو دوسرے مصرع سے بطریق بیت کے ربط دیتا اور کبھی بیتوں کو بطور غزل اور قطعات کے اور گاہ مصرعوں کو مسمط کے طرز پر فراہم کرلیتا، اور گاہے ابیات کو بطور مثنویات کے۔ لیکن ان سب مراحل میں نہ زورِ طبیعت کے سوا راہ بر اور نہ فکر خود پسندا کے سوا ہم سفر۔

ابتدا میں تو ہم زادوں کے سوا کوئی رازدار نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ اغیار بھی اس سودا سے مطلع ہوئے اور گو کہ نوزادگی و خود سالی کے لحاظ سے اس کلام کو کسی پایے میں شمار نہ کرتے لیکن کبھی کبھی پیشانی کی شگفتگی اور سر کی جنبش سے معلوم ہوتا کہ غالباً یہ تازہ جنوں دلوں میں ناخن زن اور دلوں میں شورش ۲ افگن ہے۔ اس خیال سے یہ مالی خولیا پک گیا اور یہ تصور جم گیا۔ ہر چند خطوط کتاب سے تو سواد روشن کرتا، لیکن اس

صناعت میں ہمہ تن مصروف ہوکر روز و شب اس شغل سے فارغ نہ رہتا۔

اکثر احباب راست اندیش رہ بری فرماتے کہ فارسی غیروں کی دوکان کا سرمایہ اور بے گانوں کی تجارت کی ۳ متاع ہے اس کے کمال کو عمر طویل چاہیے اور بلبل نوایان گلشن ایران میں سے کوئی خوش نوا دلیل۔ زبان اردو اگر صاف و شستہ میسر آوے فارسی اس کے سامنے بے فروغ، اور دری اس کے آگے بے رواج ہو جاوے۔ اندازگوئی کی تکرار دل میں جائے گیر اور وہ نصیحت دل پزیر ہوئی

۱۔ نسخہ مطبع مرتضوی ۱۲۷۱ میں جو دپسند ہے۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور میں خود پسند ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ نسخہ طبع اول میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں 'سوزش' ہے۔

۳۔ 'کا' (نول کشوری اڈیشن)

ریختہ گویان ماضی و حال کا کلام فراہم کیا اور ارباب کمال کا سخن بہم پہنچایا۔ یہ ہوس گویا ایک آگ تھی کہ ہوائے طبع سے بھڑک اٹھی۔ پائے شوق رسا ہوا اور شاہد سعی نقاب کشا۔ ذوق صحیح کی اعانت اور مناسبت طبیعت کی مدد سے چند روز میں سخن نے ایک رنگ پیدا کیا اور کلام نے ایک آب و تاب بہم پہنچائی۔ فکر کا سر بلند ہوا اور طبیعت کا زور دوچند۔

لیکن یہ معاملہ بعینہ اس زور آور شناگر کے حال سے مشابہ تھا کہ ایک معرکہ کشتی گیران رستم تواں کے تماشے سے دو چار بند یاد کر لاوے اور دوسرا آب ورزان ماہر کی تقلید سے رفتہ رفتہ دست و پا مارنے میں مشق بہم پہنچاوے لیکن نہ وہ حریفان کار آموزدہ کے مقابلے کی تاب لا سکتا ہے اور نہ یہ لطمۂ امواج کے صدمے سے جاں بچا سکتا ہے۔ ناگاہ خود بخود خیال آیا کہ جب تک کوئی راہ بر نہ ہوگا منزل مقصود میں

پہنچنا محال ہے۔ انسان کی آنکھ اپنے غیب میں نابینا ہے کہ اپنا عیب ہر چند جلی ہو اس کی نظر میں ناپیدا ہے، خصوصاً عیوب شعر کہ اس کی قباحتیں قائل کی نگاہ میں ہم رنگ ہنر ہوتی ہیں اور اپنی تصنیف کی برائیاں سر بہ سر خوبیوں کے لباس میں جلوہ گر۔ اور یہ بات کیوں کر نہ ہو کہ شعر شاعر کا فرزند ہوتا ہے اور فرزند ناخلف ہی کیوں نہ ہو باپ کی نظر میں ارجمند ہوتا ہے۔ استغفر اللہ نسبت فرزندی و پدری کو اس معاملے سے کیا مناسبت اور راس کو اس سے کیا مشابہت کہ باپ کو فرزند سے علاقۂ جسمانی ہے اور شعر کو شاعر سے تعلق روحانی۔ بیٹے نے وجود پدر کے دریا سے ایک قطرے کے سوا کیا تحصیل کیا؟ اور شعر نے ہر فکر کے ساتھ شاعر کی روح کا مادہ تحلیل کیا ہے۔ کسی خوش مقال نے کیا خوب زمزمہ پیرائی عجب لطف کی نغمہ سرائی کی ہے:

ہر کہ سخن را بہ سخن ضم کند
قطرہ از خون جگر کم کند

اگر یہ خزف ریزہ جوہری سخن کی نگاہ میں لعل و گوہر سے بہتر نہ ہوتا اپنے سرمایۂ زندگی کو اس کے بیع وشرا میں کب کھوتا۔ جب یہ مقدمہ ذہن میں مستحکم ہو گیا، رہ نما کی تلاش ہوئی اور اس تلاش میں کیا کیا جان و دل کو خراش ہوئی۔ غیرت نے یہ سمجھایا کہ ایسے کی شاگردی کا حلقہ اپنے کان میں ڈالیے اور ایسے یگانۂ روزگار کی استادی کا نام زبان سے نکالیے کہ اس کی جامعیت میں کسی کو کلام نہ ہو اور طالب اس پیر طریقت کی بیعت کے بعد اوروں کی جستجو میں بدنام نہ ہو۔

بعضے سخن سنجان معنی رس کو تو اس طرح پایا کہ ہر چند دقایق فن سے آگاہ اور غوامض صناعت سے واقف تھے لیکن ان کی زبان قلم حرف نستعلیق سے چنداں آشنا نہ تھی اور بعض کو ایسا دیکھا کہ گو جودت فکر اور تیزیٔ طبیعت سے ان کے کلام کی خوبی دل میں ناخن زن اور سخن کی ملاحت زخم شوق پر نمک پاش تھی لیکن کم استعدادی سے معرکۂ نکتہ گیری اور ہنگامۂ دقیقہ سنجی میں دانش پیش گان کمال کی محتاج اور بجز

فصاحت الفاظ اور چرب وزنی زباں کے اور سرمایہ کچھ نہ رکھتے تھے۔ بیشتر مجالس سخن میں ان مدعیان تہی دست کا حال یہ دیکھا کہ جو کچھ رسائی طبیعت اور اعانت مشق سے بے تکلف زبان پر آ گیا اگر اسی گوہر بے بہا کو کسی کان دست گاہ دریا دل نے مغالطے کی راہ سے بے آب کہہ دیا یہ کم مایہ گو کہ اپنے عندیے میں اس کے لطف و نفاست سے بے اعتقاد نہ ہوئے، باوصف چرب زبانی اور گستاخ بیانی کے اس متاع نفیس کی آب و تاب کو جلوہ نہ دے سکے اور سچ یہ ہے کہ مایۂ علم طبیعت رسا کے واسطے پر و بال ہے اور صرف حسن طبیعت اور تیزیٔ فکر کی امداد سے عرش کمال پر ارتقا محال ہے۔ ایسے بے سرمایوں کی رونق و بہا انہیں بے مایگان کوتاہ دست کی محافل میں جلوہ نما ہوتی ہے کہ بے سرمایگی کو سرمایہ اور کم مایگی کو مایہ تصور کرتے ہیں۔ والا دانش مندان مآل اندیش جانتے ہیں کہ اتنی زبان درازی حریف غالب کے حملے کا جواب اور اس قدر سخن سازی زورمندان زبردست کے حربے کی سپر نہیں ہو سکتی۔

ہاں تا زپر نیفگنی از حملۂ فصیح
کورا جز ایں معاملۂ مستعار نیست

ان دونوں فریق سے طبیعت ناخوش ہوئی اور جستجو عنان کش۔ شوق کا بار بار یہ تقاضا تھا اور آرزو کا ہر نفس یہ اقتضا کہ جادۂ جستجو میں گامزن ہو اور راہ طلب میں عنان افگن۔ ملک الٰہی فراخ ہے اور پائے سعی گستاخ۔ آخر قائد توفیق راہ بر ہوا اور گوہر مراد میسر، کہ جناب مستطاب یگانۂ جہاں، خلاصۂ نوع انسان، حافظ

ا۔ نسخہ مطبوعہ ۱۲۹۹ نول کشور میں اس جگہ شعر لکھا ہوا ہے۔

عبد الرحمان خاں احسان علیہ الرحمۃ والغفران کی خدمت سراپا افادت میں راہ پیدا ہوئی اور منزل مقصود ہویدا۔

ازبس کہ طبیعت وحشی طینت اہل روزگار کا یہ حال دیکھنے سے بدگمان ہو رہی تھی، ابتدائے ملازمت میں اطمینان طلب ہوئی لیکن جس قدر دکان سوال وا ہوتی تھی، متاع جواب مہیا ہوتی تھی۔ طرز افادہ سے راہ شکوک مسدود ہو گئی اور وساوس خاطر کی شورانگیزی مفقود۔ ایک دو صحبت میں بنائے اعتقاد نے استحکام پایا اور سررشتۂ استفادہ نے انتظام۔ پھر تو شفقت باطنی جوش میں آئی اور سیل کرم خروش میں۔ دقائق سخن کیا کچھ معلوم ہوئے اور غوامض فن کس قدر مفہوم۔ ثمرۃ الفواد سخن سے خامی نکل گئی اور کجی راستی بدل گئی۔

مدت تک افادہ و استفادہ کا ہنگامہ گرم رہا۔ برکت تعلیم اور یمن التفات سے نکتہ گیران غیور اور کج خاطران پژوہ کو خوردہ گیری کی مجال نہ تھی اور اگر خبث اور حسد سے گاہ گاہ سلسلۂ اعتراض متحرک ہوتا تو زبان جواب لال نہ تھی۔ یاران ہم نشین کو بجائے ہم سری کے اعتقاد برتری کا دل نشین ہوا اور یاران ہم نفس کو دعوئ ہم پائی سے خیال پیش قدمی کا خاطر میں جا گزیں۔ اب تو یہ صورت بہم پہنچی کہ اس کم ترین کے اوقات بیش تر اصلاح تلامذہ میں مصروف ہونے لگے اور عنان توجہ اکثر انہیں اخلاص مادان پاک اعتقاد کی رہ نمائی کی طرف معطوف۔ اپنے دردسر کو حضرت استاد کی تخفیف تصدیع کا باعث جانا اور اپنی تکلیف کو جناب ممدوح کے آرام کا سبب پہچانا۔ جناب مستطاب نے بھی جب کم ترین تلامذہ کو اس خدمت گزاری میں مصروف پایا، التفات عام کو لطف خاص سے بدل فرمایا، دقائق و غوامض اوقات خاص میں تعلیم کیے اور شرائف ازمنہ اور نفائس آوان اسی عقیدت کیش کی تربیت میں تقسیم کیے۔ گاہ زبان ہندی و فارسی کی تصحیح میں سعی فرماتے اور گاہ صنائع سخن اور بدائع فن کی تفہیم میں متوجہ ہو جاتے۔ معانی و بیان سے بہ قدر استعداد آگاہ ہو گیا اور عروض و قافیہ میں حتی الوسع صاحب دست گاہ۔ مساعدت روزگار کا شکر کیوں کر ادا ہو سکتا ہے کہ ایک مدت تک نگاہ لطف میری ہی اصلاح میں ایک طرح سے مصروف

رہی اور زمام التفات میری ہی تربیت کی طرف معطوف۔ روز بہ روز بہارِ سخن تازگی پاتی تھی اور شہرت کمال بلند آوازگی۔

آخر الامر ''کل شیئ حالک'' کا مضمون واضح ہوا اور ''کل نفس ذایقۃ الموت'' کا مفہوم لائح، یعنی اس ذات ملکی صفات نے رخ مقدس کو آلائش جسمانی سے مصفا کیا اور عرش رحمت کے سائے میں خیمہ استراحت کو برپا۔ میرا حال اس مصیبت سے تباہ ہوگیا اور چشم جہاں بیں میں عالم روشن سیاہ۔ درد واندوہ کا شکیب سے چارہ کیا اور دل نازک کو سنگ خارہ۔ جو کہ یہ شوق ایک ناسور ہوتا ہے اور انسان عادت و جبلت میں مجبور، زبان اس گفتگو سے باز نہ آئی اور طبیعت نے اس تردد سے آسائش نہ پائی۔ زور استعداد اور فیض صحبت استاد سے اس سلسلے کو منقطع اور اس شغل کو مرتفع نہ کیا۔ دو برس تک یہ چراغ اپنی ہی آتش سے روشن رہا اور یہ دریا اپنے ہی جوش میں موج زن۔ تلامیذ حضرت مغفور جو کہ اس کم بضاعت کے حق میں حسن اعتقاد رکھتے تھے، اپنا کلام مجھ کو دکھاتے رہے اور اپنے سخن کو میری ہی نظر اصلاح میں لاتے رہے۔ مجھ کو یہ خیال ہوا کہ جب تک نقد ہنر استادان دقیقہ رس اور روشن ضمیران صبح نفس کی نظر کیمیا اثر سے نہ گزرے قابل اعتبار نہیں ہوتا، اور گوہر بے بہا جب تک جوہریان مبصر کی نگاہ میں پسند نہ آوے سرمایۂ افتخار نہیں ہوتا، اپنے کلبۂ تاریک میں بزم مشاعرہ آراستہ کی اور محفل مذاکرہ پیراستہ۔ نازک دماغان سخن فہم کو اس انجمن کی رونق افزائی کے واسطے مکلّف ہوا اور علمائے محقق اور تحاریر مدقق کو اپنی ژاژ خائی اور اپنے تلامذہ کی نغمہ پیرائی پر مطلع کیا۔

مقصد اصلی یہ تھا کہ شاگردان جناب مرحوم میں کم ترین شاگردان کا نام استادی کے ساتھ مشہور ہوگیا ہے، اور مشاہیر شعرا میں سخن وری اور نکتہ پروری کے ساتھ مذکور۔ ایسا نہ ہو پردۂ پندار کا چہرہ ادراک کی نقاب بن جاوے اور غفلت کی شامت اور نافہمی کی نحوست سے نقد ناسرہ رواج نہ پاوے، متاع کاسد کو اپنے گمان فاسد میں

جنس عالی جانے اور قماش نا مقبول کے عیوب کو نہ پہچانے۔ آخو گیران نکتہ چیں، دیدۂ عیب بیں کو باز کریں اور حرف گیران خباثت منش زبان سرزنش دراز، لیکن بزرگان بلند حوصلہ نے صلۂ تحسین سے شاد کیا اور عالی نگاہان انصاف مند نے حرف آفرین سے یاد۔ ان کی بلند حوصلگی سے قطع نظر خبث طینتان عیب پسند کو بیش تر خاموش پایا اور اس عرصے میں حرف طعن و تشنیع ان کی زبان پر نہ آیا۔ خواہ اس سبب سے کہ یہ کلام بے سرانجام غایت کم رتبگی سے نہ قابل خطاب تھا اور نہ لائق عتاب، اور خواہ اس وجہ سے کہ کریم نہادان صاف طینت کی برکت سے ان کے ضمیر انصاف پزیر میں بھی فی الجملہ راستی کو راہ ہوگئی تھی اور طبیعت چاشنی انصاف سے آگاہ۔

ہر چند اس مقدمے سے شاگردان صاف دل کو تو بہ نسبت سابق کے اعتقاد اس کم بضاعت کا دو بالا ہو گیا لیکن اس نافہم کو جو گمان کہ اپنے باب میں بے استعدادی اور ہیچ مدانی کا تھا، کم نہ ہوا، کہ رتبہ اس فن شریف کا عالی اور درجہ اس ہنر کا متعالی ہے۔ اس دشت ناپیدا کنار کی نہایت متصور نہیں اور کسی تیز رفتار کی نظر میں اس صحرائے بے منتہائی کی غایت جلوہ گر نہیں۔ اس دریائے مواج میں کسی قدر شناوری کی جاوے، ساحل ہاتھ نہ آوے۔ ناچار پھر رہنما کی تلاش میں ساعی ہوا اور خضر راہ کی طلب میں داعی۔ مشاہیر شاہ جہان آباد کو اپنی وضع پر آزمایا۔ استاد مرحوم کے فیض تربیت سے کسی کی نقد سرہ کو اپنے زر ناسرہ سے کامل عیار تر نہ پایا۔ سعی پاشکستہ ہوگئی اور ہمت دل خستہ، طبیعت کو افسردگی بہم پہنچی اور خاطر کو پژمردگی، بہ یک ناگاہ دعا کا اثر ظاہر ہوا اور اجمال اجابت باہر، سروش بخت نے رہبری کی اور شاہد مدعا نے جلوہ گری، یعنی خلوت ضمیر سے ندا آئی اور پردۂ دل سے صدا کہ اے گم کردہ راۂ تدبیر! کس طرف جلوریز ہے اور کون سی راہ میں سبک خیز؟؟

ترسم نہ رسی بہ کعبہ آئے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

راہ راست میں عناں گسل ہوا اور ان اطوار سے خجل۔ جناب مستطاب یکتائے جہان و یگانۂ دوران بانی بنائے سخن پیرائی مولوی امام بخش صہبائی کو کہ حیات استاد مرحوم میں اسی مالک ازمۂ کمال کی خدمت میں گاہ بے گاہ اصلاح اشعار فارسی کا اتفاق ہوا ہے، کس واسطے مآب مآرب کمال اور مرجع مقاصد فضل و افضال نہیں ٹھہراتا؟ اور اسی خضر راہبر کی جناب میں سر نیاز کیوں نہیں جھکاتا؟ کہ کمال کو یہیں سے سربلندی اور ہنر کو یہیں سے ارجمندی ہے۔ دقائق علوم اور غوامض فہوم کے عقدے جس طرح اس صاحب اقتدار کے ناخن فکر سے کھلتے ہیں کسی حلال مشکلات سے صورت نما نہیں ہیں۔ اس سخن کا گوش سے آشنا ہونا اور دیدۂ دل کا وا ہونا۔ سخن پردازی و غزل طرازی کے وقت اکثر شکایت چرخ اور گلۂ روزگار سے زبان آشنا ہوتی تھی، اب تو بار خجالت سے سر نہیں اٹھتا کہ کس طرح کی نعمت غیر مترقب سے کام جان کو لذت گیر اور حصول مقاصد سے کیا کیا منت پذیر کیا ہے۔

زبان فارسی میں تو بلبل نوایان اصفہان کو ابھی لیاقت سخن فہمی کی حاصل نہیں۔ ریختہ میں شستگی بیان اور پاکیزگی زبان اور بلندیٔ معنی اور متانت الفاظ ایسے مشاہدہ ہوئے کہ تلف اوقات سابق پر افسوس ہوا اور تضیع عمر گزشتہ پر تاسف۔ مساعدت روزگار کو مغتنم جان کر ریختہ اور فارسی دونوں کی اصلاح اسی ایک جامع کمالات کی خدمت سے لیتا ہے اور جواہر معنی کو اسی آفتاب ضمیر کے استفادے سے آب و تاب دیتا ہے، حتا کہ جب سے اسی آستانے سے مستفید ہوا ہوں، استعداد کو ترقی اور طبیعت کو قوت روز افزوں ہے۔ پہلے سخن بلندی کے آسمان پر تھا، اب عرش سے برتر ہے۔ اول کلام تازگی سے گلزار تھا، اب روضۂ خلد سے ہمسر ہے۔ سبحان اللہ! کیا طرز اصلاح ہے، شعر بے معنی ایک لفظ کی تبدیلی سے معنی غریب پیدا کرتا ہے اور مضمون بیت کا اندک تقدیم و تاخیر عبارت سے اور ہی لطف ہویدا کرتا ہے۔ جب کسی لفظ کی جگہ اور لفظ رکھ دیا، عقل دشوار پسند نے انصاف کیا کہ فی الواقع اسی

لفظ کی جائے خالی تھی اور جب کسی معنی میں تصرف فرمایا، فکر بلند نے اعتراف کیا کہ حقیقت میں حشمت کلام کو اسی منصب عالی کی تلاش میں زار نالی تھی۔

اے صابر سخن طراز! سامعان نازک مزاج کی گوش خراشی سے باز آ اور مناسب وقت سخن سرائی کر اور سر رشتہ اختصار کو ہاتھ سے نہ دے کہ طول کلام باعث سرگرانی ہے اور اطناب سخن مایۂ چین پیشانی۔ ارباب شوق اور اصحاب ذوق پر واضح کرتا ہے کہ اثنائے مشق میں ریختہ گویان پیشیں کا کلام کچھ جزو ودان حافظہ میں فراہم ہوتا جاتا تھا اور کچھ گنجینۂ بیاض میں انتظام پاتا تھا کہ قدما کا افادہ سرمایۂ استعداد ہوتا ہے اور رہی دستان سخن کے واسطے گوہر مراد۔ ارتقائے معنی بہ دون اس سلم کے محال ہے اور جلائے الفاظ بغیر اس صیقل کے وہم وخیال۔ ہر چند اردو اپنی زبان ہے لیکن جب تک قادر کاملان بلند خیال کا سخن پیش نظر نہ ہو، نہ تراکیب و متانت حاصل اور نہ اسلوب کو رشاقت۔ اس عرصے میں سخن سنجان عصر کا کلام بھی جو کہ طبیعت کو پسند آتا گیا اور جس قدر دل کو بھاتا گیا، اجزائے علیحدہ میں مخزون اور بیاض جداگانہ میں مشحون ہوتا رہا۔

ایک مدت کے بعد جو مجموع پر نظر کی تو دفتر دفتر سرمایہ فراہم ہو گیا تھا اور بے کراں خزانہ مجتمع۔ گاہ گاہ اپنے خیال میں گزرتا تھا اور کبھی کبھی کوئی دوست بھی تحریک کرتا تھا کہ اس نقد دسرہ سے اغماض اور اس زر خالص سے تغافل خوب نہیں۔ ایک ذخیرہ بہ طریق کچکول کے جمع کر لیا جاوے اور ہر مقام میں نام قائل کا بطور عنوان کے ترقیم کیا جاوے کہ شوق سرشتان معنی شناس کے واسطے سیر گاہ غریب اور ارباب ذوق کے لیے نزہت گاہ عجیب بہم پہنچے گی، لیکن ہجوم موانع اور کثرت مشاغل سے یہ آرزو حاصل نہ ہوتی تھی۔ حسن اتفاق سے قرۃ العین ارجمندی، جگر گوشۂ دل پسندی، لخت دل، پارۂ جگر، سرور سینہ، نور بصر، مایۂ نشاط، باعث انبساط، راحت جان، آرام جان، فرزند سعادت مند، محمد عمر سلطان طال عمرہ وزاد قدرہ کو شعر کا شوق دامن گیر

ہوا۔ سخن آفریں نے اس نور چشم کو اس خورد سالی میں کہ سنین عمر ہنوز تیرہ چودہ سے متجاوز نہیں ہوئے، ایسا ذہن رسا اور فہم کامل دیا ہے، باوجودیکہ نکات سخن اور قواعد فن سے اب تک آگاہ نہیں، محض موزونی ذاتی اور مناسبت طبعی سے ہر زمین میں شعر بدیہہ موزوں کرتا ہے اور اس کی طبیعت خداداد موافق استعداد کے تلاش مضمون اور معنی یابی سے معرا نہیں۔ یگانہ کملائے جہان آباد حضرت استاد مدظلہ العالی کی نظر تربیت سے امید قوی ہے کہ یہ نونہال گلشن سعادت رفتہ رفتہ میوۂ کمال سے بارآور اور اثمار ہنر سے مثمر ہو جاوے۔ یہ نوبادۂ باغ تمنا اشعار رنگین اور ابیات متین کی جستجو کرتا تھا اور ہر ایک سے اس گنج بادآوردکی آرزو۔

میری خاطر کو گوارا نہ ہوا کہ خوان نعمت مہیا اور مہمان عزیز اغیار سے سرگرم التجا۔ اس کی تربیت اب پیش نہاد ہوئی اور بیاض چشم و سواد مردمک صرف کاغذ و مداد۔ لیکن مستشار موتمن یعنی خرد کامل فن نے دفتر انداز وا کیا اور ساز پند و نصیحت مہیا کہ اس سعی کا اتلاف عمر کے سوا کیا ثمر ہے؟ اور اس کوشش کا تضیع اوقات کے سوا کیا بار و بر، یعنی اس تدوین میں سوائے نقل محض کے سود کس تجارت کا ہے اور اس تالیف میں بہ جز حکایت صرف کے حصول کس منفعت کا؟ ایک کتاب فراہم کر کہ شعرائے معنی آفرین کا تذکرہ ہو اور ایک کارنامہ مرتب کر کہ تماشائیان عبرت بیں کے واسطے تبصرہ ہو۔ ہر چند اس وضع کی تحریر میں بھی اشعار بیگانہ سے گریز نہیں لیکن جو کہ راقم کی عبارت ملک خالص ہے، نقل محض باقی نہ رہی، اور تالیف و تصنیف سے ایک معجون غریب مرکب ہو گئی۔ طوطی ہندوستان، خسرو شیریں زبان نے کیا دل کش نغمہ سرائی کی ہے:

باری آں نیک نہ باشد کہ بگویند فلانے

زیور عاریہ دارد کہ دراں ملک نہ دارد

اوروں کے سرمائے پر ناز کرنا اور غیروں کے زور پر لاف زن ہونا اہل ہمت کا عار ہے، اور قوی دستان غیور کے نزدیک سبک اور خوار۔ حاتم کے صلائے عام کی

حکایت سے قصہ خواں کو کیا نفع؟ اور رستم کے سر پنجے کی کہانی سے افسانہ گو کو کیا شرف؟ فرزند اگر تتہ کہ پدری پر تکیہ کرے، ننگ خاندان ہے اور برادر اگر فضیلت برادر پر افتخار کرے، ارزل دودمان ہے۔ ظرفا نے ایسے پسر ناخلف کی شان میں ایک مثل کہی ہے اور خوب کہی ہے کہ ہر شام کو ایک شغال بہ آواز بلند کہتا ہے کہ ''پدرم سلطان بود'' سب شغال سرزنش کرتے ہیں کہ ''تراچہ؟''۔ کتب اخلاق میں مسطور ہے کہ اگر کسی نسب فروش کا باپ حاضر ہو کر کہے کہ جس شرف پر تجھ کو ناز ہے، وہ میرا کمال ہے، نہ تجھ بدخصال کا تو یہ بے مایہ ناچار صامت ہو جائے گا اور جواب سے ساکت۔

اس مصلحت کو سرمایۂ راہ کر اور نامۂ کاغذ کو سیاہ، لیکن پیشینیوں کے حال سے تعرض نہ کر اور اس طومار طویل الذیل سے درگزرا کہ حسن خداداد مشاطہ کا محتاج نہیں اور نمائش آفتاب میں آئینے کی احتیاج نہیں۔ کیا جوش و خروش سودا اور طمطراق میر اور نالۂ درد کا ایسا حال ہے کہ اگر تیری سخن سنجی کی بہار تحریک نہ کرے تو اس میں نقصان آ جاوے، اور دوسرے یہ کہ اکثر کتابیں ان کے احوال سے مالا مال ہیں کہ عالم ان کے مطالعے سے مستفید اور ان کے سیر دل ہائے بستہ کی کلید ہے۔ ان بلند ناموں کے اوصاف کا اس روزگار میں درج تذکرہ کرنا تکرار میں محسوب ہے اور نازک مزاجوں کو تکرار نامرغوب ہے۔ اس تکرار لاطایل سے پرہیز کر اور نقل کے اعادے سے گریز کر۔ معاصرین کا حال کیا کم ہے، اگر لکھا جاوے اور ان

۱۔ نول کشوری نسخے میں یہ لفظ نہیں ہے۔

تازہ خیالوں کا کلام کس قدر دل چسپ ہے، اگر پڑھنے میں آوے۔ ہر چند یہ نصیحت دل پذیر اور رہوس دامن گیر ہوئی لیکن اسی وقت حضرت استادی استاد الانامی، مسند

نشین دارالامارت یکتائی، جناب افادت مآب مولوی امام بخش صہبائی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوا اور پیش نہاد کو عرض کیا اور مکرر معروض ہوا کہ سرانجام اس امر دشوار کا کم استعداد سے معلوم، اگر کم ترین تلامذہ کی تحریر خلعت اصلاح سے مشرف ہو جایا کرے تو یہ مشکل آسان اور یہ رشتہ سر درگم نمایاں ہو جاوے۔ بارے عرض نیاز شعار کی زیور قبول سے آراستہ ہوئی اور حلیۂ اجابت سے پیراستہ۔

میں نے جب یہ لطف اپنا معین اور اکرام ممد دیکھا، کمر ہمت کو چست کیا اور رعزم رسا کو درست اور سال ایک ہزار دو سو ستر ہجرت مقدسہ ماصدق لولاک، علت غائی ایجاد افلاک، رسول الثقلین، سرور خافقین، سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماہ شعبان کی پہلی تاریخ تھی کہ قلم چابک رقم کو اس کام پر مہیا کیا، اور خامۂ گرم رفتار کو اس راہ میں تیز پا۔ شفقت استاد پر نازاں ہوں کہ ہر چند رفتار قلم سعی فکر سے شتاب رو تر تھی اور شب و روز کی محنت اور شام و سحر کی کوشش سے جزو کے جزو فراہم ہو کر اس شاگرد نواز کی نگاہ حاطفت کے کمال تدقیق نظر اور تعمق فکر کے ساتھ گزرتے تھے لیکن اس تحمل مشقت پر جبین میں چین اور ابرو میں شکنج کا نام نہ تھا، اور اب تک جمازۂ قلم کی سیر لا ینقطع ہے۔ عالم الغیب آگاہ ہے کہ اس دشت ناپیدا کنار کی نہایت کب نظر آوے اور اس بحر زخار کا ساحل کب پایا جاوے۔ شفقت شاگرد پروری سے امید ہے کہ اس شاہد دل ربا کا قامت حلیۂ اصلاح سے ایسا آراستہ ہو کہ نازک نہالان چمن حسن اس کی غیرت سے برگ خزان سے پژمردہ تر ہو جاویں، اور شمع رویان بزم جمال اس کے رشک سے نقاب خجالت میں منہ چھپاویں۔

انجمن آرایان کمال پر واضح ہو کہ اس تالیف غریب اور تدوین دل فریب میں ایسا التزام کیا ہے کہ خطۂ مینو بنیاد شاہ جہان آباد صانہا اللہ عن الشر والفساد میں جس قدر سخن سنجان رنگیں بیان اور موزوں طبعان شیریں زبان ہیں، کملائے صاحب سداد سے لے کر نو مشقان کم استعداد تک بالاستیعاب کہنا تو مبالغۂ شاعرانہ سے خالی

نہیں، جہاں تک رفتار تلاش در ماندہ نہ ہووے ان کی ذکر اس کتاب میں مندرج اور ان کا کلام ان اوراق میں مندمج ہو اور معنی شناسان دور دست میں سے مشاہیر کامل ہنر مثل آتش و ناسخ اور بعضے اور خوش فکران بلند خیال خواانہیں دونوں سخن گویان بے عدیل سے استفادہ کیا ہو، خواہ کسی اور بے گانہ فن سے ساز و برگ کمال کو آمادہ کیا ہو، ان سے تو یہ گنجینۂ دانش بالضرور مملو ہو۔ لیکن طبع آزمایان غیر مشہور اگر کسی تقریب سے انجمن اطلاع میں راہ کریں تو جواد قلم ان کی مہمانی میں مضایقہ نہ کرے اور شعرا کے تراجم میں تخلص کو عنوان قرار دے کر حرف اول کو باب مقرر کیا، اور نظارگیان کتاب کی آسانی کے واسطے دوسرے حروف میں بھی حروف تہجی کی نظم طبیعی کے موافق رعایت منظور رکھی تاکہ عدم انتظام سے اصحاب شوق کی طبیعت مشوش اور پریشان، اور ارباب ذوق کی خاطر متردد اور حیران نہ ہو جاوے، اور اشعار ہر شاعر کے اگر متعدد اور کئی ردیف سے بہم پہنچیں، تو ان کی تقدیم و تاخیر ان ہی ردیفوں کی رعایت سے عمل میں آوے، تاکہ اس درہمی برہمی سے حسن ترتیب خلل نہ پاوے۔ اس شاہد دل ربا اور اس عروس رعنا کا نام ''آثار المعاصرین'' رکھا تھا کہ اس تالیف کی غایت نام ہی سے معلوم اور اسم ہی سے مفہوم ہو جاوے، لیکن یگانۂ آفاق، زبدۂ اصحاب وفاق محمد نظام الدین جوش تخلص سلمہ اللہ تعالی نے 'گلستان سخن'، نام تاریخی اس کا تجویز کیا اور نامۂ اتحاد مضمون کے وساطت سے شہر لطافت بہر کول سے لکھ بھیجا۔ ہر چند یہ تصنیف بارہ سو ستر ۱۲۷۰ھ میں شروع ہوئی ہے، اور اس نام سے بارہ سو اکہتر چہرہ کشا ہیں، لیکن جو اختتام اس کتاب کا سال آئندہ سے پہلے ممکن نہیں معلوم ہوتا اس واسطے یہی نام مقرر کیا اور ''شروع کتاب گرامی'' ۱۲۷۰ھ آغاز کتاب کی تاریخ ہاتھ آئی۔ موافق اعمال تماشائیان دشوار پسند کو توفیق عطا کرے کہ جب اس گلزار شاداب کی تفرج میں مشغول ہوں، لطف ازہار و ریاحین سے چمن آرا کے حق میں حرف تحسین زبان پر لاویں اور اگر احیاناً کوئی خار نظر میں کھٹکے، چشم پوشی و

اغماض کو کار فرماویں۔

بہ پوش اگر بہ خطائے رسی و طعنہ مزن

کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نہ بود

بلبل نوایان مشکیں نفس کہ شعلۂ آواز سے جان افسردہ

ا۔نول کشوری نسخے میں 'انہیں' ہے۔

کو دانہ سپند کر دیں اور شیرینی سخن سے تلخی عمر کو شکر و قند۔ اگر اس گلشن سیراب کو نظر التفات سے تماشا، اور اس بحر طولانی میں فکر رسا کی دستیاری سے شنا فرماویں گے تو دریافت کریں گے کہ ہر گوشے میں نسیم الطاف الٰہی سے کس قدر گل ہائے شگفتہ مہیا ہیں اور ہر ساحل پر ابر عنایت ازلی سے کیا کیا گوہر ناسفتہ جلوہ نما۔ شوخی معنی معشوقان شنگول کے انداز سے دلرباتر اور تازگی عبارت محبوبان گل رخسار کے چہرے سے مطرا تر۔ مردوں کو اس سے عمر دوبارہ حاصل اور زندوں کو زندگی جاوید کا نقد واصل، گم ناموں کو ناموری اور پست مرتبوں کو برتری، بے کاروں کے واسطے مشغلہ ہے اور تاریک رویوں کے لیے مشغلہ۔ تہی دستوں کے حق میں گنج بادآورد ہے اور علیل مزاجوں کو چارۂ درد۔ طرفہ بزم ہے کہ آشنا و بیگانہ تک اس میں فراہم ہیں اور غریب ہنگامہ ہے کہ دوست و دشمن تک اس میں بہم ہیں۔ ارباب اس بزم کے گویا اور خموش اور حاضرین اس ہنگامے کے ساکت اور پر خروش۔ عجب سحر پرداز ہے کہ غایبوں کو مد نظر کر دیتا ہے اور طرفہ معجز طراز ہے کہ دوروں کو نزدیک تر کر دیتا ہے۔ بیاض اوراق کی آئینہ گیتی نما ہے اور سواد سطور کی دیدۂ بصیرت کا توتیا۔ سکندر نے تاریکی میں ہزار تگاپو پر رہبری خضر سے چشمہ حیوان نہ پایا، اور اس سواد میں ہر کاہل کوش نے میرے قلم کی سعی سے حیات ابدی کا سرمایہ بہم پہنچایا۔

اے خامۂ ہرزہ سرا اس قدر زبان درازی خوب نہیں اور طبائع نازک کو اتنا لاف وگزاف مرغوب نہیں۔ سخن کوتاہ کر اور اظہار مطلب سے کاغذ کو سیاہ۔ احباب متقاضی ہیں کہ اس دیباچے کے ذیل میں اول تحقیق زبان اردو اور وجوہ استعمال الفاظ فصیح اور ترک کلمات غیر فصیح مرقوم کی جاوے کہ ریختہ گویان تحقیق طلب کو نقد بصیرت ہاتھ آوے، اور بعد اس کے حد شعر اور تحقیق موجد اشعار اور بعض فواید عروض وقافیہ اور تعریف اقسام نظم بھی مسطور ہو کہ مبتدیان فن کو سبب استفادہ اور منتہیان سخن کو سامان ازدیار تحقیق آمادہ ہو۔ جو کہ باوجود کم استعدادی کے مجال سرتابی نہیں رکھتا، حتی الامکان ہمہ تن مصروف ہوتا ہوں کہ گرسنہ چشمان نعمت تحقیق کے واسطے اگر خوان الوان مہیا نہ کر سکوں گا، بارے نان جویں کے احضار میں تو مضایقہ نہ ہو گا۔ ناچار اس مقدمے کا نام تبصرہ رکھتا ہوں اور اس کو ایک مقدمے میں تین مقصد میں منقسم کرتا ہوں:

مقدمہ:

زبان کے معانی اور اس امر کی تحقیق میں کہ آغاز آفرینش میں زبان ایک تھی یا متعدد، اور اگر ایک تھی تو اول کون سی زبان موجود ہوئی؟ اور پھر کس طرح سے مختلف زبانیں بہم پہنچیں۔

مقصد پہلا۔

زبان اردو کی تحقیق اور وجوہ استعمال الفاظ فصیح اور ترک کلمات غیر فصیح۔

مقصد دوسرا۔

حد شعر اور موجد اشعار، اور عروض وقافیہ کے بعض فواید کا ذکر بہ طریق اجمال۔

مقصد تیسرا۔

ذکر اقسام نظم اور ہر ایک کی تعریف۔ التوفیق من الموفق المنعام و ہو میسر المقصد

والمرام۔

ا۔نول کشوری نسخے میں 'دتھی' ہے۔

مقدمہ

زبان کے معنی اوراس امر کی تحقیق میں کہ آغاز آفرینش میں زبان ایک تھی یامتعدد؟اوراگرایک تھی تو اول کون سی زبان موجود ہوئی ؟اورپھر کس طرح سے مختلف زبانیں بہم پہنچیں؟

جو کہ اس مقام کے تحقیق کے واسطے بھی تمہید مقدمہ سے ناگزیر ہے، خامۂ خام رقم جواہر آب دار معانی گنجینۂ طبع سے طبق عرض پر رکھتا ہے، اور ارباب دانش والا اور اصحاب دیدۂ بینا پر واضح کرتا ہے کہ اقتضائے حکمت کاملہ بانیٔ بنائے ایجاد اور حاکم محاکم کون وفساد نے چاہا کہ جلوہ گاہ افراط وتفریط یعنی ظہور حیوان ونبات وجماد میں ایک نتیجہ معتدل پیدا کرے، تا نہ افراط کی نحوست سے نظم عالم خراب ومہمل رہے، اور نہ تفریط کی شامت سے پیش رفت امور معطل۔لعبت قدسی طینت اور پیکر نورانی صورت کوتاج خلافت وتشریف علم سے آراستہ کرکے پردۂ مشیت سے جلوہ گر کیا، اورسریر صندل کو خاک پر متمکن فرماکر سر رشتۂ قبض وبسط امورکواس کے دست تصرف میں دیا۔علم ازلی کی پیش بینی سے اس جوہر قدسی کو آب ورنگ، ادراک کلی وجزئی سے رونق بہاعطافرماکرایسا آئینۂ مجلی اورمرأت مصفا بنایا کہ پردۂ ارزنگ نگار عقول سے تماثیل رنگارنگ علوم اس جلوہ گاہ غریب میں عکس افگن ہو۔اورتغیر وتعمیر امور میں ایسی جزوری مرحمت کی کہ تمکین نشست اورجرأت قیام ہرمقام میں انہیں احکام کے موافق درست نشین اورگام زن۔اس فروغ کوعقل نظری کے نام سے پہچانتے ہیں

اور اس دریافت کو عقل عملی جانتے ہیں۔ جاب نفع کے واسطے آ زو حرص دی اور دفع مضرت کے لیے قوت غضب عطا کی، یعنی یہ متحمل بار امانت اور متمکن سریر خلافت اگر نہ امور کلیہ سے آگاہ اور نہ مہمات جزئیہ سے صاحب انتباہ ہوا ختلال تدبیر سے انتظام مختل ہو جاوے اور بست و کشاد مہمل اور اگر مرغوب کی طلب جلوہ نمایا منافر سے نفرت نقاب کشانہ ہو، مادہ حیات انقطاع پاوے اور اسباب حشمت برہم ہو جاوے۔

ان سب صورتوں میں اظہار مافی الضمیر ضرور ہے اور اعلان مرغوبات میں مجبور، کس واسطے کہ خفیات باطن پر سوائے علام الغیوب کی پے نہیں لے جا سکتا اور خبایائے ضمائر سے بہ جز جان آفرین کے کوئی آگاہی نہیں پا سکتا۔ پس مصلحت سنج امور نے ہوائے انفاس کو فضائے سینہ میں جنبش دی اور راہ گلو سے قوت آمد و شد عطا کی۔ لیکن اس راہ ہموار کو فی الجملہ پیچ وخم سے خالی نہ رکھا کہ وہ ہوا ان مخارج میں کسوت حروف سے تقطیع حاصل کرے اور حسن سخن کو کامل، تا کہ امر و نہی کا اظہار بے تکلف ہو اور ملائم کی طلب اور نا ملائم کی امتناع کا اعلان بے تصلف اور ہوش مندان آگاہ دل جانتے ہیں کہ جب تک حروف کی ماہیت اور اس کی ایجاد و ابداع کی کیفیت صفحۂ بیان میں جلوہ گر نہ ہو، طالبان کمال کو صورت اطمینان اور تسلی قلب و جنان متصور نہ ہو۔

ناچار اس سیاہ قلم کو رنگ آمیز کرتا ہے اور اس مشغلہ سراپا فروغ کو نور ریز کہ حرف ایک کیفیت کا نام ہے، وابستہ ہے ایک اور کیفیت سے اور یہ کیفیت ہوا کے ساتھ قائم ہے کہ ایک عنصر ہے عناصر چہار گانہ میں سے۔ جب دو سخت چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کریں اور اس حالت کو عربی میں قلع کہتے ہیں یا ایک دوسرے پر ماریں اور اس حالت کو قرع کہتے ہیں تو بالضرور اس دونوں کے درمیان جو ہوا ہے، پانی کی طرح متموج ہو جاوے گی اور اس تموج سے آواز پیدا ہوگی۔ بعضوں نے

آواز کی تعریف سبب قریب سے کی ہے اور بیان کیا ہے کہ آواز ہوائے متموج کا نام ہے اور بعضوں نے سبب بعید سے اور قلع یا قرع ہی کو آواز کہا ہے یعنی اول قلع یا قرع واقع ہوتا ہے اور پھر ہوئے درمیانی میں تموج بہم پہنچتا ہے اور تموج سے آواز۔ پس قلع و قرع آواز کے واسطے سبب بعید اور تموج ہوا سبب قریب ہے کہ اس میں اور آواز میں واسطہ نہیں۔ بہ خلاف قلع اور قرع کے کہ تموج کا واسطہ متحقق ہے۔ جب آواز کی ماہیت دریافت ہوئی، اب سنا چاہیے کہ مطلق آواز کو اور کیفیتیں عارض ہوتی ہیں کہ ایک کو دوسری سے ممتاز کردیتی ہیں۔ جیسے زیرو بم اور رغنہ یا گرانی گلو سے بہم پہنچنا اور ایک اور کیفیت خاص بہ واسطہ مکارج کے اجزا ہوا کے تقطیع سے آواز کو عارض ہوتی ہے، جیسے دو زیر یا دو بم یا دو غنہ یا دو آواز کا گلوے گراں سے حاصل ہونا، اس کیفیت خاص کا نام حرف ہے۔

اس بحث کے بعد توضیح مقام کے واسطے کہا جاتا ہے کہ اول ہوا کو بہ سبب تموج کے ایک کیفیت عارض ہوتی ہے جس کو آواز کہتے ہیں اور آواز سے ایک اور کیفیت متعلق ہے، مثلاً دو زیر اور دو بم وغیرہ، اور اس کیفیت کو حرف کہتے ہیں۔ پس حرف کہ کیفیت خاص ہے، صوت کے ساتھ وابستہ ہے اور صوت قایم ہے ہوا کے ساتھ۔ جب یہ تفصیل معلوم ہوئی، حرف کی تعریف کے معنی واضح ہو گئے۔ بوعلی سینا اسی کیفیت خاص کو جو صوت کو عارض ہوتی ہے، حرف کہتا ہے، اور بعضے اس صوت ہی کو حرف کہتے ہیں، اور بعض محققین مجموع صوت و کیفیت کو حرف ٹھہراتے ہیں، نہ ایک کو۔ حرف کی ماہیت کا بیان تو یہ ہے جو زبان قلم اس سے نغمہ پیرا ہوئی۔

اب معلوم کیا چاہیے کہ زبان اکثر طوائف کے عدد حروف میں باہم مخالف ہے، یعنی کسی میں اٹھائیس حرف ہیں اور کسی میں چوبیس اور کسی میں کم یا بیش۔ جو کہ طوائف بنی آدم اور اصناف اشرف مخلوقات عالم نہ اس کثرت سے ہیں کہ ان کے بعض کا شمار حیطۂ وہم و خیال میں گنجائش پذیر ہو سکے اور سوا اس کے بعض ایسے ہیں کہ

ان کی زبان کی تحقیق سے اس کتاب کے ناظرین کے حق میں فائدہ معتد بہا متصور نہیں ہے۔ ناگزیر زبان عربی وفارسی و ہندی کے حروف کا حال بر سبیل اجمال مذکور ہوتا ہے کہ اکثروں کو ان دو زبانوں پر نظر اور روشن سوادی میسر ہے اور زبان ہندی تو گویا بہ منزلہ موضوع کتاب ہی کے متصور ہے۔

زبان دانان عرب بنائے کلام کو اٹھائیس حرف پر رکھتے ہیں۔ اگر ھمزہ کو الف سے ممتاز نہ کریں والا انتیس پر۔ اور شیریں کلامان فارس چوبیس اور کج مج زبانان ہند تیئیس پر۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فارسی میں آٹھ حرف یعنی ثاء مثلثہ اور حاو صاد و طاو عین مہملات اور ضاد و ظا معجمتیں اور قاف مستعمل نہیں ہیں۔ اور بے اور جیم اور زائے اور کاف تازی میں ایک صفت گرانی کی اور زیادہ کر کے چار حرف اور یعنی پے اور چے اور ژے اور گاف اختراع کیے۔ جب آٹھ کے حذف کے بعد حروف باقی پر چار زیادہ کیے جاویں، چوبیس صورت پزیر ہوں گے۔ اس صورت میں آٹھ مخصوص عربی اور چار مخصوص فارسی اور بیس مشترک مقرر ہوئے اور لام الف جو الف اجو حرف مشہور ہے، اس کے باب میں اقوال مختلف ہیں۔ بعضے یہ کہتے ہیں کہ شمار حروف میں ہمزہ اول اور الف ہائے ہوز کے بعد واقع ہے اور جو کہ الف دائم السکون ہے، اور جب تک کسی اور سے مرکب نہ ہو ساکن کا تلفظ محال ہے، ناگزیر لام سے ترکیب دے کر 'لا' پڑھا، اور لام کی خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ لام اور الف میں اتحاد قلبی ہے، یعنی الف کا دل لام ہے اور لام کا دل الف، جو کہ یہ اتحاد اور کے ساتھ نہ تھا، لام کو اس کی ہم راہی کے ساتھ مختص کیا۔ اور بعضے یہ لکھتے ہیں کہ زبان فارسی میں ہمزہ کا وجود نہیں۔ قدما نے چاہا کہ اس نکتے پر اشعار کریں، پس حروف تہجی میں ھمزہ پر 'لا' لکھ دیا۔ عوام ازبس کہ نشۂ غفلت سے نہ اس ترکیب سے واقف تھے، نہ اس نکتہ سے آگاہ، ایک حرف علیحدہ سمجھ کو لام الف کہنے لگے اور یہی مشہور ہو گیا۔

اور ان دونوں قولوں میں تامل ہے، اول میں اس وجہ

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور میں ''الف جو'' نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ طبع اول میں یہ زاید کتابت ہو گیا ہے۔

سے کہ شمار کے وقت اسما ءحروف زبان پر آتے ہیں، نہ مسمے تا کہ تلفظ الف کا بہ سبب سکون کے دشوار ہو۔ اور دوسرے میں اس صورت سے کہ فارسی میں وجود ھمزہ کا نہ ہونا تحکم ہے کہ اسماے حروف عرب سے ماخوذ ہیں۔ اور محققان تازی خط ساکن مستقیم کو کہ بے ضغطہ ہو، الف کہتے ہیں اور متحرک یا اس ساکن کو جر ضغطے سے پڑھا جاوے ھمزہ نام رکھتے ہیں۔ اور فارسی میں ساکن بے ضغطہ اور متحرک بعینہٖ موجود ہیں۔ اول جیسے 'کاروبار' اور 'ماوشما' اور دوسرا جیسے 'اگر' اور 'ابر'۔ غایت یہ ہے کہ ساکن ضغطہ دار اس زبان میں نہیں ہے۔ پس اس تعریف کے موافق ایک کو الف اور دوسرے کو ہمزہ کہنا مناسب ہوا۔ اور کتب قواعد فارسی کے قدما فارس نے رصنیف کیے ہوں قطعاً نایافت ہیں۔ تا کہ ان کے قواعد مقررہ کا حال معلوم اور اصطلاحات کی حقیقت مفہوم ہو۔ اور علاوہ اس کے ہر گاہ آٹھ حرف اور بھی فارسی میں نہیں ہیں، اشعار کی تخصیص اسی ایک کے ساتھ بے وجہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ دانش پژوہان والا فطرت نے بعد وضع مفردات کے چاہا کہ مبتدیان کم سواد کو فی الجملہ کیفیت ترکیب سے آگاہ کریں، ان دو حرفوں کو مرکب کیا اور اس خیال سے کہ اگر جمیع مفردات کے آخیر میں رکھا جاوے، شاید نظر ناظر کی اس سے غافل اور لحاظ لاحظ کا، زائل ہو جاوے۔ کیف ما اتفق اثناے حروف میں رکھ دیا اور اختصاص لام کی وہی وجہ ہے کہ مرقوم ہو چکی۔

فایدہ:

حروف مفردہ کے واسطے واضع نے ایسے اسماء وضع کیے ہیں کہ وہی حرف ان

اسماء کا جزو اول واقع ہوتا ہے، بر خلاف الف کے کہ وہ ساکن ہے اور اگر آغاز اسم اس سے ہوتو ابتدا ساکن سے لازم آوے، ناگزیر اس اسم کو ہمزے کے ساتھ شروع کیا اور یہاں سے لازم آتا ہے کہ ھمزہ ہائے ہوز سے اغلاط مشہورہ سے ہے اور اصل اس کی بھی ہمزہ ہوگی، تاکہ اس کا نام بھی اس کے مسمی سے آغاز کیا جاوے۔

لطیفہ:

ہر گاہ الف نے باوجود اس بے حرکتی اور دور دست واقع ہونے کے ہمزے پر یہ تطاول کیا، تو یہ اس قوت حرکت پر اپنے آپ کو درازدستی سے معاف نہ رکھ سکا، لیکن جو کہ الف کو اکثر حروف نے پائمال تعدی کر کے اپنے آستانے کا ملازم کر لیا تھا، ھمزہ اس کے تاراج سے مایوس ہوئی اور حق ہمسائگی فراموش کر کے ہائے بے چارہ پر دست غارت دراز کیا۔

اس ضیافت طبع کے بعد حقیقت شناسان معنی کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ بعضے بائے تازی اور جیم تازی اور ذال معجمہ اور فا اور غین معجمہ اور کاف تازی کو بھی زبان فارسی میں نہیں شمار کرتے، لیکن یہ حکم سوائے دال اور غین معجمتین کے اور حرفوں میں نہایت سخافت سے قابل التفات نہیں، اس واسطے کہ حروف اربعہ زبان ژند و پاژند میں موجود ہیں۔ اور جو کہ یہ زبان تغیر سے مضمون ہے، قلب کا احتمال بھی مرتفع ہے۔ بائے موحدہ جیسے بسر یا کبریا کے وزن پر، گوشت حیوانات بسیا سین مہملہ ساکن اور یائے تحتانی الف کے ساتھ شراب انگوری، بسیم نسیم کے وزن پر لذیذ اور خوش مزہ، بیل نیل کے وزن پر چاہ، بیتا سیما کے زون پر خانہ، کدبا کاف مفتوح اور دال مہملہ ساکن سے دروغ، اور جیم جیسے جیپا یائے معروف اور بائے فارسی سے ھیزم،

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''ہوا'' ہے۔

جاتن نون سے پہلے تائے فوقانی خدا جاتو تن تائے فوقانی اور واو معروف اور تائے فوقانی درمیان دونوں کے اور نون اول مکسور۔ آنا ترجمہ آمدن کا جاسوتن سین مہملہ مضموم اور واو معروف سے۔ رکھنا ترجمہ داشتن کا جا کوتن کاف تازی سے۔ لانا ترجمہ آوردن کا، اور فا جیسے آذرباف، اور مار اسفند اور اردیراف تین موبدوں کا نام۔ زفاک زائے تازی سے، ابر بارندہ آفرنکان ژند باژند کے اکیس نسک یعنی اقسام میں سے ایک نسک کا نام اور کاف جیسے جا کوتن جو سابق مرقوم ہوا۔

لیکن ذال معجمہ اور غین معجمہ میں ایسا لغت کہ اس کے اتغیر و تبدیل سے محفوظ ہونا قریب بہ یقین ہو، اب تک ہاتھ نہیں لگا۔ الفاظ مستعملہ میں احتمال اصالت و قلب دونوں کا متصور ہے، اور قول اردشیر زردشتی کا آذر کے باب میں مطلق ذال معجمہ کے نہ آنے پر دلالت نہیں کرتا، کیوں کہ وہ ژند پڑھنے کے وقت یہ کہتا تھا کہ لفظ ژند واستا میں ذال معجمہ سے نہیں آیا، نہ یہ کہ ژند واستا میں ذال معجمہ کہیں نہیں آئی ۲ اور قافیہ 'تعویذ' کا 'تمہید' اور 'عید' کے ساتھ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ جو دال معجمہ زبان فارسی میں نہیں ہے، تو تعویذ گو اگرچہ عربی ہے، اپنی زبان کے موافق دال مہملہ سے استعمال کیا۔ اور جب دال سمجھ لیا تو اس کا قافیہ انہیں لفظوں کے ساتھ کیا جن میں دال مہملہ تھی، کس واسطے کہ کیوں نہیں جائز ہے کہ موافق قاعدۂ مشہور کے جس کا بیان

۱۔ نول کشوری نسخے میں ''اس کا'' ہے۔
۲۔ نول کشوری ایڈیشن میں ''آیا'' ہے۔

مفصل آتا ہے، مہملہ کو معجمہ کر کے اپنے کلام میں استعمال کر لیا ہو اور دال اور ذال کے تفرقے کا قاعدہ کہ حروف مدہ اور حروف متحرک کے بعد صحیح ہو یا حرف علت ذال

معجمہ ہوتی ہے۔ جیسے 'باذ' اور 'بوذ' اور 'دیذ' اور 'کنذ' اور 'شوذ' اور حرف ساکن صحیح کے بعد مہملہ جیسے 'گرد' اور 'درد' دلالت کرتا ہے وجود حرف مذکور پر، اور ظاہرے کہ اگر وجود اس حرف کا اس زبان میں نہ ہوتا، قاعدہ مقرر کرنے کی کچھ احتیاج نہ ہوتی۔ اور اوحدالدین انوری کا نسق کلام بھی وجود ذال ہی پر دال ہے۔

رباعی

دستت به سخا چوں ید بیضا به نموذ

از جود تو بر جہاں جہانے افزوذ

کس چوں تو سخی نہ ہست و نہ خواھد بوذ

گو قافیہ دال شو زہے عالم جوذ

اور یہی سبب ہے کہ باد اور شاد کا قافیہ نفاذ کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن جو کہ ایسے حروف جن کے تلفظ میں التباس ہے، جیسے ضاد اور ظا کو زائے تازی سے التباس ہے اور ثا اور صاد کو سین سے اور عین کو الف سے، سوائے عربی کے اور زبانوں میں نہیں آتے۔ قیاس چاہتا ہے کہ جو ذال زے سے مشابہ ہے، اغلب کہ حروف فارسی سے نہ ہو۔

فائدہ:

حروف تہجی کے واسطے اٹھارہ صورتیں معین کی ہیں اور ان میں سے بعض صورتیں التباس اور اشتباہ سے خالی نہیں، لیکن یہ اشتباہ دو طرح ہے، ایک فقط مسمی کی صورت خطی میں، اور یہ بھی دو وضع پر ہے، اول حالت انفراد اور ترکیب دونوں میں جیسے جیم، اور دورے فقط ترکیب میں، جیسے فے اور قاف اور نون۔ اس اشتباہ کا ازالہ اسم کے تلفظ سے ممکن ہے، اور دوسرے مسمی کی صورت قطعی ا اور تلفظ اسم دونوں ۲ میں صاد و ضاد و طا و ظا و عین و غین۔ ان میں سے نقطہ دار کو منقوطہ اور معجمہ کہتے ہیں اور بے نقطہ کو مہملہ۔ اور بعضی صورتیں کہ باہم اشتباہ اور التباس رکھتی ہیں، ایسی ہیں کہ سب منقوطہ

ہیں۔اس واسطے جس میں ایک نقطہ ہے مثلاً با، اس کو موحدہ کہتے ہیں اور جس میں دو ہیں پس اگر نقطے اوپر ہیں، جیسے تا اس کو مثناۃ فوقانی اور اگر نیچے ہیں، مثلاً یا، اس کو مثناۃ تحتانی کہتے ہیں۔اور جن حرفوں کے مقابل حروف اربعہ مخصوصہ فارسی ہیں ان کو حروف عربی اور تازی کہتے ہیں، جیسے با اور جیم اور زا اور کاف، اور ان کے مقابلوں کو فارسی اور عجمی۔یعنی پے اور ژے اور چے اور گاف۔اور کبھی ازالۂ اشتباہ کے لیے حروف ابجد کی طرف منسوب کرتے ہیں، جیسے تائے قرشت اور حائے حطی مثلاً۔اور صاحب طبعان دقیقہ شناس پر ظاہر ہو کہ اعجام حرف پر نقطہ رکھنے کو کہتے ہیں اور حرف نقطہ رکھنے سے بری ہے۔پس ان کا اعجام اور اہمال خط کے اعتبار سے ہے، نہ ان کی ذات کے، جیسے کہ صراح میں ہے ''حروف المعجم[1] معناہ حروف الخط

۱۔نول کشوری نسخے میں ''خطی'' ہے۔

۲۔نول کشوری نسخے میں ''دون'' ہے۔

المعجم کما تقول مسجد الجامع وصلوۃ الاولی ای مسجد الیوم الجامع وصلوۃ الساعت الاولی''۔ یعنی حروف معجم کے معنی یہ ہے کہ نقطہ دار خط کے حرف جیسے 'مسجد الجامع' اور 'صلوۃ الاولی'، یعنی روز جامع کی مسجد اور پہلی ساعت کی نماز، کیوں کہ جامع اور اولی صفت ہے اور صفت کی طرف اضافت جائز نہیں۔پس جب تک تقدیر یوم اور ساعت کی نہ کریں، معنی کلام کے کرسی نشین نہ ہوں۔اور بعض وقت سب حروف تہجی کو حروف معجم کہتے ہیں۔

شیخ ابوالفضل ابن مبارک خطبۂ مرقع میں اس تسمیہ کی وجہ سے لکھتا ہے کہ اعجام ازالۂ اشتباہ کو کہتے ہیں اور جیسے کہ وجود نقطہ سے ازالۂ اشتباہ میسر ہے، اس کے عدم سے بھی متصور، یہاں تک اس کے کلام کا حاصل ہے، اور ظاہرا یہ کلام مخدوش ہے،

کس واسطے کہ یہ وجہ چاہتی ہے کہ تسمیہ انہیں حرفوں کے ساتھ مخصوص ہو جن کے التباس میں نقطے کے وجود و عدم کو دخل اہو نہ اور حروف میں، اور حال یہ ہے کہ لام اور میم مثلاً بھی تسمیہ میں شریک ہیں اور شاید اس تسمیہ میں مجاز ہو، یعنی بہ اعتبار بعض کے کل کا نام معجم رکھ دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حروف زبان عربی و فارسی کی بحث سے فارغ ہو کر حروف زبان ہندی کا حال بیان کیا جاتا ہے کہ اس زبان میں حروف بست وہشت گانہ سے بارہ حروف مستعمل نہیں اور وہ یہ ہیں: ثائے مثلثہ اور حا و صاد اور طا اور عین مہملات اور خا اور ذال اور ضاد اور ظا اور غین معجمات اور فا اور قاف، اور بجائے ثائے مثلثہ اور صاد مہملہ کے سین، اور بجائے حائے حطی کے ہائے ہوز، اور بجائے طا کے

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''داخل'' ہے۔

تائے فوقانی، اور بجائے ذال اور ضاد اور ظائے معجمہ کے زائے معجمہ، اور بجائے عین مہملہ کے الف، اور خا کے کھ یعنی کاف مخلوط الہا، اور بجائے فا کے پھ یعنی بائے فارسی مخلوط الہا، اور بجائے قاف کے کاف تازی استعمال کرتے ہیں۔ ان حروف بست وہشت گانہ سے بعد حذف بارہ حروف کے سولہ باقی رہے، یہ سب عربی و فارسی اور ہندی میں مشترک ہیں۔ اور پے اور چے اور ژے اور گاف کو کہ ان کو حروف تازی کے مقابل فارسی کہتے ہیں، یہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تین حروف اس زبان میں زیادہ ہیں ٹے اور ڈال اور ڑا، ان کو بہ سبب ثقل زائد کے مثقلہ ہندی کہتے ہیں۔ پس مجموع تیئیس حرف ہوتے ہیں۔

جب ماہیت اور کیفیت ایجاد حرف اور حال تعداد حروف میں زبان خامہ نغمہ زن ہو چکی تو اب سنا چاہیے کہ ہر شخص اجرائے کار و نظم امور ضروری میں دوسرے کا محتاج

ہے اور دوسرا اس کی امداد و اعانت میں جب سعی کر سکتا ہے کہ اس کے مافی الضمیر سے آگاہ ہو، پس ناگزیر ضرورت ہوئی ایسی چیز کی کہ اس کے وسیلے سے دل کی بات کا اظہار آسان ہو۔ اس واسطے الہام ربانی اور سروش غیبی کی رہبری سے ہر کوئی اس امر میں مصروف ہوا کہ چند حروف کو باہم ترکیب دے کر اشیاے مطلوبہ اور امور مقصودہ کے ساتھ ان کو اختصاص دے۔ اگرچہ بعضے امور میں حرکات اعضا جیسے کسی کو بلانے یا چلے جانے کے واسطے ہاتھ کی حرکت، اور اسی طرح اور اشارات مقرری سے اداے مدعا ممکن تھا، لیکن ان اشارات سے مطالب مضمر کا اظہار اس وسعت کے ساتھ صورت پزیر ہونا متعذر تھا۔ ناچار ہر ہر شے کے واسطے الفاظ، موضوع اور اس محل کے ساکنین ایک دوسرے کی اصلاح سے مطلع ہوتے گئے، یہاں تک کہ ان الفاظ کو اپنی اغراض مختلفہ میں استعمال کر کے باہم ہم کلام ہونے لگے۔

اس مطلب کے بعد یہ امر استفسار کے قابل ہے کہ جس قدر معانی تعقل میں آتے ہیں، آیا ان سب کے واسطے الفاظ موضوع ہوئے ہیں یا بعض کے؟ ظاہر یہ ہے کہ ہر معنی کے واسطے لفظ موضوع نہ ہو، کیوں کہ ہم بعض معنی تعبیر میں کبھی تغیر آواز کے محتاج ہوتے ہیں، مثلاً لفظ 'خیر' صرف تغیر آواز سے معانی متعدد کا فایدہ دیتا ہے، یعنی جب کسی کے کلام سے تعجب ناشی ہو تو کہتے ہیں 'خیر' خاے معجمہ کے ساتھ نفس کو دراز کھینچ کر، اور یہی صورت ہے جب کہ کسی کی بات کو قبول کر لیں۔ لیکن ان دونوں مقام میں نفس کے کھینچنے کی کیفیت جدا ہے، اور یہ صاحب زبان پر آشکار اور الفاظ سے تعبیر ان کیفیات کی دشوار ہے، اور مثلاً کسی کو کہیں 'جا' اور ایسی تاکید منظور ہو کہ سامع یہ سمجھ لے کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو قائل ناراض ہوگا، اس وقت فتحۂ جیم کو بہت کھینچیں، اور اگر اس قدر تاکید منظور نہ ہو تو فتحہ کو زیادہ نہ کھینچیں۔ اور کبھی حرکات اعضاء کی طرف احتیاج ہوتی ہے، مثلاً انکار کے وقت مکرر انگشت یا سر کو اشکال مخصوصہ کے ساتھ حرکت دینا یا کسی خط منحنی کی تعبیر کے واسطے کہ کسی ہیئت خاص پر ہو،

انگشت کو ہوا میں ایسی طرح سے کھینچنا کہ اس ہیئت پر دلالت کرے۔ الفاظ بے شمار اور مواضع استعمال بے حساب ہیں۔ ان کا احاطہ دائرۂ امکان سے خارج اور حیز بیاں سے باہر ہے۔

اگر ان چیزوں کے مقابل لفظ ہوئے تو اس تکلف کی طرف احتیاج نہ ہوتی، اور اس کے اسباب کئی ہیں۔ یا تو یہ ہے کہ تعبیر اس کی الفاظ سے خود محال ہے، جیسے لفظ 'خیر' وغیرہ میں یا اس کی طرف احتیاج بہت کم واقع ہوتی ہے یا وہ شے اس بلاد میں نہیں ہے، اسی واسطے 'حمام' کے واسطے ہندی میں کوئی لفظ موضوع نہیں ہے کیوں کہ ہندوستان میں اس طرح غسل کرنے کی رسم نہیں۔ اور اسی طرح سے 'تنور' کے مقابل کوئی لفظ نہیں کیوں کہ جو شرائط کہ پخت طعام میں مذہب ہنود کے موافق چاہیے، 'تنور' میں متصور نہیں۔ اور جب 'تنور' کی طرف احتیاج نہ ہوئی، اس کی رسم بھی اس دیار میں نہ ہوئی۔ خان آرزو کہتا ہے کہ 'بھٹ' جو 'تنور' کو کہتے ہیں، مجاز ہے، اور اصل میں بھٹ وہ چیز ہے جس میں نخود وغیرہ بریاں کریں اور مراد اس سے بھاڑ ہے جو کہ شیوع اسلام سے تنور کا رواج ہند میں ہوا، اس کو من حیث التشبیہ بھٹ کہنے لگے۔ مولف کہتا ہے کہ شاید اسی سبب سے طباخ کو ہندی میں بھٹیارا کہتے ہیں۔ بہر کیف امام فخر الدین رازی اور اس کے اتباع کا یہی مذہب ہے، اور اس پر ایک دلیل عقلی بھی قایم کرتے ہیں کہ معانی غیر متناہی ہیں اور الفاظ متناہی، کیوں کہ مرکب ہیں حروف سے اور حروف متناہی ہیں، اور جو متناہی سے مرکب ہوگا، متناہی ہوگا پس متناہی سے غیر متناہی کا حصر محال ہے، اور اگر حصر ممکن ہو تو مدلولات کی تناہی لازم آوے۔

فائدہ:

عباد ابن سلیمان الضمیری کی رائے ہے کہ الفاظ اور مدلولات میں مناسبت طبیعی ہوتی ہے اور وہی مناسبت واضع کو باعث ہے کہ اس لفظ کو اسی معنی کے واسطے وضع

کرے، اور اگر یوں نہ ہو تو ترجیح بلا مرجح لازم آوے۔

نقل ہے کہ کسی نے ایک شخص سے جو اس رائے کو مستحسن جانتا تھا، پوچھا کہ ارغاغ کے کیا معنی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی چیز کو کہتے ہوں کہ اس میں بہت خشکی ہو اور شاید وہ پتھر ہو۔ اور حال یہ ہے کہ ارغاغ پتھر ہی کو کہتے ہیں جیسے کہ جلال الدین سیوطی نے ''مزھر'' میں لکھا ہے۔ لیکن خان آرزو مثمر میں لکھتا ہے کہ کتب معتبرہ فارسی میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا اور بعضے حواشی سے نقل کیا کہ لغت تبریزی ہے۔ بہرکیف جمہور کو اس رائے میں انکار ہے، اس واسطے کہ اگر یہ بات درست ہوتی، ہر کوئی ہو لغت کو سمجھ لیتا اور ایک لفظ معنی متضادہ کے واسطے موضوع نہ ہوتا۔ جیسے 'فراز' کشادن و بستن اور 'قرو' حیض وطہر اور 'جون' اسود وابیض، لیکن ہر کسی کا نہ سمجھنا شاید اس سبب سے ہو کہ ہر کوئی اس مناسبت کو نہیں پہنچ سکتا۔ چناں چہ وہ مناسبات کہ علمائے عربیت الفاظ اور مدلولات میں ثابت کرتے ہیں، مسلم ہے اور ہر کوئی اس کو فہم نہیں کر سکتا، اور جب تک اس کو نہ بتائیں اس پر اطلاع نہیں ہوتی۔ اور ممکن ہے کہ اس لفظ کو دونوں معنی متضاد کے ساتھ مناسبت ہو لیکن یہ رائے سخافت سے خالی نہیں، کیوں کہ ہم اختیار رکھتے ہیں کہ ایک لفظ جو بہ معنی سنگ سخت کے موضوع ہو، اپنی اصطلاح میں بہ معنی شے ملائم کے ٹھہرا لیں، حالاں کہ اگر اس کو شے ملایم کے ساتھ کچھ مناسبت ہوتی تو واضع اول اس کو اضداد سے ٹھہراتا۔

اس فوائد جزیلہ اور مطالب جلیلہ کی تحریر کے بعد اصل مطلب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ یہ الفاظ موضوعہ جو محال مختلفہ اور مواقع متعددہ میں ادائے مطلب اور اظہار مدعا کے واسطے رابطۂ ترکیب سے سلتیام اور حسن تربیت سے انتظام پا کر زبان زدۂ خاص و عام ہوتے ہیں، ان کو زبان کہتے ہیں۔ جب زبان کے معنی دریافت ہوئے تو اب تحقیق اس امر کی کی جاتی ہے کہ آغاز آفرینش میں ایک زبان تھی یا متعدد؟ اور

اگر ایک تھی تو اول کون سی زبان موجود ہوئی؟ اور پھر اختلاف السنہ کس طرح سے وقوع میں آیا؟ لیکن تحقیق ان امور کی ایک مقدمے کی تمہید پر موقوف ہے۔

اسرار جہان کارگاہ تکوین وایجاد اور رموز دانان مبدء و معاد کہ دیدۂ خرد روشن و چشم بصیرت باز رکھتے ہیں، اگر پردۂ تعصب کو چشم بند اور حسد و اعتساف کو نقاب چہرہ تحقیق نہ کریں، تو یہ نکتہ مضمون پیش پا افتادہ ہے کہ ہر فرد بشر فروغ گوہر خرد اور پرتو چراغ عقل سے چاہتا ہے کہ شبستان معرفت حضرت آفریدگار تعالیٰ شانہ میں راہ پاوے اور خواب غفلت سے انتباہ۔ اس واسطے صرف تحصیل مواد معاش میں منہمک اور تکمیل مراتب دنیا میں مستغرق نہ ہو کر شرایف اوقات اور نفائس ازمنہ کو شناخت مبداء وجود اور رہم راہی راہ معاد میں حرف صا کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ دیدۂ و دانستہ راہ ضلالت میں گام زن اور جادۂ مقصود میں عنان افگن ہو۔ ناگزیر جس کو خواہ گواہی شواہد عقل و خرد، خواہ دلالت رہ نمایان سبل ارشاد سے اکتساب کیا ہے، اگر اس صراط مستقیم سے کسی کو انحراف یا ان ضوابط محکم اور قواعد راسخہ کی شہادت سے کجی و اعتساف بہم پہنچے، تو جو لوگ اس طریق محمود کی حراست کی توفیق رکھتے ہیں اس کی سرزنش میں اتفاق اور اس کی تنبیہ میں اجتہاد کرتے ہیں اور جو کہ ارباب رائے روشن اور اصحاب طبائع سلیمہ کہ دقائق اور غوامض میں نکتہ رس اور نکتہ یاب ہیں، اس امر خاص میں متفق اور اس طریقے کی منزل مقصود تک پہنچنے میں متیقن، اور حصول نتائج میں شریک، اور ریاضت شاقہ اور ترک لذات اور تصفیۂ قلوب کا اہتمام، اور ذمائم خصال سے پاک ہونے کا جہد اور خلوت اور جلوت میں ایک طرح سے تحقیق حق کی سعی، اور شوائب جسمانی سے سربراہ ہونے کی جستجو پیش نہاد رکھتے ہیں، عقل صحیح کیوں کہ باور کرے گی کہ یہ سب مراتب ریا سے اور یہ تمام امور مصلحت سے صورت پزیر ہوئے ہوں، اور قاطبۂ راہ صواب سے منحرف ہو کر طریقہ ضلالت میں ساعی اور اضلال عباد میں داعی ہوں۔

ظاہر اور صریح ہے کہ رحمت عامہ حضرت آفریدگار کی شامل جمیع عباد ہے، اور نہیں چاہتی کہ اس سعادت کونین کو ایک طائفے کے ساتھ اختصاص دے کر باقی پر دائرہ حصول کرام کا تنگ کردے۔ وہی ایک جلوہ ہے کہ مختلف پردوں سے صورت نما ہے اور وہی ایک شاہد ہے کہ

نول کشوری نسخے میں ''مبرا'' ہے۔

ہر رند و پارسا کی نگاہ میں نقاب کشا ہے۔ دراصل راہ تحقیق صائب تبریزی کس دل ربائی سے نغمہ سرا ہے۔

گفتگوے کفر و دین آخر بہ یک جا می کشد
خواب یک خواب است، باشد مختلف تعبیر ہا

اور کیوں کر نہ ہو کہ نفس ناطقہ انسانی اسی چشمۂ فیض کا ایک قطرہ اور اسی دریائے کرم کا ایک رشحہ ہے۔ قطرے کی نم چشمے ہی کا نتیجہ اور رشحے کی طراوت دریا ہی کا فیض ہے۔ کیا عجب ہے کہ وہی معلم اسرار نیرنگ عالم قدسی سے ہر طائفے کو طرق گوناگوں میں رہنمایان سبل اور ھداۃ طرق کہ اسلاف و اخلاف طوائف و امم کو ان کی پیروی کا دعویٰ اور ان کی اقتدا کا ادعا ہے۔ پیرایۂ مناسبت خاص سے محلی اور اختصاص تمام سے مشرف ہو کر اس شاہد لاریبی کے پیام سے حرف سرا ہوے ہوں۔ آخر پیشوایان راہ ہدایت و یقین کہ وحی آسمانی و الہام ربانی کو گوہر گوش کر کے، نقد قبول سے صاحب نصاب اور حکم محکم نص قطعی سے راہ روان طریقۂ اسلام کے اعتقاد میں خلوت قرب میں باریاب ہیں، طرق مختلف میں گام زن اور طوائف خاص کی رہ بری سے ممتز تھے۔ گو کہ اب چہرہ دستی آفتاب ظہور مظہر تام، زبدۂ نتائج لیالی و ایام، باعث ایجاد نشائین، علت ابداع کونین فخر عالم، شرف بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم سے

بسان کواکب صبح گاہی مستور اور مثل انجم سحری بے نور ہیں۔ اگر اصناف عباد پیام معبود برحق سے کام یاب نہیں، اصول مذہب گوناگوں کی ایجاد کا کیا سبب ہے؟ ہنود سے لے کر مجوس تک توحید حضرت واجب الوجود کو اصل اصول جانتے ہیں اور وساطت انبیا کو ضروریات سے پہچانتے ہیں۔ گو اپنی اصطلاح میں ایک اوتار نام رکھے اور دوسرا وخشور۔ بتوں کی پوجا اور آتش و اجرام کی پرستش توحید کے منافی نہیں کہ یہ دونوں لفظ ہندی و فارسی میں تعظیم و عبادت میں مشترک ہیں۔ خواص گروہ اول پیشوایان طریق کے پیکر کے سامنے رکھنے کو تصور کے قبیل سے شمار کرتے ہیں اور کملائے طائفہ اخریٰ اجرام نورانی کو سمت قبلہ کی جائے اختیار کرتے ہیں۔

غایت یہ ہے کہ مصلحت سنج عباد آرائندۂ کون و فساد نے ملت حنیفہ بیضا کو مرجع خلف اور ماحیٔ آثار سلف کر دیا۔ صدمہ گرز غزاۃ سے سنگ اصنام ریزہ ریزہ ہو گیا اور آب شمشیر مجاہدین سے حرارت آتش افسردہ۔ اس ملت روشن کے فروغ کے سامنے کواکب ابدی الخفا اور آفتاب بے نور و ضیا ہے۔ مومنین کا طالع کیا بلند ہے کہ ایسے آفتاب کی روشنی میں لمعات انجم سے بے نیاز ہو گئے اور ایسے نور کی گرمی ہنگامہ میں آتش سے مستغنی۔ نہ اس طریق کے راہ رو کو چراغ ید بیضا کی احتیاج اور نہ اس دار الشفا کا مریض باد مسیحا کا محتاج۔ حصول اس دولت کا اور وصول اس نعمت کا اسی امت کے نصیب میں تھا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک و ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

بعد اس طول کلام اور اطناب سخن کے منتظران مقصود کے گوش گزار کیا جاتا ہے کہ ہر گاہ ملل مذکور اور مذاہب مسطور میں احتمال راستی و درستی نے راہ ہویدہ کی اور ان کی واقعیت نے بارگاہ امکان میں جائے پیدا کی، تو کیا عجب ہے کہ ان کے اخبار کو پیرایۂ صدق سے قاطبۃً معرا سمجھ کر احتمال وقوع سے خالی نہ جانیں اور بعض حکایات کو کہ قبول عقل و اختیار خرد سے ظاہرا دور دست ہیں، خوارق و کرامت پر محمول کریں۔ لیکن با ایں ہمہ سر رشتہ بعضے امور کا تفاوت روایات اور تباین عبارت سے ایسا نایافت

ہے کہ چارہ سازئ فکر رسا ہر چند اس کی تلاش میں سرگرداں ہو، سوائے حیرت و سراسیمگی کے کچھ ثمر اور سوائے سکوت کے کوئی مفر بہم نہ پہنچے۔ ایک ان مقدمات دور از کار سے حال ہے آغاز آفرینش اور ابتدائے تکوین و ایجاد عالم کون وفساد کا، کہ جب اختلاف اقوال رواتا اور تضاد روایات پر نظر پڑتی ہے، دشوار پسندان دور یاب کا فہم پیچ وخم راہ سے طرفہ پریشانی حاصل کرتا ہے۔

دریں داستاں داورے حا لبے ست
مرا گوش بر گفتۂ ہر کسے ست

براہمہ ہند کہ سرمایۂ عقل و دانش سے تونگر اور نصاب کمال سے بہرہ ور ہیں، کیفیت آفرینش میں اٹھارہ طرح سے روایت کرتے ہیں۔ استیعاب اقوال سے خوف اطناب مانع اور بیم درازنفسی عنان گیر ہے، ناگزیر دو تین قول لوح اظہار پر مرتسم اور آئینۂ عرض میں منطبع کرتا ہے۔

پہلا قول:

پہلا قول یہ ہے کہ گیتی آفرین نے اول ایک قدسی نہاد انسان صورت ملک سیرت برھما نام کو خلوت عدم سے عرصۂ ایجاد میں جلوہ گر کیا اور اس نے اپنی خواہش سے

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں ''روایات'' ہے۔

چار فرزند موجود کیے۔ ایک کو سنگ اور دوسرے کو سنندان اور تیسرے کو سناتن اور چوتھے کو شنکرا کہتے تھے۔ ان چاروں سے فرمائش کی کہ ایجاد عالم اور تکوین ملکونات میں ساعی ہوں، لیکن ازبس کہ قوت تیزیہ ان پر غالب اور تمام توجہ مبداء ایجاد کی طرف مصروف تھی، خسائیس عالم تشبیہ کی جانب ملتفت نہ ہوئے۔ ناچار خشم گیں ہو کر

اپنی پیشانی سے ایک صورت سراپا سیرت ظاہر کی کہ اس تقدس نژاد جلالت نہاد کو مہا دیو کہتے ہیں، لیکن اس میں بھی نہایت جلالت شان اور علو مکان سے کہ تنزیہ و تقدیس کو مقتضی تھی، ان امور کے التفات کی قابلیت نہ پائی۔ اپنی خواہش سے دس فرزند اور پیدا کیے اور ان کے بعد اپنے ہی بدن سے ایک مرد اور ایک عورت موجود کی۔ مرد کو "من" کہتے ہیں اور عورت کو "ستر کاوان" دونوں سے سلسلہ آفرینش کا آغاز ہوا۔ ہندی زبان میں انسان کو 'منش' اسی واسطے کہتے ہیں کہ 'من' کے ساتھ منسوب ہیں جیسے زبان فارسی میں آدم کی نسبت سے آدمی۔

دوسرا قول:

دوسرا قول یہ ہے کہ کارپرداز امور نے عورت کی صورت میں جلوہ کیا کہ اس کو مہا لچھمین کہتے ہیں اور اس میں تین گن ہیں 'ست' اور 'رج' اور 'تم'۔ جب آفرینش عالم کا مقصد مصمم ہوا 'تم' کی دست آویز سے اپنی ایک اور صورت بنائی کہ اس کو 'مہا کالی' اور 'مہا مایا' کہتے ہیں اور 'ست' کے وسیلے سے ایک اور شکل بہم پہنچائی کہ اس کو 'سرتی' کہتے ہیں۔ پھر اس کی فرمائش سے ہر ایک

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں "ستنکدا" ہے۔

نے ایک مرد اور ایک عورت پیدا کی۔ مہا لچھمین سے برھما مرد اور مہا کالی سے مہادیو اور ساوتری جس کو مہابدیا اور کام دھین بھی کہتے ہیں۔ اور سرتی سے بشن اور کوری۔ بعد اس کے کوری کا ازدواج مہادیو سے اور سری کا بشن سے اور برہما کا تری سے کر دیا اور برہما اور ساوتری سے ایک بیضہ پیدا ہوا، مہادیو نے اس کو دو ٹکڑے کیا اس میں سے دیوتا اور دیت یعنی واکس اور نفوس قدسی اور انسان اور باقی اور جان دار اور روئیدگی اور کوہ پیدا ہوئے۔

تیسرا قول:

تیسرا قول جو عمدہ اقوال اور سورج سدھانت میں کہ کئی لاکھ برس کی تالیف کی ہوئی کتاب اور علم نجوم کا مرجع اور مآب ہے، مرقوم ہے، یہ ہے کہ ست جگ کے آخر میں ایک شخص میدیت نام صفحۂ ظہور میں جلوہ گر ہوا اور اس نے جو آفرینش اور نیرنگیٔ روزگار کو دیکھا، بس کہ ان امور سے شناسا نہ تھا، متحیر ہوا، اور اس عقدۂ سربستہ کی کشائش میں سعی کی۔ کئی ہزار برس تک اپنی خواہش کو آفریدگاہ تعالی شانہ کے جناب میں عرض کرتا رہا، جب محنت حد سے گزر گئی اور مدت طویل سپری ہوئی، شاہد مطلق صورت جمیل میں اس پر ظاہر ہوا اور مطلب کا سوال کیا۔ منتظر عطیہ غیبی نے عقدۂ خاطر کو وا کیا اور زبان عجز بیان کو حرف مدعا سے تر صدا کہ اختر و افلاک کیا ہیں؟ اور آتش و باد و آب و خاک کیا؟ عرض سائل پیرایۂ اجابت سے آراستہ ہوئی اور حلیہ قبول سے پیراستہ کہ تو ایک مدت تک فلاں معبد میں متوقف ہو اور عرض نیاز سے متصف۔ ایک قدسی پیکر تیری نظر میں جلوہ فرما ہو گا اور تیری مشکلات سے عقدہ کشا''۔ اتفاقاً ست جگ کے انجام ہونے کے قریب وہی ہمایوں فال ایسی شکل و شمائل سے کہ پری کو حیران کرے اور ملک کو سرگردان، اس کی نگاہ میں جلوہ گر ہوا اور اپنے غبار قدم سے چشم انتظار کے واسطے توتیاے بصر۔ ہر سوال نے پیرایۂ جواب سے آرائش پائی اور ہر نقصان نے زیور کمال سے پیرائش۔ اس نے جب دامن استعداد کو ذخائر کمال سے مالا مال دیکھا اور خاطر مضطرب کو مستمال، ایک کتاب تصنیف کی کہ ''سورج سدھانت'' نام اور رالی لاآن احکام نجوم کو اسی کے قواعد و ضوابط سے انتظام ہے۔ اس کتاب دانش خطاب کی لوح اوراق پر مرتسم ہے کہ نگارندۂ الواح طبائع اور رسام نقوش آثار نے ایک کرۂ زریں کہ اندر سے خالی اور باہر سے لطافت و صفا سے لبریز ہے، دو علیحدہ ٹکڑوں سے پیدا کر کے اپنے نور کو اس پر جلوہ دیا اور وہ عالم میں آفتاب کے نام مشہور اور نیر اعظم کے اسم سے مذکور ہوا۔ اس نے برھما

کو پیدا کیا، برھما کی وساطت سے چار اورا کاس اور ھوا اور آگ اور پانی اور خاک کو اسی ترتیب سے پیدا کیا۔ اور اکاس سے مشتری، اور ھوا سے زحل، اور آگ سے مریخ اور پانی سے زھرہ اور خاک سے عطارد کو پیدا کیا۔

ان اقوال کی تفصیل کے بعد مرقوم کیا جاتا ہے کہ ضبط تواریخ حکمائے ہند سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نہ عالم کی ابتدا ہے اور نہ عالموں کے واسطے آغاز ہویدا۔ ان کے اعتقاد میں گردش روزگار کا مدار چار دور پر منحصر ہے اور ہر دور کو جگ کہتے ہیں۔ پہلے دور کا نام 'ست جگ' ہے، اس کی مدت سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار اور عمر طبیعی انسانوں کی اس دور میں ایک لاکھ برس کی ہے۔ دوسرے دور کا نام 'ترتیا' ہے، اور اس کی مدت بارہ لاکھ اور چھیانویں ہزار اور عمر طبیعی آدمیوں کی اس دور میں دس ہزار سال کی۔ تیسرے دور کا نام دواپر اور اس کی مدت آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار، اور عمر طبیعی مردم روزگار کی اس وقت میں ہزار برس کی ہے۔ چوتھے دور کا نام کل جگ ہے، اور مدت اس کی چار لاکھ بتیس ہزار اور عمر طبیعی اس زمانے کے آدمیوں کی سو برس کی ہے۔

جب یہ حال دریافت ہو چکا تو اب سننا چاہیے کہ حضرت آفریدگار ہر ایک چند مدت میں ایک تجرد منش دانش نہاد کو عیار عدم سے دار الملک ھستی میں جلوہ گر فرماتا ہے تا کہ خالق و مخلوق میں واسطہ اور ایجاد ممکنات کا سبب ہو۔ صفحۂ سادہ روزگار نقوش بدائع سے مرتسم ہو جاوے اور شیرازۂ کتاب صنعت کا ملتیم، دوائر افلاک مرکز عناصر سے مربوط ہوں اور بسیط و مرکب کا سلسلہ ایک دوسرے سے منوط واسطے اس کا نام برھما ہے اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ یہ چاروں جگ اس طول مدت کے ساتھ جب دو ہزار مرتبہ انجام کو پہنچیں تو ایک شبا روز کے حساب میں محسوب اور ایسے تین سو ساٹھ شبا روز کو ایک برس اور ایسے سو برس کو برھما کی عمر اعتبار کرتے ہیں۔ جب اس طرح کے سو برس سرے اور یہ مدت دراز منقضی ہو جاوے، برھما جلوہ گاہ وجود سے خلوت عدم میں خرام کرے اور بستر نیستی پر آرام۔ اس کے بعد جس وقت داعی ایجاد و تکوین

ابداع عالم کا اقتضا کرے، اسی صفت کے ساتھ ایک اور برھما کو خلعت وجود سے مشرف اور حلیہ ھستی سے مزین فرما کر مسند ظہور اور چار بالش شہود پر متمکن کرے تا کہ بزم امکان پھر اسی ترتیب سے آراستہ ہو جاوے اور نہال آفرینش اسی سرسبزی کے ساتھ پیراستہ۔ اس دیار کے کملا کا یہ اعتقاد ہے کہ جس قدر برھما بزم ہستی میں جلوہ گر ہو کر پھر دشت نیستی میں گام زن ہوئے ہیں، دائرہ شمار سے افزوں اور حد حصر سے خارج ہیں۔ لیکن ظن و تخمیں سے کہتے ہیں کہ برھمائے حال ہزار و کیم اور آج تک اس کے سنین عمر سے تقریباً پچاس برس اور نصف روز گزرا ہے۔ کہتے ہیں کہ برھما کی تمام عمر بشن کی چشمک کی مقدار سے مساوی ہے۔

مرزا بیدل علیہ الرحمۃ کتاب ''چار عنصر'' میں ایک برہمن کی حکایت کی تقریب سے لکھتے ہیں کہ ہر قوم کے کاملین کے واسطے اصطلاح خاص ہے کہ کند فہمان مدرسۂ دانش اس تعبیر سے منزل مقصود پر لے جاویں ا اور پیچ وخم راہ سے دھوکا نہ کھاویں۔ یہ دانش اندوز مرتبۂ وجوب کو بشن کہتے ہیں اور عقل اول کو برھما۔ حکمت شناس دقیقہ فہم جانتا ہے کہ ایجاد و ابداع بے توسط عقل اول محال ہے اور جہد عقعل بدون افاضہ فیاض مطلق وہم وخیال۔ جب حضرت واجب ایجاد و تکوین کی طرف سے چشم پوشی اور اغماض کو کارفرماتا ہے ان نتائج آثار کا نقش محو

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں ''پہنچ جاویں'' ہے۔

ہو جاتا ہے۔ طائفہ ریاضت کیش و تجرد اندیش، یعنی سیوڑہ طرفہ اقوال حیرت افزا اور حکایات ہوش ربا کہتے ہیں، کہ عقل اس راہ میں نیم قدم اور فکر اس طریقے میں ایک گام نہیں رکھ سکتے۔ ذکر ان کا منتج وحشت اور تصور اس کا مثمر حیرت ہے۔ اس گروہ ندرت بیاں و غرابت بتیان کے نزدیک زمانہ دو قسم ہے۔ ایک اسرپنی یعنی ایسا زمانہ

کہ ابتدا میں شادی ہو اور انتہا میں اندوہ و نامرادی۔ دوسرا ات سرپنی، یعنی برعکس اول کہ انتہا میں شادمانی ہے اور ابتدا میں اندوہ و خلل۔ اور ہر قسم کے چھ حصے ٹھہرا کر ہے حصے کو "آرہ" کے نام سے مشہور کرتے ہیں۔ اور ہر آرے کو اس کے خواص کی مناسبت سے ایک اسم خاص کے ساتھ مذکور۔

پہلا آرہ قسم اول کا سکھ مان سکھ مان، یعنی ایسا زمانہ کہ فرحت متوالی اور مسرت متواتر بخشے، اور اس کی مدت چار کوڑا کوڑ ساگر ہے۔ اور دوسرا آرہ سکھ مان یعنی خوش حالی اور فراغ بالی کا زمانہ۔ اور اس کی مدت تین کوڑا کوڑ ساگر ہے۔ تیسرا سکھ مان دکھ مان کہ عین خوش حالی میں رنج و ملال نیش زن ہو اور ہنگامہ شادکامی میں اندوہ و کلال دل شکن۔ اس کا زمانہ دو کوڑا کوڑ ساگر تک ممتد ہوتا ہے۔ اور افراط تنگ دلی سے غیرت حرمان ابد۔ چوتھا دکھ مان سکھ مان کہ اوقات اندوہ میں بے غمی دیتا ہے، اور آوان ملال میں خرمی۔ اور اس کی مدت بیالیس ہزار کم ایک کوڑا کوڑ ساگر ہے۔ اور اندوہ زدائی و غم ربائی میں عیش متواتر کے برابر۔ پانچواں دکھ مان، یعنی رنج و ملال اور عہد اندوہ و کلال۔ یہ زمانہ اکیس ہزار سال کی امتداد رکھتا ہے اور درد و مصیبت کی بنیاد۔ چھٹا دکھ مان دکھ مان کہ تواتر غم اور تکاثر الم سے منبع ملال۔ اور مدت اس روزگار کدورت آثار کی بھی اکیس ہزار سال ہے۔

قسم دوم کے آرہ، یعنی حصوں کے بھی یہی نام ہیں لیکن تفاوت اس قدر ہے کہ اس کا پہلا آرہ قسم اول کے چھٹے آرے کے ساتھ اور اس کا دوسرا آرہ اس کے پانچویں کے ساتھ نام و درازئ مدت میں مشارکت رکھتا ہے، اور تیسرا اس کے چوتھے سے اور چوتھا اس کے تیسرے سے موافقت۔ اس کا پانچواں اس کے دوسرے سے ہم سر، اور اس کا چھٹا اس کے پہلے کے برابر۔ ان کے گمان میں قسم اول کے آرے پنجم سے کچھ اوپر دو ہزار برس منقضی اور اب تک اسی قدر سال سپری ہوئے ہیں۔

ارباب خرد پر روشن ہے کہ محاسبان ہند سو ہزار کو لاکھ کہتے ہیں اور دس لاکھ کو ایوت اور دس ایوت کو کروڑ کہتے ہیں اور سو کروڑ کو ارب اور دس ارب ایک کھرب ہے اور دس کھرب ایک نکھرب، دس نکھرب مہاسروج اور پدم کے ساتھ موسوم ہے اور دس پدم سنکھ، اور دس سنکھ سمندر کے نام سے معلوم اور سمندر کو کورا کور بھی کہتے ہیں ۔اس حرف سرائی کے بعد ایک اور افسانہ حیرت فزا مذکور ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک جگہ پسر و دختر توام پیدا ہوتے ہیں۔ وہاں کے ساکنین جنگلی کے لقب سے مشتہر اور دیار دہلی کے اطفال خورد سال کے سر کے بال ان جنگلیوں کے سر کے بال سے چھانویں حصہ کندہ تر ہیں۔ اگر ان کے سات دن کے مولود کے سر کے بال کہ کوئی بال اس سے زیادہ باریک اور غایت باریکی میں اس کے ساتھ شریک نہیں، اجزاے لا تتجزی کے ساتھ تقسیم کیے جاویں، اور ان اجزا سے ایک چاہ جس کا طول و عرض وعمق چار چار کوس کا ہو پر کریں، اور سو برس کے بعد ہزرواں حصہ ان اجزا کا اس چاہ سے نکالیں، جتنی مدت میں وہ چاہ اس طریق سے خالی ہو جاوے، اس مدت کو پلو پم کہتے ہیں۔ جب پلو پم سے دس کورا کور گزریں، جس کا حال مسطور اور سمندر کے نام کے ساتھ مذکور ہوا، اس مدت کو ساگر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادوار مذکور کی کمیت حیطۂ بیان سے مبرا اور حلیہ تقریر سے معرا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہر آرے میں چوبیس آدم کتم عدم سے عرصۂ وجود میں جلوہ طراز ہوتے ہیں اور مدت معہود کے بعد پھر جادۂ دارالملک نیستی میں عنان انداز۔ ان میں سے اول کا نام آدناتھ اور رگھوناتھ ہے۔ یہ اعجوبۂ کارگاہ تقدیر پچاس کروڑ لاکھ ساگر تک کارگزاری انتظام آفرینش میں ساعی رہتا ہے۔ اور اخیر کا نام مہادیوا ہے اور وہ تیس ہزار سال تک ترویج امور ملکونات میں داعی رہتا ہے۔ اس کی مدت سے آج تک دو ہزار تین سو برس گزرے ہیں۔ اور ''نفائس الفنون'' میں تاریخ خطائی سے منقول ہے کہ آدم ابوالبشر کے عہد سے آج تک کہ سات سو پینتیس سال ھجری ہیں،

آٹھ سو ترے سٹ ہر دن اور نو ہزار آٹھ سو برس منقضی ہوئے۔ اور دن ان کی اصطلاح میں دس ہزار برس کو کہتے ہیں۔

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''مہابیر'' ہے۔
۲۔ نسخۂ نول کشور میں ترسٹھ دن ہے۔

خامۂ خام رقم جب ان حکایات ندرت خیز اور روایات حیرت انگیز کو لکھ چکا، اندیشۂ رسا اور فکر تیز یا چاہتا ہے کہ ہنوز ہنگامۂ نیرنگی کو پایان پذیر نہ کرے۔ اور اسباب تعجب اور سامان شگفتی کے فراہم کرنے سے ہاتھ نہ اٹھاوے اور ایسے نقوش غریب اور تماثیل پردۂ خیال سے جلوہ گر کرے کہ بینندگان عجائب روزگار کو حیرت اور شنوندگان غرائب اسمار کو وحشت ہو۔

طرفہ تر ایسی ہی کہوں ایک بات
ہنستی ہے سن کے جسے کائنات

گروہ دانش پژوہ فرسنداجی، یعنی امت اولین پیغمبر عجم کہ ان کو سپاسی و پارسی و ایرانی و ایزدی و یزدانی و آبادی و ہوشی و ناوشک و آذرہوشنگی و آذری بھی کہتے ہیں، یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جہان کو جہاں آفرین سے وہ نسبت ہے جو نور کو آفتاب عالم تاب سے ازل سے ہے اور ابدالآباد رہے گا۔ امتداد سلسلۂ کون وفساد اور تسلسل ادوار عالم ایجاد کے باب میں نقل عجیب اور حکایت غریب مسموع ہے کہ نہ عقل کو اس کے سراپردے میں بار ہے اور نہ خرد کو اس کی خلوت راز میں گزار۔ یعنی اول ایک کوکب کواکب ثابتہ سے دارالملک عالم میں بادشاہ اور بسیط گیتی میں کشور خدا ہو کر ہزار سال تک تنہا فرمان روائی کو کاربند ہوتا ہے اور حکم رانی کے منصب سے ارجمند۔ اس کوکب کو نخستین شاہ کہیں گے۔ جب مدت معہود انجام کو پہنچے ثابتہ دوسرا مرتبۂ

وزارت سے ممتاز ہو اور اجرائے امور عالم میں بادشاہ نخستین کے ساتھ انباز، اور اس کو نخستین دستور کہیں گے۔ جب اس کی شرکت و انبازی کو ہزار برس گزریں ثوابت میں سے اور ایک کوکب مسند دستوری پر تمکن اختیار کرے، اور بہ دستور ہزار سال تک کون فساد کو آشکار۔ پھر اس کے عزل کے بعد ایک اور ستارہ منصوب ہو اور وہی امور اس کے ساتھ بھی منسوب، تا بہ حدے کہ ہر ثابتہ ایک ایک ہزار سال منصب وزارت سے امتیاز پاوے۔ اور جب ان نورانی پیکروں کی حکومت و انبازی کا سلسلہ منقطع ہو جاوے، زحل اس منصب سے سربلندی حاصل کرے اور اس مرتبے سے ارجمندی۔ رفتہ رفتہ قمر دستور ہو جاوے اور کاروبار گیتی اس کی بہ دولت انتظام پاوے۔ اب نخستین شاہ کا دور منصرم اور نخستین دستور شاہ دوم ہو کر ہزار برس تک تنہا جہان و جہانیوں کے کار کا منتظم ہو۔ جب یہ ہزار برس منقضی ہوں، ہر ثابتہ و سیارہ بہ دستور سابق دستوری بجا لاوے اور ہزار ہزار سال نوبت بہ نوبت اپنا منصب انجام کو پہنچاوے۔ ان سب کے بعد نخستین شاہ کہ بالفعل مرتبۂ خدیوی و خسروی سے معزول ہے، امر وزارت پر مستعد ہو اور نظم عالم کے واسطے متعہد۔ اب شاہ دوم کا دور بھی انجام کو پہنچے اور عہد سلطنت انصرام کو، آخر کار قمر بادشاہ ہو اور ثابت و سیار اس کی وزارت سے صاحب جاہ۔ کوتاہ سخن کوئی کوکب باقی نہ رہے کہ خسروی و دستوری کی نوبت اس تک نہ پہنچے۔

جب سب کواکب سلطنت و وزارت سے کامیاب ہو چکیں اور ان نقود سے صاحب نصاب، یہ چرخ منتہی ہو اور یہ دور منقضی۔ اس دور اعظم کو فارسی میں ''مہین چرخ'' کہتے ہیں۔ اس چرخ کے بعد نخستین شاہ کا کوس سلطنت پھر بلند صدا ہو اور وہی ہنگامہ دستوری و خسروی کا برپا۔ اس وقت لعبت باز قدرت بازیٔ اول کی بساط کو درہم کردے اور تماثیل نخستین کو معدوم۔ ان حالات کے نقوش کو محو کردے اور ان آثار کے رسوم کو نامعلوم، نہ زید و عمرو کی منازعت ہنگامہ آرا ہو اور نہ آشنا و بیگانہ کا

لطف وعتاب پردہ کشا۔ رنگ کی دل فریبی نگاہ تماشا کی عنان کشی سے باز آوے اور بو کی عطر سائی دماغ شوق کے صلا سے ہاتھ اٹھاوے۔ نہ ناز نوک مژہ سے دشنہ گزار اور نہ نیاز جراحت سینہ سے بے قرار۔ بلبل کہاں کہ ہوائے گل سے آتش نالہ شعلہ زن ہو اور گل کہاں کہ بلبل کی خرمن سوزی کے واسطے برق افگن ہو:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

لیکن از بس کہ تکوین و ایجاد کا نقش لوح ارادہ ازلی سے، اور ابداع اور اختراع کا حرف صفحۂ مشیت لم یزلی سے یک قلم محو نہیں ہوتا، کار پرداز عالم اور مصلحت سنج امور شتابندگان دور اول سے ایک مرد اور ایک عورت بساط حیات پر جلوہ فرما رکھتا ہے، تا کہ ان دونوں برگزیدہ بارگاہ مبدع کل سے ظہور نتائج صورت پزیر ہو اور ہنگامہ گیر و دار گرم۔ وضع لاحق کی سابق سے موافق ہوگی اور طرز اخیر کی اول سے مطابق، یعنی اس دور کے آدمی وہی نام ونشان و گفتار و کردار اور وہی عادت وشکل وشمایل رکھتے ہوں کہ مردم دور سابق کو واہب حقیقی کے گنجینۂ احسان سے عطا ہوئی تھی۔ گویا ہر سفیر ملک عدم نے اپنا ساز و سامان توشک خانۂ تقدیر میں امانت رکھ دیا تھا اور ہنگام معاودت میں اس امین بے ضنت سے واپس کرلیا۔

ز بس تنگی بہ ہم افشردہ است اجزاے امکاں را
ہماں ماضی بہ استقبال ہر دل ریش می آید

ھشیار خرامان عرصۂ تحقیق کو معلوم رہے کہ ان سخن سنجان اعجوبہ طراز کی مراد یہ ہے کہ اس دور کے آدمیوں کی وضع اور طرز اور صورت وشکل مردم دور سابق سے مشابہ اور مشاکل ہوگی، نہ یہ کہ وہی افراد بعینہٖ صحرائے عدم سے بازگشت اور گل زمین وجود میں مکرر گل گشت کریں، اجزا ان اجسام متلاشی کے فراہم ہو جاویں، اور ارواح سابقہ انہیں اجساد سے ملاقی۔ حاشا و کلا کہ یہ ان کے عقیدے کے موافق محال اور ان

اجزائے ریختہ کا اجتماع اور اس علاقہ گسیختہ کا تعلق وہم وخیال ہے۔ نفوس کاملہ کہ سروشان عالم بالا کے مرتبے کو پہنچ گئے ہیں، استیفائے مراتب اور تکمیل مدارج کے بعد کس طرح پھر اجسام کثیرا سے تعلق اختیار کر سکتے ہیں۔

ابتدا اور انقطاع ادوار کی اس نسق پر ہے جو مسطور ہوئی اور آغاز و انجام روزگار کا اس طرز پر ہے جو مذکور ہوا، وگرنہ افراد انسانی کو نہ ابتدائے زمانی جلوہ گر ہے اور نہ انتہا اور کران متصور۔ اس دور کے آدمیوں کا مبداء مہ آباد نام برگزیدۂ ایزدی و مقبول جناب صمدی ہے کہ طریقۂ معہود کے موافق مردم دور سابق سے باقی رہا اور ذریات لاحقہ کے وجود کا سبب

۱۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں ''کثیف'' ہے۔

ہوا۔ انسان ضعیف البنیان دریافت نہیں کر سکتا کہ مہین چرخ اس سے پہلے کتنی دفعہ گردش کر چکا ہے اور اس کے بعد کب تک بازگشت اور معاودت میں سرگرم رہے گا، اور یہ بھی دشوار ہے کہ دور اعظم کی مدت کو محاسب ادراک کی وساطت اور دبیر وہم کے ذریعے سے احاطۂ حصر و حوزۂ شمار میں لا کر زمانہ معہود کو عدد معین سے تعبیر کرے۔ جب کہ کواکب ثابتہ ظرف تعداد میں گنجائش پزیر نہ ہوں، ان کے خسروی اور دستوری کی مدت کس طرح حصر و شمار میں آ سکے؟ اور اس زمانے کے تعین ظرف اظہار میں کیوں کر سما سکے۔ سیاران گلشن دور حال میں سے بعض کی کامرانی کا زمانہ مذکور ہوتا ہے کہ مشتاقان حقائق وسوانح جب اس احوال ندرت طراز سے آگاہ ہوویں گے، قادم لم یزل کے ساحت قدرت کو وسیع اور صانع بے ابتدا کے عرصۂ ایجاد و اختراع کو فصیح اجان کر، زمزمۂ ''قالوا بلا'' سے لب کو آشنا اور ''بیدہ ملکوت کل شئ'' کے نغمے سے زبان کو ترصدا کریں گے۔ تبارک الذی بیدہ الملک وھو علی کل شئ

قدیر۔ ہر چند مورخان پیشین اور نامہ نگاران باستانی اس حال کو ایسی تفصیل سے لکھتے ہیں کہ اگر باد بہاری نفس اور اوراق اشجار زبان ہو جاوے تو البتہ احتمال ہے کہ وہ افسانہ اتمام اور وہ قصہ اختتام کو پہنچے۔ لیکن ان اوراق کا کیا ظرف اور ان صحائف کا کیا حوصلہ؟ جس قدر مناسب مقام ہے، لوح اظہار پر مرتسم اور صفحۂ بیان پر مرقوم ہوتا ہے۔

جب دور سابق تمام ہوا اور لوح وجود پر نقوش فنا

ا۔ نول کشوری نسخے میں "فسیح" ہے۔

نے ارتسام پایا۔ ایک مرد قدسی نژاد مہ آباد نام اور ایک عورت نیک سر انجام کہ نعمت زنا شوئی سے کام یاب تھی، لباس ھستی سے عاری نہ ہوئی، اور جو کہ عالم کون وفساد کے امور کا نا منتظم رہنا ایزد کام بخش کو منظور نہ تھا، یہ نیک نہاد زمان قلیل میں اس قدر کثرت اولاد اور وفور احفاد سے لذت ستاں اور حصول نتائج سے کامران ہوا کہ شعاب جبال کے حوصلے دامن صحرا کی وسعت نے افراد ناس کی بود و باش پر تنگی کی۔ مشارب اور مطاعم اور ملابس اور تمام صنائع اور مکاسب ان کے سود اور منافع کے واسطے عقل خدا داد کی استعانت سے ایجاد کیے اور بلاد و قریے اور مساکن اور ماوا آباد طوائف مردم کو چار قسم قرار دیا:

قسم اول:

موبد و زہاد کہ آئین دین وقوانین ملت کی محافظت حراست میں سرگرم رہیں اور ان کا لقب برما اور برمن اور ہورستار ٹھہرایا۔

قسم دوسری:

بادشاہ اور پہلوان کہ جہاں داری وحکومت ان کی ذات سے منتظم اور شیرازۂ امور بلاد ان کے رشتۂ عدالت ومحابت سے ملتیم رہے اور ان کا لقب چترمان اور رچترمن اور چتری

اور نورستار مقرر کردیا، کیوں کہ یہ لوگ خداوند چتر ہوتے ہیں اور چتر سرداری اور ناموری کی علامت ہے۔

قسم تیسری:

کشاورز اور اہل زراعت اور پیشہ ور اور ارباب حرفت۔ ان کا نام تجویز کیا کیوں کہ باس بسیار کو کہتے ہیں اور یہ فرقہ سب فرقوں سے کثرت میں زیادہ ہوتا ہے اور باس آبادی کو بھی کہتے ہیں اور آبادی ممالک انہیں کے سبب سے ہوتی ہے اور ان کو سورستار بھی کہتے ہیں۔

قسم چوتھی:

ایسے آدمی کہ پیش کاری اور خدمت گاری کے کام کو سرانجام دیں اور نوکری و ملازمت کے امور کو انتظام۔ ان کا لقب سودین وسوی وسود تشخیص کیا۔ کس واسطے کہ یہ فرقہ سود وتن آسانی کا سبب اور آسائش خلائق کا باعث ہے اور ان کو رورستار بھی کہتے ہیں۔ بعد اس کے نوکر اور بادشاہ اور خادم اور آقا میں فرق پیدا ہوا اور خرد و بزرگ میں تفاوت ہویدا۔

تقریباً یاد آ گیا کہ تواریخ ہنود میں بھی ان چار طائفہ کا نام تلفظ میں انہیں اسامی کے قریب ہے، اگرچہ معنی کے اعتبار سے بعض میں مخالفت ہے یعنی طائفۂ اول کو برھمن اور دوسرے کو چھتری اور تیسرے کو بیش اور چوتھے کو شودر کہتے ہیں۔ اول شین معجمہ اور آخر رائے مہملہ۔

سخن مختصر یزدان سخن آفرین نے مہ آباد پر ایک کتاب نازل کی ''دساتیر'' نام کہ جمیع علوم وفنون اور ہر زبان کے لغت اس میں مرقوم تھے اور ایک زبان اور تھی کہ اہل روزگار سے کسی کی زبان اس سے مشابہ نہ تھی۔ مہ آباد نے اصناف امم کو ایک ایک زبان تعلیم کر کے اطراف عالم میں جس جگہ مناسب ولائق سمجھا بھیج دیا، اسی واسطے ہر ملک کی زبان جداگانہ اور ہر دیار کی گفتگو علیحدہ ہوگئی لیکن راقم تذکرہ نے کتاب ''دساتیر'' کو دیکھا اور ابتدا سے انتہا تک ورق ورق کی سیر کی اصل اس کتاب کی ایک صحیفہ ہے آٹھ سات ورق کا

کہ مجوس کے اعتقاد میں یزدان بے ہمال نے مہ آباد پر نازل کیا۔ باقی تیرہ صحیفے اور ہیں کہ جی افرام سے لے کر ساسان پنجم تک ہر ایک کے واسطے نازل ہوئے اور ایک پندنامہ کہ سکندر ابن داراب کے واسطے ابراھیم زردشت کی دعا سے زردشت کے پاس نازل ہو کر شاہان ایران کی تحویل میں رہا اور وقت معہود میں سکندر کو پہنچا۔ یہ صحائف و پندنامہ صحیفہ مہ آباد کے ساتھ شامل ہے۔ اب مجموعہ صحائف و پندنامہ کو ''دساتیر کہتے ہیں''۔ زبان اس کی تو البتہ کسی زبان سے مشابہ نہیں، اسی واسطے اس کو ''فراتین نواد'' یعنی آسمانی زبان کہتے ہیں لیکن نہ مختلف زبانوں پر مشتمل ہے اور نہ علوم متنوعہ پر محتوی، ہاں کوئی کوئی فقرہ بے شبہ مسئلۂ حکمت پر اشتمال رکھتا ہے۔

ساسان پنجم نے جو ان سب کا ترجمہ زبان فارسی میں کیا، ساسان نخست کے صحیفے میں بیش تر اور باقی صحائف میں بعض بعض جگہ براھین حکمیہ کو ایراد کیا ہے، سو وہ ساسان کی عبارت ہے نہ کتاب ساوی، مگر یہ کہ وہ جلد علیحدہ ہو کہ علوم گوناگوں اور لغات مختلفہ پر مشتمل اور تقالیب روزگار اور تصاریف ادوار سے نایاب ہے۔ اس جملۂ معترضہ کے بعد لکھا جاتا ہے کہ بعد مہ آباد کے تیرہ اور پیغمبر مبعوث ہوئے کہ ان کو بھی آباد کہتے ہیں۔ ترجمہ آباد کا پیغمبر ہے، اسی واسطے پیغمبر نخست کہ مرتبے میں ان سب سے بزرگ تھا، مہ آباد کے نام سے موسوم ہوا۔ پیغمبران مذکور اور وخشوران مسطور کے بعد ان کے فرزندوں نے مسند ھدایت اور وسادۂ ارشاد پر تمکن پایا اور ہمیشہ اپنے اوقات کو رہنمائی خلق و رضامندئ خالق میں صرف کیا۔ مہ آباد کے ذریات کہ ان کو مہ آبادی کہتے ہیں، ایک مدت تک اسی راہ میں گام زن اور اسی طریق میں سرگرم رہے اور عالم کو عدل و داد کے ساتھ آراستہ رکھتے تھے۔ ایسا شخص کہ آبادیوں کی سلطنت و حکومت کا سلسلہ اس پر منتہی ہوا، آباد آزاد نام رکھتا ہے۔ اتفاقاً ترک و تجرید کا شوق اس کا دامن گیر ہوا اور کاروبار سلطنت سے دفعتہً ہاتھ اٹھا کر گوشۂ عزلت اختیار کیا۔ اس کے عزلت گزیں ہوتے ہی انسان حیوان سیرت ہو گئے اور آدمی وحوش سریرت۔ باہم جدال و نزاع شروع ہوئے اور

خون ریزی نے ایسا شیوع پایا کہ اگر آسیا سیلاب خون سے گردش کرتی، کچھ عجب نہ تھا۔ اس وقت آبادیوں کا عہد سپری اور ان کی دولت و اقبال کا زمانہ منقضی ہوا۔ اس خاندان رفیع الشان میں سوزاد سال تک دولت و حشمت ملازم در اور حکومت و سلطنت فرماں بر رہی۔ زاد ایک مرتبہ ہے مراتب اعداد سے، خامہ خام رقم اس کی تفصیل کا متعہد اور قلم چابک نگار اس کی توضیح میں سرگرم ہے۔

مخفی نہ رہے کہ اس طائفے کی اصطلاح میں سال دو قسم کا ہے۔ فرسال اور کرسال۔ فرسال وہ ہے کہ کوکب جب بروج دوازدہ گانہ کو ایک بار طے کرے اس کو ایک دن شمار کریں اور ایسے تیس دن کو مہینا اور ایسے بارہ مہینے کو برس، مثلاً دورہ زحل کی مدت تیس برس میں اتمام پاتی ہے اور بارہ برجوں کی سیر اختتام۔ پس تیس برس کو ایک دن شمار کرتے ہیں اور ایسے تیس دن کو کہ نو سو سال متعارف ہوتے ہیں، ایک مہینا اور ایسے بارہ مہینے کو کہ دس ہزار آٹھ سو برس متعارف ہیں، ایک برس اعتبار کرتے ہیں اور اسی پر قیاس کیا چاہیے اور کوکب کے دورے کو اور ستارے کے ایک دورے کا نام کرسال ہے۔ پس جس مدت تک ہر برج میں سیر کرے، وہ مدت ایک مہینے کی قرار دی جاتی ہے، مثلاً زحل بارہ برجوں کو تیس برس میں طے کرتا ہے اور ہر برج کو اڑھائی برس میں، پس اس حساب کے موافق تیس سال ایک کرسال ہے اور اڑھائی برس ایک مہینا اور اسی پر قیاس کیا چاہیے اور کواکب کے دورے کو، اور جس طرح سال کو فرسال اور کرسال کہتے ہیں، مہینوں اور دنوں کو فرماہ اور فرروز اور کرماہ اور کرروز کہتے ہیں۔ جب یہ مہم فیصل ہوئی تو اب سنا چاہیے کہ جس وقت دس ہزار آٹھ سو برس متعارف کہ زحل کا ایک فرسال ہے، ہزار میں ضرب دے جائیں اور اس کا حاصل ضرب کہ ایک کروڑ آٹھ لاکھ برس متعارف ہیں، پھر ہزار میں ضرب کریں تو اس کے حاصل ضرب کو کہ دس ارب اسی کروڑ سال متعارف ہیں فرد کہتے ہیں اور ہزار فرد کو ورد اور ہزار ورد کو مرد اور ہزار مرد کو جاد اور تین ہزار جاد کو واد اور دو ہزار واد کو زاد کہتے ہیں۔

بعد اس کے مرقوم ہوتا ہے کہ جب عالم کا حال تباہ اور جہان کا طور خراب ہو گیا، چند آدمی کہ ہدایت الٰہی اور اعت خرد سے ستودہ کرداری اور راست گفتاری سے کام یاب اور بزرگ آبادیوں کی کتاب سے بہرہ مند تھے جی افرام کے پاس گئے۔ اس مرد سنجیدہ کو آباد اراد کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آباد اراد کے بعد اس کے کمال کو کوئی نہیں پہنچتا۔ گویا آباد اراد جی افرام کا پدر معنوی ہے۔ وگر نہ اس سے اس کے عہد تک مدت مدید کا فاصلہ اور زمانہ ممتد کا تفاوت ہے اور یہی حال ہے شاہ کلیو وغیرہ کا، جن کا احوال مذکور اور صفحۂ اظہار پر مسطور ہوتا ہے۔ آبادیوں کی زبان میں 'جی' پاک کو کہتے ہیں، جو کہ اس کی پاکی و طہارت حد کمال کو پہنچ گئی تھی اس واسطے 'جی' کے ساتھ ملقب ہو گیا۔ بہر کیف ان لوگوں نے اس سے التجا کی کہ اپنے وجود سراپا جود سے تخت حکومت کو مشرف کر اور ارشاد و ہدایت پر کمر باندھ کہ ان گم کردہ راہوں کی اصلاح جلوہ گر نہ ہوگی، جب تک تو ہمت خیر طلب کو مصروف نہ کرے، اور ان بدکرداروں کا راہ پر آنا متصور نہیں، جب تک تو عنان توجہ معطوف نہ کرے، اور ہدایت و ارشاد کے فضائل آبادیوں کی کتاب سے اس کے سامنے نقل کیے، لیکن ازبس کہ اہل روزگار کے اختلاط سے دل گرفتہ تھا، اس بار گراں کا تحمل ناگوار ہوا اور ان کے التماس کو قبول نہ کیا۔ ناگاہ سروش مبارک کی کہ ایہ طائفہ بہمن اور اہل اسلام جبریل کہتے ہیں، پیام ایزدی لایا اور اس امر کے سرانجام میں حضرت حق کی رضامندی کا مژدہ سنایا۔ ناچار فرمان پزیر ہوا اور اہل روزگار کے حق میں دست گیر۔ اس کے تابعین کو 'جیان' کہتے ہیں، جیون کا سلسلہ جس پر منقطع ہوا، اس کا نام جی الاد ہے۔

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''کہ'' نہیں ہے۔

اس نیک نہاد نے بھی ترک دنیا کا قصد کیا اور آشنا و بے گانہ سے روپوش ہوا۔ رفقا اور ندیموں نے جی الاد کو نہ مشکوے خسروی میں پایا اور نہ عبادت گاہ میں، برہم ہوئے اور اہل

عالم کا کارتباہ۔ جیون کے خاندان میں ایک اسپار سلطنت نے قیام کیا، اس اصطلاح سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔ سو ہزار کو سلام کہتے اور سو سلام کو سار اور سو سار کو اسپار اور سو اسپار کو رادہ اور سو رادہ کو آرادہ اور سو آرادہ کو راز اور سو راز کو آراز اور سو آراز کو لی آراز کہتے ہیں۔ مردم پرہیز گار نے جب جہان کا حال زبوں دیکھا شائی کلیو سے کہ جی الاد کا فرزند معنوی اور خلف روحانی تھا، التجا کی، اس نے قبول کیا اور انتظام جہاں میں گرم ہوا۔ اس کے تابعین کو شائی کہتے ہیں۔ شائیوں کے سلسلے کا اخیر شائی مہبول ہے۔ ان کے خاندان میں ایک سار تک سلطنت رہی اور سار کا حال مراتب کی تفصیل میں مرقوم ہوا۔

مختصراً شاہ مہبول کے بعد یاسان فرمان الٰہی سے مسند ہدایت پر متمکن ہوا۔ یاسانیوں کے سلسلے میں سب سے اخیر یاسان اجام ہے۔ ان کی سلطنت ایک کم سو سلام تک ممتد ہوئی۔ یاسان اجام کے بعد کیومرث کو اس کو گل شاہ کہتے ہیں، فرمان ایزدی سے انتظام عالم میں مصروف ہوا۔ اس کو گل شاہ اس واسطے کہتے ہیں کہ جب سلطنت کی نوبت کیومرث تک پہنچی، عمارت و زراعت و باغ وغیرہ سے سوائے گل، یعنی زمین کے کچھ باقی نہ تھا۔ جو کہ سوائے زمین کے اس وقت اس کے تصرف میں کچھ نہ تھا، اس لقب سے ملقب ہوا، یعنی بادشاہ زمین۔ اور جو کہ مردم روزگار کی تربیت و اصلاح میں پدر مشفق کی طرح سے سعی کی تھی، اس کو پدر مردم و ابو البشر بھی کہتے ہیں۔

اس خاندان کے بادشاہ چار فرقے ہیں۔ پیش دادی، گانی، اشکانی، ساسانی، اور ان سب سے اخیر پسر شہریار یزدجرید ہے کہ بعد اس کی سلطنت فارس فرق اسلامیہ کے تصرف میں آئی اور ملک و مال چندیں ہزار سالہ غازیان جلادت شعار کے نصیب ہوا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ ان سلاطین کی سلطنت چھ ہزار چوبیس برس پانچ مہینے تک ایک طرح پر باقی رہی، نیر اقبال تاباں اور کوکب دولت درخشاں رہا، آخر غیرت الٰہی نے اس نیر کو خسوف ابدی اور اس کوکب کو احتراق سرمدی سے بے نور کر دیا اور آفتاب جہاں تاب شریعت غرا اور خورشید عالم افروز ملت بیضا کو ایسا روشن کیا کہ شبستان گیتی کی رونق و بہائے

فروغ روز سے باج لیا۔ نورہدایت، فروغ ایمان سے تاریکیٔ جہل وظلمت کفر روز بروز محو ہوتی جاتی ہے۔ یکادزیتھایضی ولولم تمسسہ نارنورعلی نور یہدی اللہ لنورہ من یشاء

آں آفتاب دیں کہ ز نور ھدایتش
خورشید شرع بر فلک اشتہار تافت

ہر چند حساب بے حساب ہنود سے خرد کو سرگردانی ہے اور عقل کو پریشانی ہے لیکن جب اس سلسلۂ غیر متناہی اور اس سیر لاینقطع کا تصور خاطر دشوار پسند کے نصب العین ہوتا ہے، استعجاب غریب بہ ہم پہنچتا ہے۔ آبادیوں کی سلطنت کی مدت سوزاد سال مقرر ہے اور جیسے اول مذکور ہوا دس ارب اسی کروڑ برس کا نام فرد ہے اور جب اس کو ہزار میں ضرب کریں تو اس کے حاصل ضرب کا نام ورد، اور ورد کے ہزار میں ضرب کرنے سے مرد، اور وہ اسی ضرب سے جاد اور ہزار جاد سے واد حاصل ہوتا ہے، اور دو ہزار واد کو زاد کہتے ہیں۔ دس ارب اور اسی کروڑ برس ان ضروب کثیرہ کے بعد کس شمار کو پہنچتے ہیں اور یہی حال ہے اور سلطنتوں کا جو آبادیوں کے بعد مذکور ہوئیں۔ کون سا عاقل تجویز کر سکتا ہے کہ ایسے خاندان موجود ہوئے ہوں کہ ان کا عہد دولت و اقبال اس امتداد کو پہنچا ہو۔ عمر برھما اس دریائے ذخار کے ایک قطرے میں غرق اور اس ہنگامے کے زور و شور کے آگے بے نام و نشان ہو جاتی ہے۔ یہ شعر اسی مقام کے مناسب ہے:

لبے در شگفتے نمودن طواف
عنان سخن را کشد در گزاف

اگر خیال کیا جاوے کہ یہ سب امور اختلاط عقل اور مالیخولیا کے نتائج سے ہیں، فرزانگان ایران دیار کی دانش وری اور حکمت پیشگی کہ اس کے فروغ کے سامنے روشن طبعان یونان کی حکمت اشراق کا چراغ تار اور اس کی استقامت کے مقابل مشائیت کی راہ ناھموار ہے، ابا کرتی ہے کہ ہرگز ایسے حکمت اندوزان کامل خرد لغو سخن سرا نہیں ہو سکتے اور قطعاً ایسے صفا کیشان راست اندیش حرف پوچ و پادر ہوا زبان پر نہیں لا سکتے۔ حکمائے

فارس کے دانش نامے ہر چند اس زمانے میں یک قلم نایاب ہیں، لیکن چند رسائل مختصر کہ نامہ نگار کی نظر سے گزرے، ان دانش مندان خردور کی عظمت شان اور رفعت مکان پر شاہد عدل و گواہ صادق ہیں۔

رسالہ ''خویش تاب'' نام میں کہ موبد ہوش کی تالیف اور ترجمہ ہے، اس رسالے کا کہ حکیم بانع رس موبد صبح نفس زبدہ شاگردان ساسان پنجم پیشتاب نے اثبات حضرت واجب الوجود میں خسرو پرویز کے امر سے مرتب کیا تھا، ساسان پنجم کے اوصاف میں مرقوم ہے کہ ایک حکیم دانش ور نے دارالملک مصر سے ساسان پنجم کے مناظرے کے واسطے سفر کیا اور ساسان آباد میں کہ اس بانع خرد کا مقر اور اس نادرہ فن کا مستقر تھا وارد ہوا۔ جس خانقاہ میں ساسان درس و تدریس کرتا تھا، وہاں کے دربان کی بانوے خانہ ایک کنیز رکھتی تھی۔ اتفاقاً وہ حکیم اس رات کو اسی کنیز کے شوہر کے پاس مہمان ہوا اور یہ نہ جانتا تھا کہ اس عورت کو ساسان سے کیا علاقہ ہے۔ مادر کنیز نے اس حکیم سے پوچھا کہ تو کس شہر میں رہتا ہے اور اس دیار میں کس ارادے سے وارد ہوا، چاہیے کہ انسان کو سفر خور دیعنی حرکات بدنی سے یہ غرض ہو کہ اس سیر و حرکت کے ذریعے سے سفر آخرت کا زاد راہ تحصیل کرے نہ زخارف دنیوی کہ وہ سراسر ناپائدار ہے اور اس کا تعلق حضرت مبداء تک پہنچنے سے مانع ہے۔ حکیم نے جو اس تقریر کو سنا، متحیر ہوا اور اس کو ماہر علوم اور جامعۂ جہوم سمجھ کر یکا یک متحیر رہ گیا اور پوچھا کہ واجب کا فعل قدیم ہے، یا حادث؟ عورت نے جواب دیا کہ حادث وہ ہے کہ زمانی ہو اور زمانہ فلک الافلاک کی حرکت کو کہتے ہیں، جو کہ واجب اس سے برتر ہے تو چاہیے کہ واجب قدیم ہو۔ حکیم نے پھر پوچھا کہ واجب تک بھی فنا راہ پا سکتی ہے؟ عورت نے کہا نہیں، کس واسطے کہ ممکنات موجود ہیں اور یہ بدون فاعل کے موجود نہیں ہو سکتے، کہ معلول بدون علت کے رہ نہیں سکتا'' حکیم نے اعتراض کیا کہ باپ بیٹے کی علت ہے اور باپ کے بعد بیٹا باقی رہتا ہے۔ عورت نے کہا کہ باپ بیٹے کے سبب کا جزو ہے، نہ علت، کس واسطے کہ اگر مادر سترون اور عقیمہ ہو، بیٹا باوجود باپ کے

موجود نہیں ہوتا اور واجب الوجود علت تامہ ہے ممکنات کی، جیسے آفتاب علت ہے روشنی کی ۔حکیم نے اول میں سوچا کہ جب ایک عورت فہم و ادراک میں یہ پایہ رکھتی ہے، ساسان سے مناظرہ کرنا میری حد سے زیادہ ہے، اور ساسان کی خدمت میں عقیدت و ارادت سے متوجہ اور اس سے بہرہ اندوز ہوا۔

اگرچہ یہ مقالات ایسے نہیں کہ ان سے ساسان پنجم کی منزلت کا استدلال کیا جاوے، لیکن مقصود یہ ہے کہ ساکنان ساسان آباد ساسان کے قرب و جوار سے فیض یاب ہو کر اس مرتبۂ بلند اور اس پایۂ ارجمند کو پہنچ گئے تھے، خاصان درگاہ اور مخصوصان بارگاہ کا تو کیا ذکر ہے، یہاں تک ترجمہ ہے اس کتاب دانش خطاب کا۔ اس قصۂ طویل کے کہنے سے راقم کی غرض یہ ہے کہ ایسے دانش پژوہان والا خرد کہ ان کی دانش و حکمت کا پایہ اقاصی و اوانی کے نزدیک مسلم ہو، اس گروہ حکمت پژوہ کا سرسری و بے اصل حرف سرا ہونا محل تردد اور مقام توقف ہے اور اگر یہ کہیں کہ فی الواقع نہ مہ آباد عرصہ امکان میں موجود ہوا اور نہ مہ آبادی اور

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''نے'' نہیں ہے۔

جی افرام وغیرہ کے توابع حلیۂ ہستی سے محلی ہوئے ان کا ذکر افسانہ محض اور افتراے صرف ہے، کیا عجب ہے کہ کسی مصلحت سے اس قدر حرف و حکایت موضوع ہو گئے اور ایسے طویل لاطایل قصے مصنوع تو یہ تاویل نہ تسلی افزا ہے اور نہ تسکین بخش۔ مہ آباد اور سائر وخشوران آباد نام سے لے کر جی افرام وغیرہ تک ہر ایک سے حکمت مشائی و اشراک میں کتب مبسوطہ یادگار اور متداول ارباب شہر و دیار ہیں۔ اگر وہ لوگ موجود اور ان کے کلام سے دفتر دفتر مملو اور وہ نسخے مدارس ارباب دانش میں فراہم نہ ہوتے، متاخرین کی کتابیں ان مسائل سے کیوں کر مالا مال ہوتیں اور اقوال بے شمار ان کے صحائف میں

کہاں سے منقول ہوتے۔

تین رسالے راقم کے پاس ہیں، ایک رسالہ ''خویش تاب'' کہ اس کا حال اول مذکور ہوا۔ دوسرا ''زردست افشار'' داد بویہ ابن ہوش آئین کا کہ ترجمہ اس رسالے کا حکیم ہوش کوئی شاگرد بے واسطہ ساسان دوم نے حکمت الٰہی میں ھرمزا بن نوشیروان کے امر سے تصنیف کیا اور خسرو پرویز نے براھین کشفیہ ونظریہ کی دریافت کے واسطے حکیم آذر کشسپ سے پڑھا۔ تیسرا زندہ رود خوشی خویش کا کہ ترجمہ ہے اس رسالے کا کہ حکیم زندہ آزرم نے نفس ناطقہ کی معرفت میں خسرو پرویز کے عہد میں جمع کیا اور ''چشمۂ زندگی'' نام رکھا۔ ان رسالوں کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمائے فارس کے علم نے حکمت یونان کو آب خجالت میں غرق کر دیا ہے، نہ افلاطون کو ان کے سامنے یارائے زباں درازی نہ ارسطو کو ان کے روبرو مجال سخن طرازی۔ ان رسالوں میں انہیں دانش کیشان قرون دور و دراز کے اقوال بےحد وشمار منقول اور رھبر فہم وادراک اور قائد نفوس وعقول ہیں۔ اور اگر یہ کہا جاوے کہ البتہ وہ لوگ بھی بزم وجود میں جلوہ طراز ہوئے اور ان کی کتابیں بھی مجالس اہل ہوش میں موجود، لیکن درازئ مدت اور طول زمانہ سخن سازی محض اور افسانہ طرازی صرف ہے تو پیش گاہ خیال میں یہ صورت جلوہ گر ہوتی ہے کہ قطع نظر اس سے کہ حکمت طرازان صاحب وقار نے زبان حقایق بیان کو ناحق ونا روا ایسے سخن بےصرفہ سے آشنا کیا کہ باقل وابن ھنق کو بھی اس کے قبول میں توقف کے سوا کچھ متصور نہ ہو۔ دقیقہ سنجان بالغ رس کو کہ دعوئ بے دلیل کو صحیفۂ قبول میں بار نہیں دیتے کون سی ضرورت دامن گیر ہوئی کہ ایسے امور سرسری کو بے توقف وتردد مان لیا اور بے چون و چرا مسلم رکھا۔ اب تک کوئی حجت مقبول اور دلیل معقول بہم نہ پہنچی کہ سائل کی تسلی کے موجب اور مجیب کی تحقیق پر دال ہو۔ نہ انکار اس وادی میں پیش جاتا ہے اور نہ اقرار اس بزم میں بار پاتا ہے، طرفہ تماشا ہے:

زنی بہ تیغم و فریاد از شریعت عشق

کہ آرمیدن کفر است و اضطراب گناہ

سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

جنگ ہفتاد و دو ملت ھمہ را عذر بنہ

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

مصنف ''نفائس الفنون'' نے ''تاریخ'' خطائی سے نقل کیا کہ عہد آدم سے سات سو پینتیس ھجری تک آٹھ سو تر سٹھ دن اور نو ہزار آٹھ سو برس منقضی ہوئے ہیں اور دس ہزار برس کو دن کہتے ہیں اور حساب متعارف کے موافق وہ سب دن اور اعداد باقی چھیاسی لاکھ اور انتالیس ہزار آٹھ سو برس ہوتے ہیں۔ بعض اجلہ کرام اور اکابر عظام کا قول اسی منظر سے جلوہ نما اور اسی پردے سے چہرہ کشا ہے۔ امام ناطق بہ حق جعفر صادق سے منقول ہے کہ حضرت ابو البشر علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے عرصہ عالم میں کئی ہزار آدم نے خرام کیا ہے اور شیخ ابن عربی نے کہ کبار اولیا و عظام ارباب صفا سے ہے لکھا ہے کہ کچھ دور نہیں کہ ھفتہ ربانی، یعنی سات ہزار برس کے بعد کہ عبارت ہے سیارات سبعہ کی مدت سلطنت سے، ایک آدم کی نسل منقطع ہو جاوے اور دوسرا آدم عرصۂ وجود میں جلوہ فرماوے۔

شیخ موصوف اور شیخ سعد الدین حمویہ کی تصانیف سے منقول ہے کہ روز ربانی ہزار برس کا ہوتا ہے اور روز الٰہی پچاس ہزار برس کا، لیکن نہ انقطاع نسل کی کیفیت مذکور ہے اور نہ دوسرے آدم کی توالدی یا تولدی ہونے کا حال مسطور۔ لیکن ممکن ہے کہ کبھی اسباب سماوی سے طوفان حادث ہو اور وہ زمینیں کہ عمارت کی صلاحیت رکھتی ہیں اور حیوانات متنفسہ کی مسکن ہوسکتی ہیں، قاطبتہً پانی میں غرق ہو جائیں اور ایک متنفس باقی نہ رہے، اس سلسلہ توالد اور تناسل کا منقطع ہو جائے گا۔ اور جو کہ مصلحت تقدیر ایجاد و تکوین میں داعی اور حدوث ابدان اور تعلق ارواح میں ساعی ہے، حفظ نوع کے واسطے اب انسان تولد سے حادث ہوں گے نہ توالد سے اور نوع بشر کی اس طرح سے موجود ہونے کی امتناع پر کوئی

برھان نہیں ہے بلکہ اکثر حیوان کا تولد معاینہ ہے، مثلاً موے آدمی سے مار، انجیر سے عقرب، اور کلوخ سے موش، اور باران سے غوک۔ اور اس بات سے کہ مدت مدید سے آج تک حدوث انسان اس وضع پر وقوع میں نہیں آیا، لازم نہیں آتا کہ مطلقاً نہ ہو، اس واسطے کہ شاید یہ امر کسی ایسی وضع معین پر موقوف ہو کہ اس کا تکرر سال ھاے دراز میں صورت پزیر ہو، اور کیا عجب ہے کہ عالم میں ایسے حوادث مدت دراز کے بعد کئی دفعہ ظہور میں آئے ہوں، بلکہ جو تو الد اور تناسل حرکات ارادیہ پر موقوف ہے اور حرکات ارادی ضروری نہیں، پس حفظ نوع کے واسطے انسان تولدی کا قائل ہونا ضرور رہوا۔

یہ مطلب حاصل ہے شیخ الرئیس بو علی سینا کے قول کا کہ مصنف ''اخلاق جلالی'' نے ''شفا'' سے نقل کیا ہے۔ اس صورت میں کیا عجب ہے کہ ان حوادث سے یک لخت ایک سلسلہ منقطع ہو کر انسان تولدی سلسلہ آخری کا مبداء مقرر ہو جاوے۔ یہ تقریر تعدد آدم اور مدت متطاولہ میں اس سلسلے کے منقطع ہونے کی توجیہ ہے، اور انقطاع نسل کی کیفیت اور آدم کی تولدی ہونے کے تئیں سلسلہ اس کلام دور دراز کا دال ہے، صرف اشرف مخلوقات عالم امکان یعنی انسان بلند مکان کے کون وفساد پر، نہ اول مخلوقات، اور رواسطہ اولی خالق مخلوق کی ایجاد پر۔ پس دانش اندوزان ایران دیار خردمندان یونان زمیں سے اتفاق رکھتے ہیں کہ کار پرداز مصالح کائنات نے بے واسطہ عقل اول کو موجود کیا اور اس کے توسط سے دوائر افلاک سے لے کر مرکز خاک تک لوح وجود پر مرتسم ہوا اور تکوین وایجاد کا سامان منتظم۔ جو کہ اس مبحث کا آغاز گرم نفسان آتش کدہ فارس کے اعتقاد پر مبنی ہے، اس مقصد کے دلائل اور براھین بھی انہیں کی کتب سے منقول ہوں تو اقتضائے مقام سے انسب اور تقاضائے محل کے اقرب ہے۔ ''ناگزیر زردست افشار'' سے کہ عقول عشرہ کی بحث میں رسالۂ عجیب اور عجالۂ غریب ہے، دو چار سطر صفحۂ بیان پر مرقوم ہوتی ہیں۔

باداں ابن شہنشاہ فلک جاہ جمشید خورشید کلاہ نے اپنی تصانیف میں لکھا ہے کہ

واجب تعالیٰ ایسا واحد ہے کہ اس میں اصلاً تکثر کو راہ نہیں، نہ ذاتاً نہ صفاتاً۔ ذاتاً اس واسطے کہ تکثر عبارت ہے ترکیب سے، ترکیب کا مستلزم احتیاج ہونا عیاں ہے اور ذات میں احتیاج کا ہونا مستلزم امکان۔ اور صفاتاً اس واسطے کہ اگر اس کے واسطے کوئی صفت ہوتو جو کہ حضرت واجب الوجود کل اشیاء کا فاعل ہے اپنی صفت کا فاعل بھی چاہیے وہی ہو اور موصوف اپنی صفت کا قابل اور منفعل ہوتا ہے، پس واجب بھی صفت کا قابل اور منفعل ہوا۔ فاعلیت کی حیثیت سے مفعول کو مستلزم ہے اور قابلیت کی حیثیت سے مستلزم نہیں نہیں اور یہ محال ہے کہ ایک چیز کسی شے کو مستلزم ہو اور وہی مستلزم نہ ہو۔

پس اس دلیل سے معلوم ہوا کہ حضرت آفریدگار تقدس وتعالیٰ واحد حقیقی ہے اور اس میں کسی طرح سے ''نہ بیشی اور ا'' نہ کثر کو بار ہے اور نہ کثرت اور تعدد کو گزار۔ جی افرام لکھتا ہے کہ نوالانوار یعنی عرض حضرت آفریدگار سے سوائے نور کے جوہر ظلمانی یا ھیت ظلمانی یعنی عرض حاصل نہیں ہوسکتا، اور اگر ظلمت کا حصول ممکن ہوتو جو کہ نور کا اقتضا اور ہے اور ظلمت کا اور، چاہیے ان دونوں اقتضائے مختلف کے واسطے اس ذات مقدس میں دو جہت ہوں، اور اس صورت میں لازم آوے گا کہ نورالانوار موجب نور اور موجب ظلمت سے مرکب ہو اور یہ محال ہے، کیوں کہ وہ بسیط حقیقی ہے اور اس کی ترکیب کسی طرح سے صورت پزیر نہیں۔ پس نورالانوار سے حصول ظلمت کا بلا واسطہ ممکن نہ ہوگا۔ اس کی تقریر اور طرح سے یہ ہے کہ نور اپنے نور ہونے کی حیثیت سے غیر نور کا اقتضا نہیں کرتا اور اگر کرے تو چاہیے کہ دونوں کے اقتضا کی جہت علیحدہ ہو، کیوں کہ جب تک جہت اقتضا نہ ہوگی، اقتضا کا اختلاف محال ہے۔ اور جب اس نے غیر نور کا اقتضا کیا تو لازم آیا کہ اس میں دو جہت ہوں، اور جو کہ بسیط ہے دو جہتیں ہونا بھی اس کا محال ہے۔ یہ برھان دو چیز کے استحالے میں کافی ہے، خواہ دونوں نور ہوں، خواہ دونوں ظلمت، خواہ ایک نور ہو اور ایک ظلمت۔ با دان خردور

دانش پرور کہتا ہے کہ اول واجب تعالی سے عقل پیدا ہوئی، کیوں کہ ثابت ہو چکا ہے کہ واجب الوجود واحد حقیقی ہے اور اس سے ایک چیز کے سوا صادر نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک سے زیادہ صادر ہو تو اس کی ذات میں تکثر لازم آوے۔

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں ''بیشی اور تکثر'' ہے۔

پس حضرت واجب الوجود سے جو اول خلعت وجود سے مشرف ہوگا، ایک جوہر ہوگا مادے سے مجرد یعنی عقل صرف، فارسی میں اس کو خرد ناب اور ہوش تنہا کہتے ہیں اور یہ بات اپنے محل میں مذکور ہو چکی ہے کہ مقولے دس ہیں نو عرض ہیں اور ایک جوہر اور یہ ہو نہیں سکتا کہ موجود اول عرض ہو، کس واسطے کہ عرض کا وجود جوہر سے بعد ہوتا ہے، پس محال ہے کہ جوہر سے پہلے موجود ہو اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ جوہر کہ اول موجود ہوا غیر عقل ہو کیوں کہ جوہر پانچ چیزیں ہیں: مادہ اور صورت اور جسم اور نفس اور عقل۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جوہر مادہ ہو یا صورت، اس واسطے کہ جسم مرکب ہوتا ہے اور مرکب کا صدور واحد حقیقی سے محال ہے اور نفس بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ وجود نفس کا جسم سے پہلے ممکن نہیں۔ جب یہ چاروں چیزیں نہ ہوئیں تو ناگزیر وہ جوہر کہ موجود اول اور صادر نخست ہے، عقل ہی ہوگی اور حکیم جاماسپ ابن باذان نے اس مطلب کی تحقیق میں تقریر دور و دراز کی ہے کہ یہ مختصر اس کی گنجائش کے سزاوار نہیں، لیکن بعد طول کلام کے لکھتا ہے کہ اس تقریر سے ثابت ہوا کہ معلول اول ایسا ممکن موجود ہے کہ نہ جسم ہے نہ جسم کا جزء اور نہ وجود اور تاثیر میں جسم یا جسمانی کا محتاج ہے اور یہ نہیں ہے مگر عقل۔

ایک اور محل میں مرقوم کیا ہے کہ جب ثابت ہوا کہ مبداء اول حضرت واجب جل قدرتہ سے پہلے پہل عقل اول صادر ہوئی۔ پس اب سننا چاہیے کہ عقل اول میں

تین جہت موجود ہوئیں۔ اول وجود نفسی۔ دوم وجوب بالغیر، سوم امکان ذاتی۔ بہ اعتبار وجود نفسی کے کہ کمال شرافت سے مشرف ہے، عقل ثانی کو موجود کیا کہ وہ بھی بہ اعتبار ذات اور صفات کے مادے کی احتیاج کے نقص وعیب سے پاک ہے اور وجوب بالغیر ہر چند اس اعتبار سے کہ غیر کے سبب سے ہے، قدرے خساست سے خالی نہیں، لیکن جو کہ بہ سبب وجوب کے جوہر شرافت رکھتا ہے، اس کے وسیلے سے فلک الافلاک کا نفس موجود کیا کہ وہ بھی اگر چہ بہ سبب اس کے کہ کمال اور وجود کے حصول میں مادے کا محتاج ہے، نوعی خساست رکھتا ہے، لیکن جو کہ بذاتہ مادے کا محتاج نہیں ہے، صاحب شرافت ہے اور امکان ذاتی کی وساطت سے کہ صفات فرو مایہ کا منبع اور حاجات خسیسہ کا چشمہ ہے، اسی آسمان کا جسم آمادہ کیا کہ وہ ذات اور صفات میں مادۂ ھیولانی اکا محتاج ہے۔ اسی طرح ان تینوں جہت کے اعتبار سے ایک ایک عقل اور نفس اور تن آسمانی مہیا کیا۔ عقل وہم کہ آسمان اخیر سے فراتر ہے، عناصر بسیطہ کو صورتیں اور اعراض اور صفات مختلفہ کا اضافہ کرتی ہے، کیوں کہ اس میں حرکات افلاک اور اتصالات کواکب اور اختروں کے اوضاع سے بہت استعدادیں حاصل ہوئی ہیں اور اس افاضے کے اعتبار سے اس کو عقل فعل کہتے ہیں۔ باد ان ایک مقام میں لکھتا ہے کہ عقل میں دو جہت ہیں: وجوب اور امکان، اس کے وجوب سے عقل موجود ہوئی اور امکان سے آسمان۔ اسی طرح سلسلہ ایجاد کا آسمان اخیر اور عقل فعال تک منتہی ہوا۔

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ عقول دس ہیں

ا۔ نول کشوری نسخے میں ھیولاتی ہے۔

اور آسمان نو، لیکن حکیم وارستہ از قیود سیمرغ کے کلام سے عقول اور افلاک کی کثرت

مفہوم ہوتی ہے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ یہ شخص حکیم کامل اور مرتاض بے عدیل تھا۔ بس کہ ترک علائق اور افنائے نفس میں اقران و امثال سے سبقت رکھتا اور جہان و جہانیاں سے دوری، اس مناسبت سے سیمرغ عنقا کے ساتھ ملقب ہو گیا۔ دستان ابن سام یعنی زال سیمرغ زاد اس واسطے کہتے ہیں کہ جب سام نے اس کو بعد متولد ہونے کے شعاب جبال میں پھینک دیا، یہ حکیم اس کے حال سے مطلع ہو کر تربیت میں سرگرم ہوا اور اس کی قامت استعداد کو حلیۂ علم و دانش سے آراستہ کیا۔ یہ حکیم دانش پژوہ کہتا ہے کہ جب میں نے تن عنصری کو اپنے اختیار سے چھوڑا اور عالم علوی کو چشم بصیرت سے دیکھا تو یہ معلوم ہوا کہ عقل اول اور عقل دوم کے بیچ میں بہت سی عقلیں ہیں اور فلک الافلاک اور فلک ہشتم کے بیچ میں بہت سے آسمان، کواکب ثابتہ کے واسطے علیحدہ علیحدہ آسمان ہیں اور کہتا ہے کہ میں نے جان کی آنکھ سے دیکھا کہ ان کی حرکت فلک ہشتم کی حرکت کے برابر ہے۔

ساسان پنجم کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عقول جو حد حصر و شمار سے خارج ہیں اور ہیں، نہ وہ عقول کہ سیمرغ کے کلام سے معلوم ہوئیں۔ وہ تقریر یہ ہے کہ جو چیز نہ جسم ہے، نہ جسمانی، دو قسم ہے: ایک وہ کہ اجسام سے تعلق رکھتی ہے، یعنی نفس اور دوسری وہ کہ اجسام سے تعلق نہیں رکھتی، یعنی عقل اور انواع کی تربیت عقل سے متعلق ہے۔ پس عقل دو قسم ہوئی، ایک وہ جس کا سلسلہ اول مذکور اور عقول عشرہ کے نام سے مشہور ہے، اور دوسری یہ عقول کہ مربی انواع ہے۔ اس حساب سے عقول کی تعداد دائرۂ حصر سے خارج ہوئی۔ اے سخن سرا! جولان طبیعت کو جلوہ ریز اور شب دیز قلم کو مہمیز نہ کر کہ اس گفتگوئے وحشت افزا اور دعاوئ محال سیما سے آسودہ خاطروں کو اضطراب عجیب اور آرمیدہ دلوں کو توحش غریب بہم پہنچتا ہے۔ ان اقاویل دشوار نما کو محفل قبول میں کیا بار اور ان حکایات دور و دراز کو بارگاہ اجابت میں کیا گزار۔ انہیں باتوں کا ذکر کر جن سے اہل روزگار کی طبع مالوف ہے، اور اسی حرف کو زبان پر لا

جس کی طرف احباب کی توجہ معطوف ہے۔ گو کہ جیسا یہ خیال میں نہیں آتا کہ سلسلہ توالد کا ایسا طویل ہو کہ رسائی فکر اور بلوغ ادراک اس کے تصور کی راہ میں نقش قدم کی طرح نیم گام نہ اٹھا سکے۔ یہ بھی باور نہیں ہوتا کہ یہ سر رشتہ ایسا کوتاہ ہو کہ پیر گردون کے خرقے کی ایک دوخت اور ادوار فلک کی کتاب کے نیم شیرازہ میں کفایت نہ کرے۔ کران سے کران تک روئے زمین کا آدمیوں سے مالا مال اور قاف سے قاف تک سطح خاک کا انسانوں سے مملو ہونا، حرفہ ہائے غیر متناہی کا حدوث اور علوم بے شمار کا ایجاد اور پھر ہر حرفے میں فروغ بے حد وحساب کا اختراع اور ہر علم میں دقائق نا محصور کا ابداع اس زمانہ قصیر میں کیوں کر متصور ہے۔

هیہات ہیہات یہ کیا گفتگوئے جنون انگیز اور تقریر ہذیان آمیز ہے۔ اسلام کا دعویٰ اور الحاد و زندقہ کی گفتگو، دین داری کا لاف اور گبر و مجوس کے معتقدات کی جستجو۔ جب ایک ''حرف'' کن سے عرش و فرش مہیا ہو سکتے ہوں، ان مہرۂ چند کا بساط زمین پر منتشر اور ان منصوبۂ چند کا حریفان تیز فکر کی خاطر میں القا کرنا، اس امتداد مدت میں جس کو ہم پست فطرتان کوتاہ دست اس قدر کاروبار کے ساز و سر انجام کے واسطے کافی نہیں سمجھتے، کیا دشوار ہے۔ بساط زمین فراخ اور شرق تا غرب ہر گل زمین میں احاد ناس کے کثرت حصر و شمار سے افزون، نفس ناطقہ ادراک کلی و جزی میں سرگرم، کار پردازان حواس اپنے اپنے کام میں مستعد، جاب منفعت اور دفع مضرت میں قوائے شہوی و غضبی کے منہمک ہونے سے احتیاج ہر طرح کے امور کی شدید، نیک و بد کی تمیز مصاحب دائمی، مصالح کار کا وفور بے حد اسباب تجربہ بے حساب، اختراع صنائع اور ایجاد بدائع کا شوق برسر دست، ذخائر درہم و دینار معین اور دریا دلی بادوق صرف اموال میں محرک۔ شگفت کیا ہے کہ ہر ہر مقام میں اس قدر غرائب پیدا اور اتنے عجائب اہویدا ہو گئے۔ خصوص کہ طوائف امم میں سے ہر فرقہ ایک ایک امر خاص کی مناسبت کے ساتھ اس طرح سے مجبول ہے کہ اس کے

نزدیک اس کے سوا جو چیز ہے، نامقبول اور اس کے غیر کی طرف التفات غیر معقول ہے۔

ہر یکے را بہر کارے ساختند
میل آں اندر دلش انداختند

اب مبداء آفرینش کا حال جس طرح سے مورخین اسلام نے کتب سیر میں ضبط اور طبائع خاص و عام نے زیور قبول سے موشح کیا ہے، لوح اظہار پر مرتسم ہوتا ہے۔ مشتاقان سوانح قدیم وجدید پر واضح ہو کہ احادیث نبوی

ا۔نسخۂ نول کشور میں عجائب ہے۔

علی قائلہ افضل الصلوۃ و اکمل التحیات سے اول مخلوقات سے تعین میں مختلف اقوال دریافت ہوتے ہیں۔ کہیں ''اول ما خلق اللہ نوری'' واقع ہے یعنی جو چیز کہ خدائے عزوجل نے پہلے مخلوق کی ہے، وہ میرا نور ہے۔ منقول ہے کہ جابر انصاری رضی اللہ عنہ نے کہ فضل و دانش میں اقران و امثال سے ممتاز اور قبول اسلام سے پہلے علماء یہود و نصاریٰ سے مبداء آفرینش میں اقاعیل متباینہ سن کر تسلی خاطر کے واسطے ھداۃ سبل کے طالب تھے، اسلام سے مشرف ہو کر جناب افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے چاشنی گیر موائد علم لدنی! صانع قدیر نے سب سے اول کس چیز کو پیدا کیا؟ نعمت جواب سے کامیاب ہوئے کہ اے جابر! تیرے پیغمبر کے نور کو، اور کسی حدیث میں نور کی جگہ قلم اور کسی میں لوح اور کہیں روح کا لفظ وارد ہے۔ اگرچہ اختلاف روایت اس تعین میں خلل انداز ہے لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اختلاف تعدد اسما کے قبیل سے ہے، نہ تعدد مسمی کے اور اسما کے تعدد سے مسمی متعدد نہیں ہو جاتا۔ یہ سب اسم ہیں ایک ہی ذات کے اور لقب ہیں ایک ہی حمیدہ صفات

کے۔

جب یہ معلوم ہو چکا تو اب سنا چاہیے کہ حضرت مبداء جلت اسماؤہٗ نے نور محمدی پر کہ اس کو جوہر بیضا کہتے ہیں، صفت جلالی و جمالی کے ساتھ تجلی کی اور ان دونوں صفات کے اثر سے وہ نور دو قسم ہو گیا۔ ایک سے تو نہایت لطافت وصفا اور روشنی وضیا نقاب کشا تھی اور دوسری سے اس کی نسبت کچھ کمی کے ساتھ جلوہ نما۔ اول نور کے لقب سے مشہور ہوا اور دوسرا نار کے نام سے مذکور۔ نور نے اشخاص شریفۂ علویہ اور کواکب اور آسمان اور ارواح انبیاء و اولیاء اور اصحاب یمین کی آفرینش وقوع میں آئی، اور نار سے جن اور اجناس سفلیہ اور اصحاب شمال کی ارواح نے امتیاز پائی۔ اس تقریر سے واضح ہوا کہ نور حضرت شریعت پناہ خالق و مخلوق میں واسطہ اور ماسوائے اللہ کے آفرینش کے علت ہے۔ نہ افلاکیوں کا وجود اس کے فیض کے بغیر جلوہ گر اور نہ خاکیوں کا ظہور اس کے وسیلے کے بدون میسر۔ فرشتے کو اس کے جمال کی شمع سے نور اور پری کو اسی کی آتش جلال سے گرمیٔ ہنگامۂ ظہور۔ محققین اس نور پاک اور مصداق ''لولاک لما خلقت الافلاک'' کو موجود منبسط مطلق کہتے ہیں کہ اس کا انبساط اور اطلاق اعم ہے، نہ اس کو کسی نوع خاص کے ساتھ اختصاص ہے اور نہ وہ ایک جنس کے ساتھ خاص۔ بلکہ عام ہے کہ ہر شے اس کے افاضہ سے کامران اور ہر ذائقہ اس کی نعمت سے لذت ستان۔ نہ کسی حد معین میں منحصر اور نہ کسی صفت خاص میں منضبط۔ حادث کے ساتھ حادث ہے اور قدیم کے ساتھ صاحب قدم۔ مجرد کے ساتھ مجرد ہے اور مجسم کے مجسم۔ جوہر کی مصاحبت میں جوہر ہے اور عرض کے پردے میں عرض کے نام سے جلوہ گر۔ احدیت اور واحدیت میں واسطۂ اولی ہے اور واجب اور ممکن میں برزخ کبریٰ۔ بہ اعتبار اصل کے احدیت اور وجوب کے ساتھ معروف ہے۔ اور بہ اعتبار قیود کے واحدیت اور امکان سے موصوف۔ عرفی شیرازی نے اسی مطلب عظمیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے:

تا مجمع امکان و وجوبت نہ نوشتند
نہ رد متعین نشد اطلاق اعم را

جب مخلوق اول متعین ہو گیا اور واسطۂ اولی اور برزخ کبریٰ مبین، تو اب چاہیے کہ اس خوان فیض کے ریزہ خوار اور اس مائدۂ احسان کے زلہ بردار، یعنی واردان مہمان سرائے روزگار کہ اس علت کے معلول اور اس سبب کے مسبب ہیں، بزم بیان میں حاضر اور فل ذکر میں باریاب ہوں۔ لیکن مقصود اصلی راقم حروف کا یہ ہے کہ شائستہ خلافت دار الخلافۂ عالم ابو البشر آدم علیہ السلام کے خلقت کی کیفیت معین کرے اور ظہور انسان کی مدت کر متعین، لیکن یہ مطلب ایک تمہید کا خواستگار ہے اور اس مدعا کو ایک توطیہ سے ناچار۔

بر انگیزم حدیث از ہر کرانہ
کہ آرم حرف او را درمیانہ

پوشیدہ نہ رہے کہ حضرت آفریدگار تعالیٰ شانہ نے جزو ناری سے ایک روشن گوہر کو فروغ حیات سے منور فرما کر مثل شمع بزم ہستی میں جلوہ گر کیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسم اس کا 'سوما' اور لقب 'جان' ہے اور اسفار آدم میں مسطور ہے کہ اس کا نام طارنوس تھا۔ بہر کیف جو کہ جن اس کی اولاد ہیں، ابو الجان کے لقب سے مشہور ہے، جیسے کہ آدم ابو البشر کے نام سے مذکور۔ طارنوس عطائے شریعت سے ممتاز ہوا اور منصب حکومت سے سرفراز۔ اس کی اولاد ثوابت کے تین دور تک کبھی اطاعت الٰہی کے صلے میں رحمت سے کامیاب اور کبھی نافرمانی کے مکافات میں مورد عتاب ا۔ ظاہرا دور ثوابت عبارت ہے فلک الثوابت کے دورے کہ ستر برس

ا۔ نول کشوری نسخے میں 'عقاب' ہے۔

میں ایک درجہ طے کرتا ہے اور جو کہ درجات فلکی تین سو ساٹھ ہوتے ہیں تمام دور کی مدت پچیس ہزار دو سو اور تین دور پچھتر ہزار چھ سو برس ہوئے۔ دور ثانی میں بیلقا حاکم نامور تھا اور دور ثالث میں مارنوس بادشاہ داد وگستر اور ہر ایک شریعت جدید سے نامی اور منصب امرونہی سے گرامی۔ تیسرے دور کے بعد اسی عصیان کے مکافات میں منتقم حقیقی نے ملائک کو ان پر مسلط کیا، اکثر قتل ہوئے ارو کچھ کچھ فرمان پذیر، بعضے جزایر وصحرا میں فرار ہو گئے اور بعضے اسیر۔

اتفاقاً ابلیس انہیں اسیروں کے سلسلے میں گرفتار تھا اور ثمرۂ رشد وتمیز سے تازہ برخوردار۔ ملائک کے ہمراہ صعود آسمان سے سربلند ہوا اور اسی زمرۂ قدسی میں نشو ونما پا کر تقرب الٰہی سے ارجمند، آخر الامر معلم الملکوت ہو گیا اور علم و دانش میں مسلم الثبوت۔ تکلم الطائف میں لکھا ہے کہ عرش کے نیچے منبر یاقوت پر بیٹھ کر مجلس وعظ گرم کرتا اور نور کا ایک علم ا اس کے سر پر نصب ہوتا۔ جب زمین پر قوم بنی جان میں کفر وعصیاں نے ظہور پایا اور ظلم وتعدی نے وفور، جناب صمدیت سے راہ رخصت اور فوج فرشتگان ہم راہ لے کر وارد ہوا اور دفعات چند میں ارباب استقلال کو مضطر اور اہل تمرد کو زیر وزبر کیا۔ بس کہ کمالات علمی وعملی میں ممتاز تھا اور اب امور سلطنت میں استقلال دیکھا، دو دنخوت دماغ میں متصاعد ہوا اور بخار تکبر صاعد۔ آپ کو مستحق خلافت سمجھ کر یہ مقرر کیا کہ اگر

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور میں یہ لفظ ''حلم'' ہے۔

امر سلطنت اور کی طرف منتقل ہو، میں اس کی اطاعت نہ کروں۔ لیکن اب تک ملائک سے وہی ارتباط تھا اور فرشتوں سے وہی اختلاط۔ کبھی آسمان پر جاتا اور کبھی زمین پر

چلا آتا تھا، تا بہ حدے کہ ظہور خلافت آدم منصۂ مشیت میں جلوہ گر ہوا اور طنطنہ کوس "انی جاعل فی الارض خلیفہ" سے گوش حاسد کر۔ نخوت شیطانی نے بغی و عناد کو سینۂ ابلیس میں مشتعل کر دیا اور اثر صحبت و تاثیر اختلاط نے اتنا کام کیا کہ حرف "اتجعل فیہا من یفسد فیہا" زبان ملائک سے آشنا ہوا اور "نحن و نسبح مسبحان ملاء اعلیٰ" کے استحقاق کے اظہار میں بلند صدا۔ لیکن جواب "انی اعلم" سے سعادت ذاتی جوش میں آئی اور عروس اہلیت آغوش میں۔ حرف دعویٰ سکوت سے ہم آغوش ہوا اور راز و نیاز سے ہم دوش۔ جبرائیل و میکائیل، نوبت بہ نوبت مامور ہوئے کہ ایک قبضۂ خاک بساط زمین سے فراہم کریں تا کہ اس مادہ ظلمت سے پیکر نورانی مہیا ہو کر تاج خلافت سے سرفراز اور خلعت سلطانی سے ممتز ہو، لیکن زمین نے آپ کو اس منزلت عالی کے سزاوار نہ پا کر امتناع کیا اور حضرت خالق الکائنات کی عظمت و جلال کی سوگند سے متوسل ہو کر مقصود سے کامیاب نہ ہونے دیا۔

آخرالامر عزرائیل نے تمام روے زمین سے اجزاے مختلف الالوان کو فراہم کر کے مکہ و طائف کے درمیان رکھ دیا اور سال ہا سال رحمت الٰہی کا باران اس مشت خاک پر برسا۔ دست قدرت آفرید گار نے اس کا خمیر طیار 1

ا۔ نسخہ مطبع مرتضوی دھلی ۱۲۷۱ھ میں، اس جگہ اور آئندہ ہر ایک جگہ 'طیار' لکھا ہے۔

کیا اور حکمت بالغہ کا اظہار۔ کس قدر اسرار قدرت اس لعبت بوالعجب میں ودیعت رکھے اور کیا کچھ عجائب صنعت اس پیکر غریب میں امانت۔ کتب تواریخ سے ثابت ہے کہ تخمیر اس خاک تیرہ رنگ اور صقالت اس آئینہ سراسر زنگ کی چالیس برس میں اتمام کو پہنچی اور جمعیت ان اجزاے پریشان کی انتظام کو۔ جس قدر روح لطیف کو جسم

کثیف میں نفوذ ہوتا تھا، رگ و ریشہ ظہور میں آتے تھے اور شرائین و اعصاب رنگ پکڑتے جاتے تھے۔

منجمین کہتے ہیں کہ جب روح آدم قالب خاکی میں داخل ہوئی، جمعے کا دن اور محرم کا عاشورہ تھا۔ برج جدی کا درجۂ اول اس وقت افق شرقی کے برابر تھا اور اس درجے میں زحل اور حوت میں مشتری اور حمل میں مریخ اور اسد میں قمر جلوہ گر اور بعضے کہتے ہیں کہ اس وقت سوائے عطارد کے سب کواکب بیت الشرف میں فراہم تھے اور سعادات فلکی کے اسباب منتظم۔ سرفرازان عالم الملکوت نے جب اس مشت خاک میں اور ہی عظمت و جلال دیکھا، باہم تذکرہ کیا کہ ہر چند بہانہ جوئی لطف کریم نے خاکی ضعیف کو مسند امتیاز پر متمکن کیا، لیکن علم و فضل میں ہم بالاتر ہیں اور دانش و معرفت میں ہم والاتر۔ علام الغیوب نے دلبستان مکرمت میں حضرت خلافت مرتبت کو گنجینۂ اسما پر متصرف اور وقوف اسرار سے متصف فرما کر آدم و ملائک کو امتحان گاہ میں حاضر کیا۔ سوادخوانان لوح محفوظ کی زبان پر ''لاعلم لنا'' کے سوا کچھ نہ آیا اور وہ ابجد خواں مکتب اسرار خدمت بجالایا:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو میں ناتواں اٹھا لایا

تعلیم اسما کی تحقیق میں محققان تحریر کو اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ واقف اسرار نے اشیاے عالم کے نام سے اس برگزیدۂ مکونات کو آگاہ کیا اور بعض لکھتے ہیں کہ لغات مختلفہ پر اس کو صاحب انتباہ کیا۔ کوئی اسماء سے صحف منزلہ اور امور مقدرہ کی معرفت مراد رکھتا ہے اور احوال مستقبلہ واقفیت۔ کسی کے نزدیک خواص اشیاء مراد ہیں اور کسی کے عندیے میں ملائک کے اسما۔ ''والعلم عنداللہ الحکیم وھوعلی کل شئ علیم''۔ اس وقت حکیم علی الاطلاق کی حکمت بالغہ نے اقتضا کیا کہ مقربان بارگاہ صمدیت اس مجمع مکارم انسی و ملکی کو سجدہ کریں۔ روشنان قدسی نہاد تو انقیاد بجالائے

لیکن نخوت ذاتی ابلیس کی عناں گیر ہوئی اور شرارت جبلی ہم صفیر کہ آتش و خاک کے نہاد کا کیا مقتضا ہے اور "خلقتنی من نار و خلقتہ من طین" کا کیا مدعا۔ آخر ابا اور استکبار سے خوار ہوا اور طوق لعنت سے گراں بار، سچ ہے:

درختے که تلخ است آں را سرشت
گرش بانشانه به باغ بهشت
ور از جوے خلدش به ہنگام آب
به بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سر انجام گوہر بکار آورد
ہماں میوۂ تلخ بار آورد

اس قدسی سرشت کی سکونت بہشت میں مقرر ہوئی اور اس عشرت کدۂ غریب میں آرام گاہ میسر لیکن مصلحت الٰہی نے وقت خواب آدم کے پہلوے چپ سے حوا کو پیدا کیا اور حیلۂ وحشت زداے ہویدا۔ آخر اس مستورۂ ناعاقبت اندیش نے اغواے ابلیس سے شجرۂ ممنوعہ کی طرف دست طمع دراز کیا اور اس بالغ رس کامل خرد کو بھی اس کام میں اپنا انباز۔ اس درخت کے تمتع کا ثمرہ یہ ہوا کہ خرابۂ دنیا کی خاک اڑانی نصیب ہوئی اور وہ طبیعت نازک تحمل مصائب سے ناشکیب۔ سبحان اللہ ذریات بلند ہمت نے لذات جسمانی کی طلب میں ایسا انہماک، اور ہوا جس نفسانی کے سر انجام میں وہ استغراق بہم پہنچایا کہ پدر بزرگوار پر سبقت لے گئی۔ ہر ایک کی زبان حال اس مقال سے گویا ہے:

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بجوی نفروشم

ابن عباس سے روایت ہے کہ حضرت آدم اس جہاں کے ایام کے حساب سے عصر سے غروب آفتاب تک بہشت میں رہے اور بعضوں کے نزدیک پانچ سو برس

دنیا کے کہ وہاں کا نصف روز شمار کیا جاتا ہے، لیکن محققین کو جنت آدم کے تعین میں اختلاف ہے۔ ابو ھریرہ اور حذیفہ یمانی اور ابو مالک اشجعی وغیر ھم کا قول یہ ہے کہ وہ بہشت جنت الماوا ہے اور عبداللہ ابن عباس اور سفیان ابن عتبہ وغیر ھما کا یہ مذھب ہے کہ جنت الماوا کے غیر ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس جگہ آدم علیہ السلام شجرہ معینہ کی احتراز سے مکلف ہوئے اور نوم استراحت کے ساتھ مشتغل اور جنت الماوا نہ محل نوم ہے اور نہ موضع تکلیف۔ علاوہ اس کے اگر جنت موعود ہوتی تو دخل ابلیس کا اس مکان مقدس میں نہ ہوتا۔ مگر ان لوگوں میں بھی اختلاف ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ یہ بہشت آسمان میں تھی، کس واسطے کہ اگر آسمان میں نہ ہوتی ھبوط کا لفظ حضرت آدم کے حق میں وارد نہ ہوتا اور بعضے کہتے ہیں زمین پر تھی اور ممانعت شجرہ کی یہیں وقوع میں آئی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کا وقت رحلت قریب ہوا، اپنی اولاد سے انگور بہشتی طلب کیے اور یہ لوگ اس کی تحصیل میں سرگرم ہوئے۔ اثنائے راہ میں ملائک سے ملاقات ہوئی اور ان کی ممانعت پدر مشفق کی وفات قریب سمجھ کر معاودت کی۔ اگر وہ بہشت زمین پر نہ ہوتی یہ لوگ اس ثمر کی تلاش میں کمر ہمت کو چست نہ باندھتے۔ امام ابوالحسن فاریابی نے کتاب اسولہ جامعہ میں لکھا ہے کہ یہ جنت دیار فلسطین میں تھی۔ رسالۃ الحیوان کے ترجمے میں کہ اکیسواں رسالہ اخوان الصفا کا ہے مرقوم ہے کہ یہ بہشت ایک باغ ہے کہ کوہ یاقوت کی بلندی پر مشرق کی طرف واقع اور ایسا بلند ہے کہ حیوان اور انسان کو وہاں تک رسائی ممکن نہیں۔ اور قدرت کاملہ حضرت آفریدگار سے فصول اربعہ میں ہوا معتدل اور درخت سرسبز او رانہار جاری اور شاخیں کثرت اثمار سے گراں بار۔ اور ھبوط کے واسطے بلندی ضرور نہیں بلکہ اھبطو امصرا کلام ملک العلام میں وارد ہے۔ یہ خلاصہ ہے روضۃ الصفا کا کہ خامہ شکستہ ارقام نے طباع واقعہ طلب کی ضیافت کے واسطے ثبت اوراق کیا۔

اب سنا چاہیے کہ ارباب تاریخ کو اس امر میں تو اتفاق ہے کہ حضرت آدم نے کوہ سراندیپ پر نزول کیا لیکن حوا میں اختلاف ہے۔ بعضوں کے نزدیک ھبوط حوا کا جدہ میں واقع ہوا اور بعضوں کے نزدیک مزدلفہ میں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ایک مدت دراز کے بعد آدم و حوا کی ملاقات کوہ عرفات پر واقع ہوئی اور جو کہ اس مقام میں باہم تعارف وقوع میں آیا، اس واسطے اس کوہ کو عرفات کے نام سے موسوم کیا۔ اور پھر کوہ سراندیپ کی طرف معاودت کی اور توالد و تناسل کے سلسلے نے درازی پائی۔ حبیب السیر میں لکھا ہے کہ عمر اس نبی مرسل کی بعد ھبوط دنیا کے ہزار برس کی ہوئی اور ان کی حیات میں کثرت اولاد کی نوبت چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی، لیکن صلبی صرف بیس[1] پسر اور بیس دختر تھیں اور روضۃ الصفا میں انیس پسر اور انیس دختر بھی مسطور ہیں اور لفظ آدم میں اختلاف ہے۔

بعض اہل تحقیق کا قول یہ ہے کہ آدم اسم عجمی ہے جیسے آذر اور شامخ اور عبداللہ ابن عباس سے منقول ہے کہ آدم اس واسطے کہتے ہیں کہ ادیم ارض، یعنی روے زمین سے مخلوق ہوئے تھے اور بعضوں نے سمرت لون کو وجہ تسمیہ قرار دیا ہے۔ پس ادمہ سے مشتق ہوا اور بعض کہتے ہیں ادمت الشیئین سے مشتق ہے، یعنی مخلوط کیا میں نے دو چیزوں کو۔ غالباً خلط اشیا سے اس جگہ اجزاے متفرقہ زمین کا مخلوط ہونا مراد ہے کہ تخمیر آدم

۱۔ نول کشوری نسخے میں ''تیں'' ہے۔

ان سے وقوع میں آئی اور اس کتاب حکمت کے شیرازے نے جمعیت پائی۔ اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ آدم عربی ہے نہ عجمی۔ اور یہ جو امام نودی نے تہذیب الاسماء و اللغات میں لکھا ہے کہ سواے آدم اور صالح اور شعیب اور محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کے سب انبیا کے نام عجمی ہیں اس کی تائید کرتا ہے۔ اور روضۃ الصفا میں صحف ادریس سے منقول ہے کہ جب حق جل اسمہ نے چاہا کہ بسیط عالم میں نوع انسان کو ظاہر کرے، روئے زمین سے ایسا شخص پیدا کیا کہ اس کو زبان سریانی میں مایوس کہتے تھے۔ اور حوا کی وجہ تسمیہ کے باب میں ثعالبی سے منقول ہے کہ لوگوں نے حضرت آدم سے حوا کے نام کی وجہ پوچھی حضرت نے فرمایا جو کہ وہ میرا ایک جز ہے اور مخلوق حی سے پیدا ہوئی اس واسطے اس کا نام حوا ہوا۔ جب آغاز آفرینش کی کیفیت مرقوم ہو چکی، اب اہل ہوش پر ظاہر اور اصحاب خرد پر روشن کیا جاتا ہے کہ خلقت انسان کی مدت میں روایات متعدد اور اقوال مختلف منقول ہیں۔

محمد جریر طبری نے لکھا ہے کہ حضرت ابو البشر سے فخر بنی آدم تک بعضے چھ ہزار تیرہ برس کہتے ہیں اور بعضے پانچ ہزار نو سو برس۔ اور ایک اور مقام میں لکھا ہے علماء یہود کے موافق ایام ھجرت تک چار ہزار چالیس برس تین مہینے منقضی ہوئے اور احبار نصاری کی روایت کے موافق پانچ ہزار ایک سو بہتر برس گزرے۔ اور عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ آدم سے طوفان تک دو ہزار دو سو چھپن اور طوفان سے خلیل حضرت رحمان ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام تک پانسو پینسٹھ اور اس حضرت سے جناب موسیٰ علیہ السلام تک پانسو پینسٹھ اور ان سے حضرت سلیمان تک پانسو چھتیس اور سلیمان سے ذوالقرنین تک سات سو ستر اور اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تین سو اٹہتر برس گزرے۔ پس آدم سے عیسیٰ علیہ السلام تک پانچ ہزار پانسو بائیس برس منقضی ہوئے۔ اور ابوالفتح ناصر بن محمد الحسینی نے کتاب معارف میں وھب بن منبہ سے روایت کی ہے کہ عمر اس جناب کی ہزار برس کی ہوئی اور ان کے انتقال سے طوفان تک بائیس سو بیالیس اور طوفان سے نوح علیہ السلام کی وفات تک ساڑھے تین سو اور یہاں سے حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ افضل الصلوۃ کی وفات تک بائیس سو چھیالیس اور ان کی وفات سے موسیٰ علیہ السلام تک سات سو اور ان سے حضرت

داؤد تک پانسو اور داؤد سے حضرت عیسیٰ تک گیارہ سو اور حضرت عیسیٰ کے آسمان پر صعود کرنے سے مفخر عالم افضل بنی آدم صلعم کی ولادت باسعادت تک چھ سوبیس برس منقضی ہوئے۔

اس تقدیر پر آدم سے طلوع نیر آسمان کرامت یعنی ولادت اکمل البریت تک آٹھ ہزار سات سو اٹھاون برس ہوتے ہیں اور حمزہ ابن حسین اصفہانی نے کہ اس کی سخن دانی کا اشتہار رقم خوانان صفحۂ خاک سے لے کر روشن سوادن لوح محفوظ تک بلند صدا ہے، اس طرح سے روایت کی ہے کہ خلقت آدم سے ولادت نوح تک ایک ہزار چھپن اور ان کی ولادت سے ابراہیم علیہ السلام کی ولادت تک ایک ہزار آٹھ سو نوے اور یہاں سے حضرت یعقوب کے مصر میں تشریف لانے تک دو سو نوے اور یہاں سے اس جناب کی وفات تک سترہ اور اسرائیل کی فوت سے بیت المقدس کی بنا تک چار سو اسی اور پھر اس خانۂ نورانی کی تخریب تک چار سو دس اور پھر اس زمانے تک کہ فاروق حق و باطل عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس مکان مقدس کو مفتوح کیا، ایک ہزار پانسو چون برس گزرے۔

اس روایت کے موافق آدم سے هجرت مقدسہ تک پانچ ہزار چھ سو ستانوے برس ہوتے ہیں۔ اور افضل المتاخرین مولانا کمال الدین حسین خوارزمی نے مقصد اقصیٰ میں لکھا ہے کہ افضل الکائنات اشرف المخلوقات علیہ اکمل التحیات کی ولادت کرامت انتما سے حضرت عیسیٰ تک چھ سوبیس، اور یہاں سے حضرت داؤد تک بارہ سو اور داؤد سے موسیٰ تک پانچ سو اور ان سے حضرت ابراہیم تک سات سو ستر اور ابراہیم علیہ السلام سے طوفان تک ایک ہزار چار سوبیس اور پھر آدم تک دو ہزار دو سو چالیس برس منقضی ہوے۔ اس صورت میں میلاد مکرمت بنیاد سے آدم تک چھ ہزار ساڑھے سات سو برس کا عرصہ گزرا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

جب قلم شکستہ رقم حال آفرینش کو حسب استعداد تحریر کر چکا تو اب چاہیے کہ اس

بات کی تحقیق کرے کہ اول ایک زبان تھی یا کئی۔ دقیقہ سنجان باریک بیں جانتے ہیں کہ مواضع اور محال مختلفہ میں آغاز آفرینش سے علیحدہ علیحدہ زبانوں کا بہم پہنچنا بدون اس کے کہ کوئی زبان بعد تصرفات کثیرہ کے متغیر ہو جاوے، یا الفاظ اور کلمات جدید موضوع ہو کر زبان سابق ''کیف ما اتفق نسیاً منسیا'' ہو جاوے، جب ممکن ہے ہر ہر دیار میں اولاً جماعت کثیر بہم پہنچ گئی ہو، جیسے بارش کے اثر سے گیاہ اور حشرات الارض یا ہر ہر قطعۂ زمیں میں ایک ایک ابوالبشر متولد ہو کر ہر ہر جگہ جدا جدا توالد اور تناسل کا سبب ہوا ہو۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ جب ہر دیار میں ایک جماعت کثیر بہم پہنچ گی یا ہر جگہ ایک ایسا شخص بہم پہنچا کہ سائر الناس اس کی اولاد اور ذریت ہوئی تو جو کہ اظہار مطلب اور تبیین مدعا کے واسطے ناگزیر ہے، اور بہ سبب بعد مسافت کے جماعت اخریٰ سے ملاقات صورت پزیر نہیں کہ تکلم میں اس کی تقلید کرے، ناچار ہر جماعت وضع الفاظ میں سرگرم ہو کر ایک ایک زبان ایجاد کرتی گئی۔

پس یہ زبان ہر جگہ علیحدہ اور دوسری زبان سے مغائر ہوگئی۔ ہر چند عقل اس طرح کی پیدائش سے چنداں ابا اور امتناع نہیں کرتی بلکہ حشرات وھوام کی خلقت دلالت کرتی ہے کہ اگر افراد مردم اور احاد ناس بھی اسی طرح سے مسند وجود پر متمکن ہو گئے ہوں تو کیا بعید ہے، جیسے بوعلی سینا کا قول منقول ہو لیکن عادت البتہ ایسے امور غریبہ کو دائرۂ امکان سے خارج اور جادۂ قبول سے بعید سمجھ کر قطعاً اس کے اقبال کے واسطے سر فرو نہیں کرتی۔ اور نقل تو مخالف سے ہو یا موافق سے، صریح اس مدعا کے بے اصل و سرسری ہونے پر داعی اور اس کے خلاف کی راہ میں ساعی ہے۔ ہنود برہما کو مبداء آفرینش جانتے ہیں، اور دانش اندوزان ایران دیار ہر دور کے آغاز میں ایک مرد اور ایک عورت کے باقی رہنے کا ادعا اور اس سے توالد و تناسل کے سلسلے کے ممتد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں صریح مرقوم ہے کہ ہر چند آباء علوی آسمان اور امہات سفلی عناصر ہیں لیکن ہم کو یہی پہنچا ہے کہ ایک سے دوسرا

پیدا ہو۔

اہل اسلام کے نزدیک تو ظاہر ہے کہ آدمیوں کی نسل کا سلسلہ سرحلقۂ افراد بریات آدم صفی اللہ علیہ وعلی نبینا افضل التحیات تک منتہی ہوتا ہے۔ جب مبداء احاد ناس اور افراد مردم کا ایک شخص ہوا تو ضرور ہے کہ اس کی ذریت بھی اولاً اس کی زبان سے بہرہ مند اور اسی کے کلام سے مستفید ہوگی۔ گو بعد مرور دھور کے اختلاف لغات اور تغایر السنہ وقوع میں آ گیا۔ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ اول آفرینش میں ایک ہی زبان ہو لیکن تعین اس زبان کی نہایت دشوار اور نہایت دور از کار ہے۔ ہنود کی کتابوں سے ہر چند اس امر کی تصریح تو دستیاب نہیں ہوتی لیکن براھمہ اتنی بات پر البتہ اتفاق رکھتے ہیں کہ چاروں وید کہ زبان سنسکرت میں احکام الٰہی پر مشتمل اور اوامر ونواھی پر محتوی ہیں، انہیں الفاظ کے ساتھ برھما کی زبان سے صادر ہوئے ہیں۔ اس روزگار سے اس جزو زماں تک کچھ تغیر اور تبدل کو اس میں راہ نہیں ہوئی۔ اس سے یہ خیال گزرتا ہے کہ عجب نہیں کہ من اور ستر ذکانی کہ برھما کے بدن سے موجود اور آدم و حوا کی طرح سے اور آدمیوں کی پیدائش کی سبب ہوئی، برھما سے سنسکرت ہی کو حاصل اور ان کی ذریت نے انہیں الفاظ سے تکلم کیا ہو، لیکن یہ قوم اس پر بھی متفق ہیں کہ سنسکرت دیوتاؤں کی زبان ہے، نہ آدمیوں کی۔ اور مجوس کے اعتقاد میں آغاز اس دور کا مہ آباد سے ہے اور مہ آباد جو کہ پہلے ہی دور کے آدمیوں کا بقیہ تھا، غالب ہے کہ اسی دور کے آدمیوں کی زبان سے متکلم ہوتا ہو اور وہ محقق نہیں کہ کیا ہے اور جو کہ مجوس کے اعتقاد میں دساتیر کتاب سماوی اور مہ آباد پر نازل ہوئی ہے اور کتاب منزل چاہیے کہ خلق کی زبان میں ہوتا کہ احکام الٰہی سے بخوبی آگاہ اور امر و نہی سے کما ہی مطلع ہو جاویں۔ احتمال ہے کہ اس وقت کی زبان یہی زبان دساتیر ہو، پھر اس میں تغیر و تبدیل نے راہ پائی اور مختلف زبانیں پیدا ہو گئیں۔ زبان فارسی کا اس زبان سے بیشتر الفاظ میں مطابق اور قاطبۃً ترکیب نحوی میں

موافق ہونا بھی اسی بات پر دال ہے۔ اس مقام میں ترکیب نحوی کی تطبیق کی تفصیل اطناب سخن اور تطویل کلام کا موجب ہے۔ ناچار چند لفظ دونوں زبانوں کے مرقوم ہوتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ دساتیر میں بعضے لفظ ایسے ہیں کہ فارسی میں بعینہٖ استعمال پاتے ہیں اور بعضے فی الجملہ تغیر اور تبدیل کے ساتھ۔

قسم اول:

راعلامت مفعولیت کاف بیانیہ گر مفید فاعلیۃ جیسے ہ رششگر یعنی بخشائش گر۔ ندہ علامت اسم فاعل، جیسے برشندہ بہ معنی بخشائندہ یا ردبہ معنی توانند۔

قسم دوسری:

آسد الف ممدودہ اور سین اور دال مہملتین سے یعنی باشد، آسنام آسمان، افسرید الف ممدودہ اور فا اور سین اور رائے مہملہ اور یائے تحتانی اور دال مہملہ کے ساتھ آفرید کہ مشتق ہے آفریدن سے۔ اسپ الف اور سین مہملہ اور یائے فارسی کے ساتھ صرف ربط کہ فارسی میں است تائے قرشت کے ساتھ مستعمل ہے۔ اس کے قیاس پر لاسپ یعنی نیست کہ حرف رابط ہے، لام نفی کے ساتھ اور لاسپند نیستند، آکام آغاز، انتام الف اور نون اور تائے قرشت اور الف اور میم کے ساتھ انجام۔ انتامانید الف اور نون اور تائے قرشت اور الف اور میم اور الف اور نون اور یائے حطی اور دال مہملہ کے ساتھ انجام۔ مانید تیم تائے قرشت اور یائے حطی اور میم کے ساتھ تن یعنی بدن۔ جم اور جد یہ دونوں لفظ بہ معنی جزو کے ہیں کہ حرف اشنا ہے۔ جمیم جزین، جہاخ آخر میں خائے معجمہ جہان، جمین جیم تازی مفتوح سے کمین اے کمینہ، چم جیم فارسی مضموم سے چون، چمین چنیں، چیم چہ، ذشمر یعنی دشمن۔ دم در کہ حرف ظرف ہے، دمان در آن یعنی حرف ظرف اسم اشارہ کے ساتھ۔ دن تن۔ زمریان زائے تازی اور میم اور رائے مہملہ اور بائے فارسی اور الف اور نون کے ساتھ مہربان۔ سامی سین مہملہ کے ساتھ سو۔ ستام ستان یعنی حرف کثرت جیسے فہ ہوشستام، وہ جائے کہ جس میں

فرشتے بہت ہوں یعنی آسمان۔ سفاسف دو سین مہملہ سے سراسر، شائے شین معجمہ کے ساتھ جائے۔ شاکشتن دو شین معجمہ کے ساتھ، دانستن۔ فہ بہ کے حرف الصاق ہے، فہام بان یعنی فائے موحدہ الصاق اسم اشارہ کے ساتھ۔ جہین بعد فا کے حائے ہوز باین۔ کمد یعنی کند اور اس کے قیاس پر لہ کمد یعنی نکند۔ کیام کدام۔ کید اور کیدہ کرد اور کردہ کہ مشتق ہیں کردن سے۔ گاش کاف فارسی سے کوش۔ گرخ کاف فارسی مکسور اور رائے مہملہ ساکن اور خائے معجمہ کے ساتھ۔ گرد کاف فارسی مکسور اور را اور دال مہملتین کے ساتھ یعنی شہر۔ لہ دوام نتوان لام حائے مختفی کے ساتھ اور بدون حا کے حرف نفی ہے۔ لہ مارند ندارند۔ مزادام یزدان۔ مہنام بہنام کہ جس کو بہمن یعنی عقل اول اور جبریل کہتے ہیں۔ میناس مینو یعنی بہشت۔ نادنام۔ وفتن واو سے گفتن۔ وفتہ ھد گفتہ شد۔ ورلہ ورنہ۔ وراو رسراسر۔ ویرد واو سے گیرد۔ ھز حائے ہوز سے از کہ ترجمہ من کا ہے، حانچیم انچہ۔ حام آن۔ حاید آید۔ ھدن حائے ہوز مضموم سے شدن۔ اس کے قیاس پر لہ می ھود، نمی شود۔ ھو حائے ہوز اور سین مہملہ کے ساتھ ضمیر غائب ہے کہ فارسی میں اس کی جائے او الف کے ساتھ **مستعمل** ہے۔ ھیشام ایشان، ھیر ھیچ۔ ھرچند یہ زبان اور زبانوں کا ماخذ مقرر نہ کی جاوے، لیکن اس تطابق کی **دلیل** غالب کہ زبان فارسی کا ماخذ اسی زبان کو تجویز کرے۔

مگر عمدہ قباحت یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں **مرقوم** ہے کہ یزدان نے مہ آباد پر ایک کتاب نازل کی ''دساتیر'' نام اور اس میں ایک زبان تھی کہ زمینوں کی کسی زبان سے مشابہ نہ تھی، اس کو آسمانی زبان کہتے ہیں۔ یہ قول کہ وہ زبان زمینوں کی کسی زبان سے مشابہ نہیں، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ''دساتیر'' کے نزول سے پہلے بھی اور زبانیں موجود تھیں، اور اگر غور کیا جاوے تو تطابق کی **دلیل** سے اس کو فارسی کا ماخذ ٹھہرانا بھی چنداں قوت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے کہ یہ تطابق امر اتفاقی ہو، یعنی اتفاق یہ ہوا کہ دونوں زبانوں میں بعضے الفاظ کی وضع مطابق واقع ہوئی۔

اگر نظر غور سے ملاحظہ کیا جاوے تو زبان ہندوی میں گرانی وسکی کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہے اور حال یہ ہے کہ جس قدر ان دونوں زبانوں میں الفاظ کا تطابق اور کلمات کا توافق پایا جاتا ہے، کم کسی زبان میں ہوگا، مثلاً آدھ الف ممدودہ اور دال مخفف اور ھائے مختفی سے، دو چوب بلند کہ زمین میں گاڑیں اور ایک چوب اس پر نصب کریں جانوروں کی نشست کے واسطے۔ ھندی میں اس کو اڈا الف مفتوح اور دال ہندی مشدد اور الف کے ساتھ کہتے ہیں۔ افیون اور اپیون اور ھاپو ہندی میں بھی ھاپو ہے۔ اسکورہ کا سہ گلی، ہندی میں سکورہ ہے۔ باب دونوں بائے تازی سے پدر اور ہندی میں باپ ہے، اخیر میں بائے فارسی۔ تال طبق برنجی، ھندی اس کی تھال ہے۔ پچو پستان، ھندی میں چوچی کہتے ہیں۔ چلیدن رفتن، ہندی میں چلنا۔ چندن اور چندل بمعنی صندل کہ ھندی میں بھی چندن ہے۔ خیش خائے منقوطہ اور یائے مجہولہ اور شین منقوطہ سے جامہ بافتہ او رایسی کتان کہ اس کے تار گندہ ہوتے ہیں اور موسم گرما کے لباس سے ہے، ھندی میں کھیس کاف تازی مخلوط الہا سے کہتے ہیں۔ شنا فارسی میں تیرنے کو کہتے ہیں اور ھندی میں سنان سین مہملہ اور دونوں سے تمام بدن کے دھونے کو کہ جسے عوام اشنان الف اور شین معجمہ کے ساتھ کہتے ہیں۔ طوطی جانور معروف اور ھندی میں توتا کہتے ہیں۔ لنگوتہ لنگی۔ غایت یہ ہے کہ ہندی میں اخفائے نون اور فتحہ تائے مثقلہ سے اس لتے کو کہتے ہیں کہ صرف پس وپیش کے ستر کو کافی ہو۔ ناف معروف ھندی میں نابھ ہے۔

مخفی نہ رہے کہ اس قسم کے ہزارہا لفظ پیش نظر ہیں کہ ان کی تحریر موجب تطویل اور تطویل باعث ملال خاطر ہے۔ بہر کیف یہ تو محقق نہیں کہ مہ آباد اور اس کے ذریت کی زبان کیا تھی لیکن بعضوں کو ایک شاعر کے کلام سے کہ آبادیوں کے زمانے میں تھا، یہ وہم ہوا ہے کہ اس وقت کے آدمیوں کی زبان پہلوی تھی، واللہ اعلم بالصواب۔ اور اس کا حال مقصد دوم میں جس جگہ موجد اشعار کا حال لکھا جائے گا،

مفصل مرقوم ہوگا۔

ہوشیار مغزان مکتب تحقیق پر واضح ہے کہ ہنود اور مجوس کے مذہب کے موافق تو کچھ متحقق نہیں ہوتا کہ ابتدائے آفرینش میں کیا زبان تھی جیسے کہ مقالات سابقہ سے منکشف ہوا لیکن اہل اسلام کے مذہب کے موافق کہ افراد سلسلہ ناس کا مبداء حضرت آدم علیہ السلام کو مقرر کرتے ہیں، احتمال ہے کہ کوئی جادہ منزل مقصود تک پہنچ جاوے۔ اگرچہ اختلاف رواۃ سے یہ راہ بھی سرگردانی وتردد سے خالی نہیں۔ سیفی عروضی شروع کتاب عروض میں لکھتا ہے کہ اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوالبشر آدم علی نبینا وعلیہ السلام کی زبان سریانی تھی لیکن قدوۃ المحققین افضل المحدثین شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز تفسیر عزیزی میں حضرت آدم کے حال میں لکھتے ہیں کہ ابن عساکر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ جب ان کو جنت سے اخراج کا حکم ہوا حضرت جبرائیل اور حضرت میکائیل نے ان کے سر سے تاج اتار لیا ارو کمر سے کمر بند کھول لیا اور زبان عربی کو ان سے سلب کر کے زبان سریانی اس کی جگہ جاری کی۔ جب توبہ قبول ہوئی پھر حکم ہوا کہ زبان عربی میں کلام کیا کریں۔

اس روایت کی قوت سے معلوم ہوتا ہے کہ اول زبان عربی موجود ہوئی اور سریانی اس کے بعد، اور حوا کی وجہ تسمیہ بھی جو سابق مبین ہوئی، زبان آدم کے عربی ہونے پر دلالت کرتی ہے، اور جو کہ وہ حضرت زبان عربی کے سلب ہونے کے بعد سریانی سے متکلم ہوتے تھے، ان کے نام میں دونوں احتمال ہیں۔ پس یہ بات جو ''تاریخ خمیس'' میں ''معالم التنزیل'' سے نقل کی ہے کہ یعرب ابن قحطان اول ان لوگوں کا ہے جو عربی سے متکلم ہوئے اور اسی طرح قول صاحب ''منتخب اللغات'' کا ضعف سے خالی نہیں، مگر اس کی توجیہ یوں کی جاوے کہ اگرچہ حضرت آدم کو زبان عربی میں تکلم کرنے کا حکم ہوا لیکن ان کی اولاد میں وہی زبان سریانی جو عربی کے سلب ہونے

کے بعد شائع ہوئی تھی، باقی رہی اور پھر جب اولاد میں عربی کا شیوع ہوا تو اول یعرب اس سے متکلم ہوا، لیکن طرفہ حیرت دامن گیر ہے کہ بعد ھبوط کے مدت دراز تک بود و باش اور تکثیر اولاد بلکہ ابن عباس کی روایت کے موافق نقد حیات مھلان تقدیر کو تفویض کرنا جناب آدم علیہ السلام کی ہند میں ہوا، اور زبان عربی اور سریانی ان دیار دور دست میں شائع ہو کہ ہند سے وہاں تک پیک خیال کا پہنچنا بھی صعوبت سے خالی نہیں، اور اس سے عجیب تر یہ ہے کہ خالص ہندوستان میں ایسی زبانیں شائع ہوں کہ ثقل و گرانی سے عربی اور سریانی کے ساتھ مناسبت تو کیا بلکہ ان زبانوں کے تلفظ کرنے والوں کی زبان پر تلفظ بھی سخت و دشوار بلکہ دور از کار ہے۔ حق یہ ہے کہ اسرار الٰہی سے انسان ضعیف البنیان کیا آگاہ ہو اور رموز غیبی سے خاکی عجز نہاد کیوں کر مطلع ہو۔

تو خود می نشنوی بانگ دہل را

رموز سر سلطاں را چہ دانی

اب اختلاف السنہ کی کیفیت جس طرح اپنے گنجینۂ استعداد میں فراہم رکھتا ہے، لکھتا ہے کہ اختلاف ایک زبان کا دوسری زبان سے دو قسم ہے۔ ایک یہ کہ پہلی زبان میں آہستہ آہستہ اس طرح کا تصرف وقوع میں آوے اور رفتہ رفتہ ایسا تغیر و تبدل راہ پاوے کہ مرور ازمنہ اور صروف دھور کے بعد وہ زبان اور ہی صورت میں جلوہ گر ہو کر اس زبان سے اجنبیت پیدا کرے اور دوسرے یہ کہ بے اس کے کسی زبان کے الفاظ میں تصرف اور تغیر وقوع میں آیا ہو، ہر ہر معنی کے واسطے الفاظ جدید موضوع کیے جاویں اور اس خطے کے رہنے والے ایک دوسرے کی اصطلاح سے واقف ہو کر ان الفاظ سے باہم تکلم اور تخاطب کرنے لگیں۔

قسم اول کی کیفیت اس طرح ہے کہ قرب زمانہ آفرینش میں کہ ہنوز روے زمین افراد ناس سے مملو ہونے نہ پائی تھی کہ ایک طائفہ مثلاً کسی قطعے کی بود و باش

ترک کر کے آور سرزمین دور دست میں ساکن ہوا اور اس جگہ کاروبار کشت و زراعت اور انتظام امور میں مصروف۔ اور یہ بات واضح ہے کہ اشیاے عالم میں سے ہزارہا چیزیں ایک جگہ ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا نشان دوسری جگہ پایا نہیں جاتا۔ اس خطے میں اس طرح کی اشیا بہت دیکھی گئیں۔ جو کہ اس مقام میں سوا اس طائفے کے اور کوئی نہ تھا کہ ان اشیا کے نام سے ان کو خبر دیتا، ناگزیر ان کے واسطے کچھ نام اپنی طرف سے اختراع کیا، اور زبان سابق کے الفاظ بھی ازمنۂ متطاولہ کے بعد متغیر اور متبدل ہو کر اور صورت میں جلوہ گر ہوتے گئے، اور اسی طرح ایک اور طائفہ اور سمت کی طرف راہی ہو کر کسی اور خطے میں مقیم ہوا اور وہاں اس کو بھی یہی صورت پیش آئی۔ اگرچہ یہاں بھی وہ چیزیں موجود تھیں کہ طائفہ اولیٰ کے مسکن میں پائی گئی تھیں، جو کہ یہ لوگ اس طائفے کی اصطلاح سے واقف نہ تھے، ان اشیا کے واسطے کچھ اور نام وضع کر لیے۔ اسی واسطے ایک چیز کا نام امکنۂ متعددہ میں ایک دوسرے سے مخالف ہوتا ہے، مثلاً ایک جوہر کو کہیں ہیرا کہتے ہیں اور کہیں الماس۔ اور اگر ان اشیا کے سوا تھیں تو ان کے واسطے بھی کچھ اسامعین ہو گئے، اور کبھی اس طرح سے اتفاق ہوا کہ امتداد مدت سے کوئی لفظ وضع کرنے کی احتیاج ہوئی اور جو الفاظ زبان زد تھے، ان میں بھی تغیر اور تبدل راہ پایا گیا، یہاں تک کہ طوائف عالم میں ایسی زبانیں رائج ہو گئیں کہ نہ اس سے یہ مطلع ہو سکے، نہ اس سے وہ۔ ہم اپنی ہی زبان میں ملاحظہ کریں کہ باشندگان دہلی نیشکر کو گنا کاف فارسی مفتوح اور نون مشدد اور الف سے اور دہاقین اور مردم دور دست گانڈا کاف فارسی اور الف اور نون غنہ اور ڈال مثقلہ اور الف سے کہتے ہیں۔ اسی پر قیاس کیا چاہیے آور زبانوں کے الفاظ کو۔

اور دوسری قسم کی کیفیت یہ ہے کہ مثلاً حادثۂ طوفان سے کوئی متنفس باقی نہ رہا اور انسان تولدی مسند وجود پر قدم رکھ کر توالد اور تناسل کا سبب ہوا، جیسے پہلے مرقوم کیا گیا، تو اس صورت میں یہ شخص گفتگو کے واسطے اپنی طرف سے وضع الفاظ میں ساعی

ہوگا اور ہر ہر چیز کے واسطے ایک نام معین کرتا جائے گا، اور جب اس سے ذریت موجود ہوگی بالفعل تو وہ بھی انہیں الفاظ کے ساتھ تکلم کرے گی اور مدت تک یہی ایک زبان رائج رہے گی۔ لیکن جب کثرت خلائق سے انتشار مردم وقوع میں آوے اور ہر طائفہ ایک ایک سمت میں اپراگندہ ہوکر دیار مختلف میں قیام اختیار کرے، ہر ایک کو وہی صورت پیش آوے گی کہ قسم اول میں مذکور ہوئی۔ اختلاف السنہ کی یہ دو صورتیں وہ ہیں جن کو قیاس اقتضا کرتا ہے، لیکن جو کہ کتب تواریخ یا اور مذہب کی کتابوں میں مرقوم ہے، اس کے خلاف ہے۔ تقاضائے مقام داعی ہے کہ اس کی تحریر سے بھی ہاتھ نہ کھینچے اور طالبان شوق پرست کو کہ سوانح غریب اور وقائع دل فریب کے واسطے گوش برآواز رہتے ہیں، ان مقالات عجیب سے مسرور کرے۔

سابق مرقوم ہو چکا ہے کہ یزدان سخن آفرین نے اولین پیغمبر عجم آباد پر ایک کتاب نازل کی ''دساتیر'' نام کہ ہر دانش اور تمام زبانوں پر مشتمل تھی۔ صاحب دبستان مذاہب مجوس کی کتب سے نقل کرتا ہے کہ مہ آباد نے ہر طائفے کو ایک ایک زبان سکھا کر ہر ہر جگہ بھیج دیا تاکہ فارسی اور ہندی اور رومی اور باقی اور زبانیں ظہور میں آئیں۔ توریت کے گیارھویں باب میں حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کی شان میں مرقوم ہے کہ ''اول

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''میں'' نہیں ہے۔

سارے جہان کے آدمیوں کی ایک زبان اور ایک بولی تھی، اتفاقاً جس وقت مشرق سے سفر کیا زمین سنعار میں ایک صحرا دیکھا۔ یہ لوگ وہاں ٹھہرے اور آپس میں کہا کہ آؤ اینٹیں بنا کر آگ میں پکاویں اور اپنے واسطے ایک شہر اور ایسا ایک برج بناویں کہ اس کا سر آسمان سے لگے اور نام پیدا کریں۔ خداوند تعالیٰ نے نزول فرمایا

تا کہ اس شہر اور برج کو دیکھے، اور یہ مصلحت ٹھہرائی کہ یہ گروہ متفق ہے اور زبان بھی ایک رکھتے ہیں اور اس کام کو کیا چاہتے ہیں، اب جس کام کے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس سے باز نہ آویں گے، ان کی زبان میں خلل ڈالنا چاہیے تا کہ ایک دوسرے کی بات کو نہ سمجھے۔ اس طرح پر حق تعالیٰ نے ان کو تمام روے زمین میں پراگندہ کر دیا اور شہر بنانے سے باز رہے۔ اسی واسطے اس جگہ کا نام بابل ہو گیا کہ خدا نے اس جگہ تمام جہان کے آدمیوں کی زبان میں خلل ڈالا اور وہیں سے سب کو تمام روے زمین پر پراگندہ کر دیا'' یہاں تک تو ریت کا ترجمہ ہوا۔

مصنف ''تاریخ خمیس'' نے ''معلم التزیل'' سے نقل کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو تمام لغت تعلیم کیے، پھر اس حضرت نے اپنی اولاد میں سے ہر ہر شخص کے ساتھ ایک ایک لغت میں کلام کیا''۔ انتہی کلامہ۔ مراد لغت سے زبان ہے۔ روضۃ الصفا میں حام بن نوح علیہ السلام کے حال میں مرقوم ہے ''کہ ان کی اولاد میں اٹھارہ زبانیں پیدا ہو گئیں تھیں، ہر فرقہ ایک ایک زبان سے تکلم کرنے لگا۔ جو ہر فرقہ ایک دوسرے کی زبان سمجھتا نہ تھا، ناچار اس نواحی میں پراگندہ ہو گئے اور ہر گروہ نے ایک ایک شہر بنا لیا۔ اور سام بن نوح کے حال میں تواریخ کی بعضی کتاب سے نقل کیا ہے کہ جو کہ سام بن نوح کی اولاد کی زبانیں اس طرح مختلف ہو گئی تھیں کہ انیس زبانوں میں کلام کرتے تھے اور کوئی قوم ایک دوسرے کی زبان سمجھتی نہ تھی، ہر ایک علیحدہ علیحدہ نواحی میں جا بسے۔ اور نمرود علیہ اللعنۃ کے آسمان کی طرف صعود کرنے کے حال میں مرقوم کیا ہے کہ نمرود کے حکم سے سال ہاے دراز میں ایسا منارہ بلند تیار ہوا کہ مرغ وہم اس کی بلندی تک پرواز نہیں کر سکتا تھا۔ ایک روز نمرود اس منارے پر چڑھا اور وہاں سے آسمان کو اسی قدر بلند دیکھا جتنا زمین سے بلند دیکھا تھا، ناچار پشیمان ہو کر اتر آیا۔ دوسرے دن وہ منارہ گر پڑا اور اس سے ایسی آواز مہیب پیدا ہوئی کہ سب بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے اپنی اپنی

زباں بھول گئے اور ہر قوم کی زبان علیحدہ ہوگئی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ بہتر زبانیں ان لوگوں میں پیدا ہوگئیں۔ جو کہ اختلاف السنہ اس سرزمین میں بہم پہنچا تھا، اس واسطے اس اقلیم کو بابل کہنے لگے'' ''روضۃ الصفا'' کا ترجمہ تمام ہوا۔

عقلاے باریک بیں خوب جانتے ہیں کہ اختلاف السنہ کی کیفیت جس طرح کہ بہ حسب قیاس مرقوم ہوئی، شائستگی قبول اور صلاحیت پزیرائی رکھتی ہے والا باقی گفتار دور از کار اور اقوال غرابت اشتمال جو کتب تواریخ سے منقول ہوئے ہیں، سوائے اس کے کہ رطب ویابس چند ذخیرہ اوراق ہو کر سیاحان ممالک سخن کے واسطے ایک مشغلہ بہم پہنچاوے، اور کسی طرح سے برومند نہیں کرتے۔ بہر کیف مقدمہ اس تبصرۂ جلیلہ کا اتمام کو پہنچا۔ اب وہ وقت ہے کہ خامۂ تیز رفتار مقصد اول کی تحریر میں سرگرم ہو اور مطلب اہم کی تسطیر میں مستعد۔

مقصد پہلا

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

زبان اردو کی تحقیق اور وجوہ استعمال الفاظ فصیح اور ترک کلمات غیر فصیح

دانش مندان فہیم پر مخفی نہیں ہے کہ اوائل روزگار میں دلی کے رہنے والوں کی زبان صرف ہندی تھی، جس کو ''بھاکھا'' کہتے ہیں۔ اور چونکہ قدیم سے یہ ممالک راجا ہائے ذوی الاقتدار کی حکومت سے حکام ممالک بیگانہ کی تعدی سے محفوظ تھے، اور اطراف و جوانب کے آدمیوں کی سکونت اس دیار میں اس کثرت سے وقوع میں نہ آئی تھی کہ ان کی زبان کے لغت اس زبان میں مخلوط ہو کر یہاں کی بولی کو اپنی اصل سے متغیر کر دیتے، اسی واسطے وہ زبان خالص ہندی تھی۔ لیکن جب کہ بادشاہان دین دار اور سلاطین تہور شعار نے ترویج ملت اور ترقی دین کے واسطے کمر ہمت کو چست کیا، اور نیر رخشان اسلام سے شبستان ہند منور ہوا، اطراف دور دست کے لوگ جوان سلاطین بلند ہمت کی رکاب دولت سے انتساب رکھتے تھے، اس خطے کے دارالسلطنت ہو جانے کے سبب سے یہیں سکونت پزیر ہوئے اور سلسلہ توالد و تناسل کا ان سے جاری ہوا اور علائق کی کثرت وقوع میں آئی اور یہ پایے بندی توطن کا باعث ہوئی۔ باشندگان قدیم کو ان کے ساتھ اختلاط بہم پہنچا اور ہم زبانی کثرت سے عمل میں آئی۔ ناگزیر ان کی زبان کے الفاظ ان کی زبانوں میں مخلوط ہونے لگے۔ اور چونکہ بادشاہان اسلام مختلف دیار سے وارد ہوئے، مثل سلطان محمود غزنوی اور غوری اور لودھی اور سلاطین چغتائی، ہر ملک کی زبان کے لغت نوبت بہ نوبت اس زبان میں داخل ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ زبان ہندی اپنی اصل پر نہ رہی اور السنۂ مختلف سے مل کر لباس نو میں جلوہ گر ہوئی۔ چونکہ یہ لوگ اردوے معلٰی سلاطین کے متعلقین سے تھے اہل ہند ان الفاظ مخلوط کو زبان اردو کہتے تھے، یعنی یہ الفاظ جو ہماری زبان میں مل گئے ہیں، سلاطین کے اردو کی بولی کے ہیں، لیکن رفتہ رفتہ یہ زبان تازہ کہ مجموع الفاظ ہندی و لغات السنہ مختلفہ سے بہم پہنچی تھی، زبان اردو کے اسم

سے مسمی ہوگئی۔ پھر کثرت استعمال سے ''زبان'' کا لفظ محذوف ہوکر اس زبان کا نام خود ''اردو'' ہوگیا۔ اس کا نظیر ہے بغرا اور پرویز کا لفظ کہ بغرا نام ہے ایک بادشاہ کا بادشاہان ترکستان سے، اس نے ایک قسم کی آش اختراع کی تھی اور اس کو آش بغرا کہتے تھے۔ اب آش کا لفظ محذوف ہوگیا اور وہ آش بغرا کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اور پرویز زبان پہلوی میں ماہی کو کہتے ہیں۔ جو کہ خسرو پرویز کے لقب سے ملقب تھا پھر مرور زمنہ اور انصراف دھور کے بعد لفظ خسرو محذوف ہوکر اس بادشاہ کا نام پرویز مشہور ہوگیا۔

جب اردو کی حقیقت دریافت ہوگئی تو اب سنا چاہیے کہ زبان کا حال اوائل میں ایسے طعام سے مشابہ تھا کہ ناواقفان اس طریق اشیائے مختلفہ سے تیار کریں، جو کہ ہر چیز کے اندازے سے مطلع اور ہر شے کے اختلاف کی کیفیت سے آگاہ نہیں ہیں، تو بے شک وشبہ اول وہ طعام بے مزہ اور دور از کار ہوگا۔ لیکن جب اس کے پکانے کا بار بار اتفاق ہو اور ہر دفعہ اجزا کی کمی وبیشی علم میں آوے تو قوت ممیزہ طعم سابق اور مزۂ حال سے ایسا نتیجہ معتدل حاصل کرے کہ اس سے بہتر متصور نہ ہو۔ اسی طرح یہ زبان بھی روز بہ روز تراش وخراش پیدا کرتی گئی، ہر زمانے میں اس شاہد اول فریب نے زیور تازہ سے آرائش پائی اور ہر عہد میں خلعت جدید سے زینت بہم پہنچائی۔ چشم تماشا کشادہ ہے اور ساز امتیاز آمادہ، سابقین کا کلام پیش نظر ہے، چشم انصاف سے دیکھیں کہ سابق ولاحق میں کس قدر تفاوت جلوہ گر ہے۔ روزمرہ اہل سخن کا ولی کے زمانے میں کیا تھا اور سودا ومیر کے عہد میں کیا ہوگا، لیکن ادراک کافی اور تمیز وافی نے اس تقطیع پر قناعت اور اس انداز پر بس نہ کی اور ہر لمحہ شوق کا یہ تقاضا تھا:

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن دوست
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد

تا رفتہ رفتہ کوس فصاحت کا طنطنہ گوش ملائک تک پہنچا اور ہنگامۂ بلاغت کا غلغلہ

سقف فلک تک بلند ہوا۔ اس آئینے نے اور ہی جلا پائی اور اس گوہر نے اور ہی صفا، فصحائے بالغ رس ہر طرف بساطِ ہستی پر خراماں ہوئے اور شعرائے روشن نفس ہر جانب عرصۂ وجود میں گرم جولاں۔ ان سخن سنجان معنی شناس کی بلند نامی نے نام آوران عہد سابق کے آوازے کو پست کر دیا اور ان بلبل نوایان خوش نوا کے زمزمے نے باریک بینان انصاف دوست کو مست۔ نہ ان کے نغمے کے مقابل نوائے عندلیب

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''مشاہدہ'' ہے۔

کو رواج اور نہ ان کے سجع کے روبرو قمری کی حرف زنی کی احتیاج۔ ہر چند منعم بے منت کا خواب افاضہ فراخ ہے اور اس مائدۂ عام پر ہر گرسنہ چشم کا دست ہوس دراز لیکن رسم قدیم ہے کہ خواص و عام میں تفاوت مراتب جلوہ نما ہوتا ہے اور دور و نزدیک میں فرق پردہ کشا۔ خوان سالار نعمائے فیض کی تربیت نازک طبعان حضرت شاہ جہان آباد کی طرف اور ہی التفات سے معطوف ہے اور توجہ خاص ان کی شان میں اور ہی طرح سے مصروف:

اطفال		مجسطی	آفریتند
اوباش	شفا	در	آستینند

اگر اس بزم دل کشا کے نغمہ طرازان عندلیب گفتار میں سے دو چار خوش نوایوں کے معجز طرازی کی کیفیت کا زمزمہ نوازش میں آوے، قانون مقام شناسی سے خارج نہیں ہے۔ نمک چشش مائدۂ معانی و بیان حافظ عبدالرحمٰن خان احسان نے خواب سخن کو ایسا آراستہ کیا کہ نہ سبزان ہند کے حسن میں وہ ملاحت ہے اور نہ خوبان خلخ و نوشاد کی ادا و انداز میں وہ ملاحت ا۔ صاحب گفتار دل پذیر شاہ نصیر نے تشبیہ و استعارے

کو اس طرح سے رتبہ اعجاز کا بخشا کہ لب کی تشبیہ نے برگ گل کو گویا کر دیا اور قامت کے استعارے نے سرو کو خراماں۔ فخر الشعرا امیر نظام الدین ممنون کی لطافت سخن اور صفائی کلام کی صفت سے نقش مسطر سلک گوہر ہو جاتا ہے اور صفحۂ کاغذ آئینۂ گیتی نما، خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کی غزل طرازی سے حسن خوبان کی شان بلند اور اس سخن سنج کی قصیدہ گوئی سے ممدوح کا پایہ ارجمند، معنی نوار سخن طراز مرزا اسد اللہ خاں غالب

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''حلاوت'' ہے۔

کا کلام ہے یا اعجاز مسیحا اور اس سحر بیان معجز تبیان کا قلم ہے یا عصائے موسیٰ۔ یکہ تاز کشور فصاحت محمد مومن خان مومن نے سخن کو ایسی نزاکت دی کہ پرنیان اس کے سامنے خارا ہے اور معنی کو وہ فروغ بخشا کہ آفتاب اس کے روبرو بے نور و ضیا ہے۔ بلند پایہ بارگاہ عزت و شان نواب مستطاب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ ہی کی مرتبہ افزائی کا طفیل ہے کہ سخن کا سر آسمان سے ٹکر کھاتا ہے اور پائے فکر عرش سے فرو نہیں آتا۔ کشور خدائے فضل و ہنر نواب معلی القاب محمد ضیاء الدین خان نیر نے زمین سخن کو آسمان بنا دیا اور سواد حرف کو خورشید درخشان۔

ان کامل عیاران بالغ خرد کے مدارج کمال پر جب نظر پڑتی ہے، خلوت ضمیر سے ندا آتی ہے اور عرش خیال سے وحی کہ ہر ابتدا کے واسطے نہایت ہے اور ہر آغاز کے واسطے انجام۔ کمال ان دقیقہ سنجان والا رتبت کے طفیل سے نہایت کو پہنچ گیا اور سخن ان باریک بینان بلند مرتبت کی وجہ سے اپنی غایت کو، کمال کی رفعت شان انہیں کی منزل طبیعت میں متوقف ہے اور سخن کی بلندی مرتبت انہیں کی خلوت ضمیر میں معتکف۔ ہیہات ہیہات! زبان کیا بے صرفہ سرا ہے اور یہ حرف کس قدر پوچ و پادر

ہوا۔ مبدأ فیاض پر بخل کی تہمت باندھنی کی کی تجویز ہے اور ایسے ابر کرم کو ترا وش سے خالی جاننا کیا عقل و تمیز ہے، ھنوز محیط کرم جوش میں ہے اور دریائے عطا خروش میں، چشم خرد کو باز کر اور ہوش و تمیز کو جلوہ طراز کہ رافع رایات بلند خیالی، آبیار گلشن رنگین مقالی، بلبل چمن زار سخن طرازی، طوطی شکرستان ہنر پردازی، زیب و سادہ معنی آرائی، فرزند ارجمند حضرت صہبائی، صاحب طبع سلیم، مولوی عبدالکریم سوز تخلص سلمہ اللہ تعالی کا سخن سپہر برین کے اوج پر جلوہ فرما ہے اور سطح عرش پر بساط آرا۔ بلندیٔ معنی اس سخن طراز بے عدیل کی سلم فکر کے شکر سے سبک دوش اور زبان سخن اس معنی نواز کی نعمت تربیت کے سپاس سے خاموش نہیں ہو سکتی۔ فصاحت کو اس کی طبیعت رسا کی مدد سے بلاغت پر ناز ہے اور بلاغت کو اس کی فکر تیز پا کی رہ بری سے حد کمال سے آگے قدم بڑھانے کا انداز ہے۔ باوجودیکہ اس نادرۂ فن کے سخن کا مرتبہ کس قدر بلند ہے لیکن بلند ھمت ھنوز اس پایہ والا کے حصول اور اس منزل عالی کے وصول پر قانع نہ ہو کر ہر ساعت ارتقائے مدارج کی داعی اور اعتلائے مراتب میں ساعی ہے۔ سچ یہ ہے:

ھمت بہ ہیچ مرتبہ راضی نمی شود

ایزد معنی آفرین اس آبیار گلشن کمال کے نخل استعداد کو اشجار خلد سے زیادہ بارور کرے اور اس چمن طراز حدیقۂ افضال کے نہال افاضہ کو طوبی سے زیادہ سایہ گستر کہ گل زمین دہلی اس خرد زمان میں اسی کی جوئبار طبیعت سے گلشن ہے اور اس شبستان کا چراغ اس کے شعلۂ فکر سے روشن۔ جب ایسے کملائے اصمعی زبان اور فصحائے سحبان بیان بساط وجود پر جلوہ گر ہوں تو فضائے جہان آباد کو عراق و خراسان پر کس طرح ناز نہ ہو۔ حق یہ ہے کہ فصاحت اس خطۂ لطافت بنیاد میں آسمان سے برستی ہے اور زمین سے اگتی ہے۔ ایوان یہاں کے ابیات بلند ہیں اور خشت و سنگ الفاظ متین طاق اور محراب دوائر خوش ترکیب ہیں اور نقش و نگار مضامین رنگین۔ اس

گلشن جنت آئین میں درخت فصاحت کی یہ تازگی اور ریاض بلاغت کی یہ سیرابی مقام تعجب اور محل شگفت نہیں کہ یہ نہال انہیں باغبانان گلزار ہنر کا دست نشان ہے اور یہ ریحان انہیں نخل بندان گلشن کمال کی سعی سے شگفتہ و ریان۔

ارباب دانش پر مخفی نہیں ہے کہ زبان اردو کا رواج مصاحت پیشگان پایۂ تخت شاہی سے آغاز ہوا تھا اور انہیں نونہالان چمن زار کمال کا جہد اس حدیقہ سیراب کا چمن طراز، ہمیشہ اس گل زمین میں تصرف مالکانہ کو کام کرتے رہے اور اس ایوان رفیع کی مرمت و آرائش میں اہتمام۔ رفتہ رفتہ اس کے حسن و بہا نے کمال پایا اور اس کی زیب و زینت نے ایک جمال بہم پہنچایا۔ روز بہ روز ترقی جلوہ گر رہی اور ہر بار اس دولت روز افزوں میں زیادتی متصور۔ جو کہ گرسنہ چشمان دور دست زلہ ربائے محض اور گدائے صرف تھے اور موائد حضور سلطانی کے نمک چش اس دست پخت کے مالک، وہ فقط ریزہ چند پر متصرف اور یہ ہر طرح کے تصرف کی راہ میں سالک۔ آخر کاران کی سعی نے یہ رنگ دکھایا اور ان کا نہال جہد یہ ثمر لایا۔

اندیشہ اس تجسس میں تھا اور فکر اس تلاش میں کہ بہارستان کمال میں ایسا بھی کوئی گلشن آرا ہے کہ نخل بندان گل زمین جہان آباد گل چینی ہنر میں اس کے محتاج ہوں اور گل دستہ بندیٔ فصاحت میں اس کے پیرو۔ قائد بخت رہبر ہوا اور اس مرجع کل کا آستانہ میسر۔ فارسی کو اس آستانے کا ملازم پایا اور اردو کو اس دروازے کا چاکر۔ فارسی کو وہیں سے اعتبار یعنی جامع علوم، رہبر فہوم، بانی بنائے کمال، موجد مراسم فضل و افضال، مفتی چار ملت، مسند الیہ شش جہت، شگفتگی بخش خاطر ہائے افسردہ، مولوی محمد صدر الدین آزردہ۔ خامہ سخت منفعل ہے کہ ان دو وصف اکو تعداد اوصاف کی سلک میں اس طرح سے منسلک کیا کہ گویا اس جامع کمالات کے فضائل انہیں دو چیز میں منحصر ہیں اور حال یہ ہے کہ ہر کمال کا مرجع اسی کی ذات حمیدہ صفات ہے اور ہر فضیلت کا منبع اسی کی طبیعت والا درجات لیکن محل کا تقاضا اور مقام

کا اقتضا کشاں کشاں جادۂ گستاخی میں عنان افگن ہوا اور سوئے ادب کی راہ میں گام زن۔ حق یہ ہے کہ اسی کے ابر عنایت طبیعت کی نیسانی سے دلی کی خاک چمنستان شیراز سے رنگین تر ہے اور اسی منبع لطف کی عمانی سے اس خطے کا آب اصفہان کے زندہ رود سے شیریں تر۔ شوق سخن سرائی ہنوز چاہتا ہے کہ اس زمزمہ پیرائی سے لب بند اور اس گفتگو کے مقابل خاموشی کو پسند نہ کرے۔

لیکن نوسبقان ۲ مکتب کمال کا افادہ ناچار عنان کش اور ہر نفس متقاضی ہے کہ جب زبان اردو کی اصل یہی خاک پاک مقرر ہوئی اور اسی گل زمین کے اہل کمال کی پیروی جادۂ مقصود میں راہ برتو اب لازم ہے کہ ان الفاظ کی تفصیل مرقوم ہو کہ فصحا کی دارالضرب تمیز میں سکۂ امتیاز سے نامی ہے اور بلغا کی بارگاہ قبول میں خلعت اعتبار سے گرامی تاکہ متتبع کو رشد و تمیز حاصل ہو جاوے اور ہر ناقص فطرت اس سرمایۂ امتیاز کے حصول سے کامل۔

۱۔ نول کشوری نسخے میں دو ''صفت'' ہے۔

۲۔ نسخہ مطبوعۂ نول کشور میں یہ لفظ ''توسقان'' ہے۔

لیکن اول معلوم کیا چاہیے کہ فصاحت لغت میں کشادہ سخن اور درست مخارج ہونے کو کہتے ہیں، جیسے صراح میں مرقوم ہے اور سخن عام ہے، خواہ کلمہ ہو خواہ کلام۔ جو کہ کشادہ سخن اور درست مخارج ہونا وصف صاحب سخن اور صاحب مخارج کا ہے، شخص کو فصاحت کے ساتھ متصف کرتے ہیں اور کہتے ہیں ''شاعر فصیح''۔ شاعر کی فصاحت عبارت ہے ایسے ملکے سے کہ اس کے سبب سے الفاظ فصیح کے ساتھ مقصود کے بیان کرنے پر قادر ہو جاوے اور جو کہ کشادگی اور درستی سخن کا وصف ہے، کلمہ و کلام کو بھی فصیح کہتے ہیں مثلاً کلمۂ فصیح اور کلام فصیح اور قصیدۂ فصیح۔ فصاحت کلمہ یہ ہے

کہ اس کے حرفوں کا تلفظ زبان پر گراں نہ ہو یا وہ کلمہ ایسا نہ ہو کہ وحشی اور غیر مانوس ہونے کے سبب سے خواہ قیاس اور قوانین متعارفہ کی مخالفت سے معنی مقصود پر دلالت ظاہرہ نہ رکھتا ہو۔

امر اول عبارت ہے درستی مخارج سے اور امر ثانی کنایہ ہے کشادگی سخن سے، کس واسطے کہ جو لفظ غیر مانوس اور قیاس وقوانین متعارفہ کے مخالف نہ ہوگا، فہم معنی میں صعوبت واقع نہ ہوگی اور کشادگی سخن اسی کا نام ہے اور فصاحت کلام یہ ہے کہ وہ قواعد نحوی سے معرا یا ایسے امر پر مشتمل کہ اس سے فہم معنی دشوار ہو جاوے، یا ایسے کلمات سے مرکب نہ ہو کہ ان کے اجتماع سے تلفظ میں گرانی بہم پہنچے۔ گو کہ ہر کلمہ بجائے خود فصاحت رکھتا ہو اور ان امور ثلثہ سے خالی ہونے کے باوجود اس سخن کے الفاظ بھی بجائے خود فصیح ہوں۔

جب یہ دریافت ہو گیا تو اب سننا چاہیئے کہ فصاحت کلمے میں ان امور ثلثہ کو تنافر حروف اور غرابت اور مخالفت قیاس لغوی کہتے ہیں اور فصاحت کلام میں ان چیزوں کو ضعف تالیف اور تعقید اور تنافر کلمات کے ساتھ مسمّی کرتے ہیں۔ تنافر حروف کی مثال عربی میں مستشزرات اور فارسی میں ششدر اور ہندی میں ٹٹّی، کس واسطے کہ دو شین اور دو تائے مثقلہ کا اجتماع تلفظ میں گرانی پیدا کرتا ہے اور غرابت کی مثال عربی میں سیف مسرج یعنی تلوار جو سریج کے ساتھ نسبت رکھتی ہو اور سریج سین مہملہ مضموم اور رائے مہملہ مفتوح اور یائے تحتانی ساکن اور جیم تازی سے نام ہے ایک آہن گر کا کہ سیف اس کے ساتھ منسوب ہوتی ہے اور فارسی میں مدینیدن اور مکیدن اور عمریدن اور ابا بکریدن اور دیریدن یعنی مدینے اور مکے او رعمر اور ابا بکر کی زیارت کرنی اور کسی کام میں درنگ کرنی اور ہندی میں جیسے سودا نے ایک قصیدے میں پھڑکنت اور چٹکنت اور ڈپٹنت اور کھسکنت، پھڑکنے اور چٹکنے اور ڈپٹنے اور کھسکنے سے اشتقاق کیا ہے۔

اور مخالفت قیاس لغوی کی مثال عربی میں ''اجلل'' فک ادغام سے بجاے اجل کے کہ واضع سے ادغام کے ساتھ ثابت ہے اور فارسی و ہندی میں اس قسم کے الفاظ نظر سے نہیں گزرے۔ مثال ضعف تالیف کی عربی میں اضمار قبل الذکر لفظاً اور معناً اور حکماً اور فارسی میں رم وحشت، کس واسطے کہ معنی وحشت کے رم ہے اور اجافت کسی چیز کی مثل کی طرف جائز نہیں۔ اسی قبیل سے ہے استعمال ایسے الفاظ کا کہ اہل زبان کا روزمرہ اس استعمال پر مساعدت نہ کرتا ہو، جیسے مرزا بیدل کے کلام میں خرام کاشتن اور امیر خسرو دہلوی کے شعر میں ازگرہ او چہ میرود کیوں کہ کاشتن کا اطلاق خرام پر مسموع نہیں ہے اور اہل زبان کا محاورہ از کیسۂ او چہ میرود ہے نہ از گرہ ٔ او چہ میرود اور ہندی میں سحر ہو جائے بجاے تڑکا ہو جائے کے اور ہاتھ پاؤں پھولنے کی جگہ دست و پا پھولنا اور محاورۂ فارسی کا بعینہ ترجمہ کرنا مثلاً حقہ پینے کے معنی میں حقہ کھینچنا اور ستار بجانے کے محل میں ستار مارنا۔

تعقید دو قسم ہے: ایک یہ کہ لفظوں میں تقدیم یا تاخیر یا حذف اس طرح سے واقع ہو کہ معنی مراد کا سمجھنا صعب اور دشوار ہو جاوے۔ اس کو تعقید لفظی کہتے ہیں، جیسے 'تیغ سے زخمی ہو گیا' کی جگہ 'زخمی ہو تیغ سے گیا'۔ دوسرے یہ کہ الفاظ کے معنی لغوی سے مقصود کی طرف ذہن منتقل نہ ہو اور یہ بات اکثر لوازم کے بعد اور قراین دالہ کے خفا کے سبب سے ہوتی ہے، جیسے کسی شخص نے یہ مضمون شعر فارسی میں موزوں کیا ہے کہ

اگر زنبور عسل تیرے چمن حسن میں آ بیٹھے
تو کچھ عجب نہیں کہ گل شمع سے گلاب کھینچیں

اور کسی نے یہ مضمون باندھا ہے کہ

جس وقت کہ باد صبا نے خاکستر پروانہ کو چمن میں بلبل نالاں کے روبرو ڈال دیا تو نگس خندہ زن ہوئی اور ابر خجالت سے تر۔

گل شمع سے گلاب حاصل ہونے کا یہ سبب ہے کہ حسن رخ میں ہے اور رخ کو گل باندھتے ہیں، پس جب حسن سے زنبور منتفع ہوئی، اس میں مادہ گلاب کا حاصل ہو جائے گا اور اس سے شہد پیدا ہوگا اور اس شہد کے موم سے شمع بنے گی، پس گلاب کا مادہ زنبور سے شمع تک منتقل ہوتا چلا آوے گا اور 'خندۂ مگس' اور 'خجالت ابر' کا یہ سبب ہے کہ مگس سے شہد حاصل ہوا تھا اور شہد کے موم سے شمع بنی اور پروانہ اس کے عشق میں جل کر خاکستر ہو گیا اور ابر کے برسنے سے گل پیدا ہوا اور اس پر بلبل عاشق تھی۔ جو کہ پروانہ کا جل کر خاکستر ہونا کمال عشق پر دال ہے اور بلبل کا عشق میں زندہ رہنا خامی پر، پس مگس اپنے متعلق کے عاشق کے کمال سے مسرور ہوئی اور ابر اپنے متعلق کے عاشق کی خامی سے شرمندہ۔ جب تک یہ مناسبات بیان نہ کیے جاویں، ان دونوں مضمونوں کا سمجھ میں آنا دشوار ہے۔

اور تنافر کلمات کی مثال ہے 'قرب قبر'، یہ دونوں لفظ ہر چند علٰحدہ علٰحدہ فصیح تھے لیکن ان کا اجتماع گرانی کا سبب ہو گیا۔ جب فصاحت کی ماہیت اور اس کی اقسام پر آگاہی حاصل ہو گئی تو اب معلوم کیا چاہیے کہ زبان کے ساتھ فصاحت بھی ہر زمانے میں جدا اعتبار پیدا کرتی جاتی ہے۔ بعضے الفاظ اوائل میں زبان خواص پر جاری تھے اور ان کا استعمال بالاتفاق سخن سنجان بالغ خرد کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ تھا۔ متاخرین نے یا ان میں فی الجملہ تصرف یا قطعاً ترک کیا۔ اب اگر وہی الفاظ ہماری زبان پر آئیں تو جو لوگ ادراک اور تمیز میں پایۂ بلند رکھتے ہیں، ان کو گراں اور موجب تنفر طبیعت سمجھتے ہیں۔ اور یہ گرانی خواہ بہ اعتبار واقع کے ہے، خواہ اس سبب سے کہ ہم کو ان الفاظ سے انس باقی نہیں رہا اور ظاہر امر ثانی ہے، کس واسطے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میں بعضے الفاظ ہندی ایسے مستعمل ہیں کہ حالت انفراد میں مکروہ اور ترکیب میں مقبول ہیں، مثلاً 'بھلا' 'اچھے' کی جگہ اور 'چنگا' 'تندرست' اور 'مانس' 'آدمی' کی جگہ علٰحدہ استعمال کریں اور یوں کہیں کہ 'وہ چیز بھلی' یا 'وہ مکان بھلا ہے'،

اور 'وہ شخص چنگا ہے' یا 'ایک مانس آیا تھا' تو کس قدر مکروہ اور نا گوار معلوم ہوگا اور 'بھلا آدمی' اور 'بھلا چنگا' اور 'بھلا مانس' فصیح اور **مستعمل** ہے اور بعضے الفاظ فارسی مفرد مکروہ اور جمع مرغوب ہیں، مثلاً یوں نہیں کہتے کہ 'صد آدمی اور لکھ آدمی آئے تھے' بلکہ 'صدہا آدمی اور لک ھا آدمی آئے تھے'۔ یہ صرف اسی سبب سے ہے کہ اس طرح مانوس نہیں اور اس طرح مانوس ہیں، اسی واسطے کہتے ہیں کہ الفاظ مانوس الاستعمال چاہییں۔

اس صورت میں اہل زبان کو تو یہ چاہیے کہ بنائے سخن ان الفاظ پر رکھیں کہ عہد حال میں **مستعمل** ہوں، اگرچہ قدما نے اور طرح سے استعمال کیا ہو۔ ان کو صرف اپنی جماعت کے روزمرہ کی طرف رجوع کرنا صحت محاورہ کے واسطے کافی ہے اور مقلد اور متتبع کو اہل زبان کے محاورے کی تلاش ضروری اہے، تا کہ نقد سخن بوتۂ امتحان میں کامل عیار اور میزان قبول میں صاحب اعتبار ہو جاوے اور یہ معلوم رہے کہ متتبع اور مقلد سے فقط اور ملک کا آدمی مراد نہیں ہے بلکہ جب اہل شاہ جہاں آباد کی زبان

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''ضرور'' ہے۔

اصل اور منشا قرار دی گئی ہے تو ہند کے اطراف کے لوگ اگرچہ اکبرآباد و بنارس حتیٰ کہ کان پور اور لکھنؤ کے رہنے والے ہوں، سب دائرۂ تقلید اور احاطۂ تتبع سے خارج نہیں ہو سکتے۔ پس باشندۂ شاہ جہان آباد کو استعمال الفاظ اور اختیار روزمرہ میں صرف اپنے محاورے پر اعتماد چاہیے نہ اطراف کی زبان اور نہ قدما کے استعمال پر اور متتبع کو چاہیے کہ نہ اپنی زبان کو پیرو ہو اور نہ قدما کا بلکہ اس خاک پاک کے روزمرہ کو عیار سخن اور میزان ہنر قرار دے کر اس زبان کی جادۂ تقلید سے انحراف اختیار نہ

کرے۔ جو کہ متتبعان زبان فارسی کی عادت اس طرح کی دیکھی جاتی ہے کہ محاورہ و استعمال الفاظ میں کلام قدما کی سند کو کافی جانتے ہیں تو جو لوگ مسالک نفس الامر سے ناواقف ہیں بعضے مقام میں پہلے شعرا کی اتباع سے روزمرہ کے خلاف گام زن ہوتے ہیں، چنانچہ بعضوں نے شعر سودا کے دست آویز سے **خلش** کو مذکر استعمال کیا، سودا کا شعر یہ ہے:

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے
کہ جس نے دل سے مٹایا **خلش** رہائی کا

اور یہ نہیں جانتے کہ ہندی نژاد ان فارسی خوان کو تحقیق محاورۂ حال سے دو امر مانع ہیں: ایک یہ کہ بہ سبب بعد مسافت کے اس دیار دور دست میں پہنچ کر اہل زبان سے بلا واسطہ تحقیق نہیں کر سکتے اور دوسرا یہ کہ زبان دانان عہد حال کا کلام ان امکنۂ بعیدہ سے یہاں تک پہنچ نہیں سکتا۔ اقتضائے مقام چاہتا تھا کہ کلمات فصیح اور غیر فصیح بہ تفصیل لکھے جاویں تا کہ مقلدین سراپا انصاف مستفید اور متتبعین بے انصاف مستفیض ہوں لیکن اطناب سخن مانع ہوا۔ ناچار اسی قدر افادے پر اختصار کیا اور چاہا کہ مقصد ثانی کی راہ میں گام زن ہو، لیکن بعضے احباب متقاضی ہوئے کہ اگر اس فائدۂ جلیلہ سے مستفیضان شوق سرشت محروم رہے، بارے وہی الفاظ اس جگہ لکھے جاویں کہ اپنی اصل سے جدا ہو کر زبان اردو میں **مستعمل** اور کچھ کچھ عوام اور بعض خواص کی زبان پر جاری ہیں، تا کہ ''مالا یدرک کلہ لایترک کلہ'' کا مضمون متحقق اور شوق استفادہ جی الجملہ حصول مرام کا پاس دار ہو۔ ناگزیر ہر چند اس قسم کے لفظ غیر متناہی اور حصر و شمار سے افزوں ہیں لیکن مختصراً چند لفظ مرقوم کیے جاتے ہیں کہ ''مشتے نمونہ از خر منے'' مشہور اور زبان خاص و عام پر مذکور ہے۔

_______صفحہ نمبر ۱۲۶__تک

اول وہ لفظ جو **مستعمل** ہے اور اس کے بعد اس کی اصل مرقوم ہوتی ہے: 'ابا'

لف مفتوح اور بائے مشدد مع الالف سے 'پدر'، اب لفظ عربی سے 'اترانا' 'اطراء' همزہ مکسور اور طائے مہملہ مع الف سے ستائش میں مبالغہ کرنے کو کہتے ہیں، 'اجوائن' دوائی مشہور، 'جوانی' جیم مکسور ہے، 'اخ تھو'، حائے مخلوط ہے، اخ وتف یا 'اخ' و'تھو' ضم حائے ہوز سے، 'ارداوہ' آرداب، یعنی آرد پانی مُس خمیر کیا ہوا کہ گھوڑوں کو کھلایا جاوے، لیکن اب خصوصیت 'آرد' کی باقی نہیں رہی۔ 'افراتفری' 'افراط تفریط' 'آلی بالی' 'آرے بلے' اور بعضے 'آلے بالے' کی جگہ 'تالے بالے' بھی کہتے ہیں، 'اما' یعنی مادر 'ام' ہے کہ لفظ عربی ہے۔ بانھ گیر، بار گیر، بجاز، پارچہ فروش، بزاز۔ 'پجاوہ حائے' فارسی اور جیم تازی وہ جگہ جس میں خشت پکائی جاوے۔ 'پڑاوہ پولیش، یائے تحتانی سے، 'پوش' یعنی 'دور شو'۔ بھارکس حائے مخلوط اور آخر سین مہملہ، ارابہ کلاں بار کش۔ بھینی بھینی متوسط الحال مثلاً آواز بھینی بھینی یا رنگت بھینی بھینی، بین بین۔ پھانا اور پھنی نون مشدد سے آلہ سنگ تراشی فانہ۔ تارتلا لام مشود سے تار طلا، ٹاٹ بافی تار بافی ہے، تشنہ بمعنی طعنہ تشنیع ہے، تانا مقابل بانے کے شاید اصل اس کی تار یا تان نون سے ہو کہ تار کا مبدل ہے جیسے اس مصرعے میں ع ''تا خلعت وجود تراپود وتاں کند'' اور شاید کہ لفظ جدا گانہ ہندی ہو۔ تپسی بائے فارسی اور سین مہملہ مع الیا سے مجاہدہ، غالباً تپاس سے بنالیا ہے کہ تپاس فارسی میں گرمی کی ہلاکت سے بے خود ہونے کو کہتے ہیں اور جو کہ یہ لفظ زبان بھاکا میں مستعمل ہے، غالب کہ توافق لسانین کے قبیل سے ہو۔ تھوک شاید لفظ تھو کے کے ساتھ کاف لاحق ہو گیا ہے اور حائے ہوز کو مخلوط استعمال کر لیا ہے۔ تو تیہ تمہید تو طیہ، تو بہ تنسو توبتہ النصوحا، تاشہ ساز معروف طاس، چلمچی چیلا پچی یائے تحتانی درمیان جیم فارسی اور لام کے اور بائے فارسی درمیان الف اور جیم فارسی دوم کے اور یہ لفظ ترکی ہے۔ جازم جاجم دو جیم سے، جھک جھک بک بک، جق جق وبق بق، مولوی روم فرماتے ہیں:

اہل دنیا کافران مطلق اند

روز و شب در بق بق و در بق بق اند

جھلندن' عجب نہیں کہ 'جان کندن' سے بنایا گیا ہے، جھاڑو جاروب میں تصرف ہوا ہے یا جارو میں کہ اس کا مخفف ہے۔ خیر سلا لام مشدد سے خیر و صلاح ہے، خشخت پارچۂ چار گوشہ کہ جامے کی بغل کے نیچے یا تیبان میں لگاتے ہیں۔ خشتک، دم درود، دم و دود، دائی دایہ، راج معمار ازرجالہ زالہ، زری، کوٹہ زری کہنہ، زلفی زرفین، زدغل جرغل کہ لفظ عربی ہے سڑک راے مشقلہ ہندی سے اراہ بزرگ، شرک اشین معجمہ سے، لفظ عربی سور فاختہ تال معروف اصول فاختہ سنبل خار اور سنبل کھارسم الفار، سریش سریشم، شرواشوربا، شولہ طعام معروف شل شتا تاے مشدد سے، صدقہ وصلہ صلاح صلاء، طعنہ منہ لفظ منہ مہنتہ ہے تای مصدری سے بمعنی خواری کے طعن تشنعہ طعن و تشنیع، طعن طروز طعن وطنز، غرقش غرنمش، قلانچ مفلس قلاش قبور قربوس یعنی کوہر زین، کھودھاے مخلوط سے سود کے وزن پر خوید، کھیسہ کیسہ، کلانچ کاف مضموم اور نون گنہ درمیان لام اور جیم فارسی کے جست قلاج، کھوسہ، ھاے مخلوط سے بے ریش کوسہ، مگھم میم مضموم اور کاف فارسی مشدد اور ھاے مخلوط سے مبہم، مریز مہمیز، مید رزن پدر جس کو سوتیلی ماں کہتے ہیں مایدر، مکھنا ھاے مخلوط سے مقنع نوبات رسم معروف نبات نوج نون مفتوح اور واو ساکن اور جیم تازی سے غالباً نعوذ سے بنایا ہے کہ صیغۂ متکلم مع الغیر ہے، ھونق احمق، ھنق حقیقت میں ابن حقیقت میں اب ھنق ہے، ھمام دستہ ھاون دستہ۔

ان الفاظ کی تحریر سے فارغ ہو کر دوسرے مقصد کی طرف ملتفت ہوتا ہوں کہ منتظران مقصود کی شکایت سے نجات اور طالبان اختصار دوست کے طعنے سے رہائی حاصل ہو۔

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں 'شریک' ہے۔

مقصد دوسرا

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

حد شعر اور موجد اشعار اور عروض و قافیہ کے بعض فوائد کا ذکر

دانش مندان خبیر پر واضح ہو کہ ازبس یہ مقصد چار مطلب پر اشتمال رکھتا ہے، ان مطالب کو چار فصل میں مسطور کرتا ہوں اور ہر فصل کو مطلب کے نام سے مذکور۔

پہلا مطلب حد شعر:

جاننا چاہیے کہ شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں یعنی دانستن اور اصطلاح میں کلام موزوں مقفیٰ کو۔ جو کہ شعر کی تعریف کے تین جز ہیں کلام اور موزوں اور مقفیٰ، کلام اور وزن اور قافیے کے معنی کا بیان واجب ہوا تا کہ تعریف کماینبغی دل نشین اور خاطر سامع میں جاگزین ہو جاوے۔ اس واسطے لکھا جاتا ہے کہ کلام علم نحو کی اصطلاح میں ان دو کلمے یا زیادہ کا نام ہے کہ اسناد رکھتے ہوں، یعنی ایسی نسبت کہ مخاطب کو بعد سکوت قائل کے فائدۂ تامہ حاصل ہو جاوے۔ اور اس کو مرکب مفید بھی کہتے ہیں، جیسے زید قائم ہے۔ لیکن تعریف مذکور میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ کلام سے مطلقاً الفاظ بامعنی مراد ہیں، اسناد پر مشتمل ہوں یا نہ ہوں۔ اسی واسطے بعضے اس تعریف میں بجائے کلام کے الفاظ بامعنی ایراد کرتے ہیں تا مرکب غیر مفید بھی، بشرط وزن و قافیہ، شعر کی تعریف میں داخل رہے جیسے یہ شعر:

وہ شوخ ستم کیش کہ اغوائے عدو سے
عاشق کی دم مرگ بھی بالین پہ نہ آیا

اور یہ تاویل اس واسطے ہے کہ اگر معنی اصطلاحی مراد ہو تو چاہیے کہ یہ مرکب تتمہ عبارت کے ساتھ ایک شعر ہو اور حال یہ ہے کہ وہ دو شعر ہوں گے نہ ایک شعر۔ اس واسطے کہ عرف میں ہر واحد کو شعر کہتے ہیں۔ اگرچہ احتمال ہے کہ ان دو عبارت موزوں سے ایک کو بہ اعتبار مجاز کے شعر کہتے ہوں، نہ بہ اعتبار حقیقت کے، لیکن مذہب جمہور اول ہے نہ ثانی اور لفظ عام ہے کسی زبان سے ہو، اگرچہ وہ صاحت زبان اس کلام موزوں کو اور نام سے اشتہار دے، مثلاً دوھرہ اور کبت کہ اس

اصطلاح کے موافق اطلاق شعر کا ان پر صحیح ہے، جیسے کلام یعنی مرکب مفید کا اطلاق عبارت سنسکرت پر بھی درست ہے گو کہ زبان ہند میں اس کو اشلوک کہیں اور وزن سے اس مقام میں وہ ھئیت مراد ہے کہ حرفوں کی حرکات اور سکنات اور ان حرکات اور سکنات کے عدد و مقدار کی تناسب سے اس طرح پر حاصل ہو کہ نفس کو اس کے ادراک سے ایک لذت خاص بہم پہنچے۔ اور جیسے الفاظ عام تھے، وزن بھی عام ہے، یعنی شعر خواہ وہ اوزان رکھتا ہو کہ عرب نے ان میں شعر کہے ہیں، خواہ اور کوئی وزن۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو لازم آتا کہ وہ اشعار کہ بحور مخصوصہ اہل فارس میں موزوں ہوں، شعر نہ ہوں اور یہ خلاف مشہور ہے۔ یہ قول بھی اسی پر دال ہے کہ دوھرہ اور کبت پر اطلاق شعر صحیح ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ ابو اسحاق زجاج کا قول، یعنی 'جو اوزان عرب پر نہ ہو شعر نہیں ہے'، قبول کی صلاحیت نہیں رکھتا اور محققین کے نزدیک وزن میں قصد اور تعمد معتبر ہے اور تعمد سے مراد یہ ہے کہ وزن بالذات مقصود ہو اور بلاغت کلام بالعرض، نہ یہ کہ بلاغت کلام بالذات مقصود ہو اور وزن بالعرض جیسے بعض آیات کلام الٰہی اور احادیث حضرت ختمی پناہی کہ ان میں مقصود بالذات یہ ہے کہ ادائے معنی کلام بلیغ سے وقوع میں آوے اور احداث وزن اس میں بالعرض ہے یا متوسطین کی طرح سے بحسب عادت کلام کریں اور اتفاقاً وہ کلام موزوں واقع ہو جاوے، جیسے کہ ہم الکن زبانان دبستان بیان اور پاشکستگان زوایائے امکان کا کلام کہ گاہ گاہ حلیۂ وزن سے محلی ہو جاتا ہے اور ہم کو اس کے وزن سے تکلم کے وقت قطعاً آگاہی نہیں ہوتی۔ اس معنی پر سکاکی علیہ الرحمۃ نے عروض مفتاح میں تصریح کی ہے۔ پس یہ دونوں قسم حد شعر سے خارج ہیں۔

اور قافیہ وہ چند حرف ہیں کہ فقط اشعار کے اخیر میں جیسے قدما کا مذہب ہے، یا مصاریع او اشعار میں سے کسی کے اخیر میں جیسے متاخرین کا اعتقاد ہے، بے استقلال اور واجب التکرار سے ہوں، یعنی انکی تکرار سے، گزیر نہ ہو، مثلاً اشعار یا مصاریع

کے اخیر میں ''اقرار'' اور ''کار'' واقع ہو۔ ان میں الف اور رائے مہملہ کی تکرار ناگزیر ہے۔ اگرچہ ''اقرار'' کے کاف اور ھمزے کے مقابل دوسرے لفظ میں کوئی حرف ہو یا نہ ہو اور بے استقلال کی قید سے ''اقرار'' کی رائے اول اور ''کار'' کا کاف قافیے کی تعریف سے خارج ہو گیا، کس واسطے کہ اگر حروف مکرر کا استقلال معتبر ہو، تو ردیف تعریف قافیہ میں داخل ہو جاوے کہ وہ یا مستقل ہوتی ہے یا مستقل کے حکم میں۔ اگر کوئی کہتے کہ ردیف متحد اللفظ و المعنی ہوتی ہے اور قافیے میں اختلاف معتبر ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ محققین کے نزدیک ردیف میں اتحاد معنی ضرور نہیں۔ اس واسطے کہ لفظ ''چنگ'' مثلاً بعد قافیے کے بے شک ردیف ہے اگرچہ دونوں جگہ معنی مختلف رکھتا ہو۔

جب یہ بحث معلوم ہوئی تو اب اس تعریف کے قیود کا فائدہ دریافت کیا چاہیے کہ قید کلام سے ایقاع یعنی تال اور عبارت سے معنی اور موزونی کی قید سے نثر اور قافیے کی قید سے کلام موزوں۔ قافیہ شعر کی تعریف سے خارج ہو گئے۔ کس واسطے کہ عبارت نثر اگرچہ معنی اور قافیہ رکھتی ہو لیکن بحسب اصطلاح اس کو شعر نہیں کہتے اور یہی حال ہے قیود باقی کا۔ حاصل یہ ہے کہ ان قیود سے جو قید مفقود ہو جاوے، اس عبارت پر شعر کا اطلاق صحیح نہ ہوگا اور وزن میں تعمد وقصد کے اعتبار سے آیات و احادیث اس تعریف سے خارج ہو گئیں اور جو کہ ان دونوں کلام معجز نظام میں وزن اولاً و بالذات مقصود نہیں ہے ''ما علمناہ الشعر'' وارد ہوا یہ مطلب ہے اس عبارت کا کہ جناب مستطاب استادی و مولائی مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ نے رسالہ ''وافی'' میں قلم جوہر رقم سے تحریر فرمائی۔

دوسرا مطلب ذکر موجد اشعار:

بعضے ارباب تواریخ لکھتے ہیں کہ ایجاد شعر کا حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ السلام سے وقوع میں آیا ہے۔ جس وقت قابیل نے ھابیل کو قتل کیا حضرت بابرکت نے اس

کے مرثیے میں چند شعر فرمائے۔ جو کہ وہ اشعار عربی ہیں، عبارت اردو میں ان کا ایراد مناسب معلوم نہ ہوا۔ وہ اشعار کثرت شہرت سے اس مقام کی تحریر سے مستغنی ہیں۔ اس قول کے موافق صائب ا تبریزی کہتا ہے:

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''صاحب'' ہے۔

هر که اول شعر گفت آدم صفی الله بود
طبع موزوں حجت فرزندے آدم بود

اور ''تذکرۂ دولت شاہی'' میں مرقوم ہے کہ ابوعلی مسکویہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب ''داب العرب والفرس'' میں اس قصے کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ حسین ابن علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے باپ یعنی حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کوفے کی مسجد جامع میں تھے۔ اہل شام میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ اے امیر المومنین پہلے کس نے شعر کہا ہے؟ آپ نے فرمایا ''آدم علیہ السلام نے''۔ اس نے پوچھا ''وہ کون سے شعر تھے؟'' فرمایا ''جب حضرت آدم آسمان سے زمین پر نازل ہوئے تو زمین کی خاک اور وسعت اور ہوا کو دیکھا اور قابیل نے ہابیل کو قتل کیا، پس شعر کہا اور ان اشعار کو اس کے آگے نقل کیا''۔ تاریخ خمیس کے مصنف نے لکھا ہے کہ ابن اثیر نے کتاب ''کامل التواریخ'' میں اور ''زین القصص'' وغیرہ کے مصنفوں نے حضرت آدم کے اشعار نقل کیے ہیں۔ لیکن صاحب ''کشاف'' نے کہا ہے کہا سناد اشعار کی اس حضرت نبوت مرتبت کی طرف کذب محض اور افترائے بحت ہے۔ اور امام فخر الدین رازی نے صاحب ''کشاف'' کی تصدیق کی۔ اور ''معالم التنزیل'' میں ان اشعار کی نقل کے بعد مذکور ہے کہ میمون ابن مہران نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جو شخص کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے شعر

کہا ہے، اس نے اللہ اور اللہ کے رسول پر بہتان باندھا، کس واسطے کہ ہمارے حضرت صلعم اور سب انبیاء شعر کی نہی میں داخل ہیں، مگر جب کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا، آدم علیہ السلام نے سریانی میں اس کا مرثیہ کہا اور شیث نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ اس کو یاد رکھنا کہ ہماری اولاد میں متوارث ہو اور یہ عبارت نقل ہوتی چلی آئی حتی کہ یعرب ابن قحطان کے پاس پہنچی اور وہ زبان سریانی اور عربی دونوں میں کلام کرتا تھا اور عربی میں اول تکلم اسی نے کیا ہے اور شعر بھی کہتا تھا۔

''قاموس'' میں مرقوم ہے کہ عربی میں پہلے پہل یعرب بن قحطان نے تکلم کیا ہے۔ اس نے جب مرثیے کو دیکھا اس میں تقدیم و تاخیر کر کے دو شعر موزوں کیے اور چند بیتیں اور زیادہ کر دیں۔ یہاں تک خمیس کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ اس عبارت سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرثیہ کہ الفاظ سریانی میں حضرت آدم کی زبان سے صادر ہوا نثر تھا اور یعرب نے اس کو عربی میں موزوں کیا اور یہ معلوم نہ ہوا کہ اشعار کا موجد بھی وہی ہے۔ لیکن سیفی نے اپنی کتاب ''عروض'' میں قاسم ابن سلام بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ شعر عربی اول یعرب بن قحطان نے کہا اور شمس فخری اصفہانی کہ اساتذۂ قدیم اور ثقات علم عروض سے ہے، ''معیار جمالی'' میں قاسم بن سلام بغدادی سے صریح تر روایت کرتا ہے کہ بعد طوفان کے زبان عربی یعرب بن قحطان سے منتشر ہوئی، جو کہ اس کو اسجاع اور قوافی کی طرف نہایت التفات تھی، فقرات عربی کہنے میں جو جو مصرعے موزوں ہو جاتے، اپنی تیزی فہم سے ان کو معلوم اور موزوں اور ناموزوں میں تمیز کرتا اور بدیہہ دو شعر عربی کہہ کر ایک مجلس میں کہ اس قبیلے کے اکابر اور اعیان جمع تھے، پڑھے، سب نے کہا ''ما ھذا الترتیل الذی ما انا شعرنا بک قبل یومنا ھذا'' یعنی یہ کیا ترتیب کلام ہے کہ ہم نے تجھ سے ایسا سخن آج سے پہلے نہیں سنا۔ اس نے جواب دیا ''وانا ایضاً ماشعرت بہ من نفسی قبل یومی ھذا'' یعنی میں خود بھی آج سے پہلے اس پر مطلع نہیں ہوا۔ جو کہ بے

واسطہ تعلیم و تعلم کلام منظور پر شعور ہوا، اس کلام کا نام شعر اور قائل کا نام شاعر ہو گیا۔ یہاں تک ترجمہ ''معیار جمالی'' کا اور جو کہ اکابر قبیلہ اور یعرب کے کلام میں کلام منظوم کے باب میں ''ماشعرنا'' اور ''ماشعرت'' وارد ہوا، شاید اس مناسبت سے اس کا نام شعر مشہور ہو گیا ہو۔ بہر کیف اس سے یہ دریافت ہوا کہ اشعار عربی کا موجد وہی ہے، نہ یہ کہ شعر کا وجود اس سے پہلے مطلق نہ تھا۔

اور ''تذکرۂ مرات الخیال'' میں مرقوم ہے کہ ایک طائفے کا یہ مذہب ہے کہ یمن میں ایک شخص اشعر ابن سبا نام عربیت میں مہارت تام رکھتا تھا، اکثر کلام اس کی زبان سے موزوں صادر ہوتے، جو کہ اس کا نام اشعر تھا اس کے مقولات کا نام شعر ہو گیا، پھر جب اوروں نے اس وضع پر سخن طرازی کی، اس پر شاعر کا اطلاق کیا۔ اس وقت سے یہ حرف رائج ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عربی شعر کی ابتدا اشعر سے اور شعر کا نام اس کے اسم سے مشتق ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ شمس فخری نے حضرت آدم کے ساتھ ان اشعار کے منسوب نہ ہونے کی وجہ ''معیار جمالی'' میں یہ بیان کی ہے کہ ان کی زبان سریانی تھی۔ اگر شعر گوئی کی روایت صحیح ہے تو انہوں نے وہ بیتیں زبان سریانی میں کہی ہوں گی اور اہل تواریخ نے عربی میں ترجمہ کر لیا، انتہی۔ ظاہرا یہ وجہ کافی نہیں، کس واسطے کہ ابن عساکر کی روایت سے اصل زبان آدم کی عربی ہے، جیسے مقدمہ میں مذکور ہوا۔

اور تواریخ میں منقول ہے کہ شعر فارسی کی ابتدا بہرام گور سے ہے، اس کی وجہ یوں منقول ہے کہ ایک عورت صاحب جمال دلارام نام کہ نکتہ دان اور بذلہ سنج تھی، بہرام کے پاس شکارگاہ میں حاضر تھی۔ بہرام نے اس کے سامنے شیر کو گرفتار کیا اور غایت تفاخر سے یہ مصرع اس کی زبان پر گزرا:

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ

جو کہ اکثر یوں اتفاق ہوتا تھا کہ جو کہ بہرام کہتا، دلارام بدیہہ اس کا جواب دیتی،

اس وقت بہرام نے کہا کہ تو اس کا جواب بھی دے سکتی ہے؟ دلارام نے یہ مصرع موزوں کیا: ع

نام بہرام ترا و پدرت بو جبلہ

اشعار فارسی کی اصل یہی بیت ہے اور سیفی نے لکھا ہے کہ شعر فارسی کی ابتدا ابو حفص حکیم سغدی سے ہے۔ اس کی بیت اول یہ ہے:

آھوے وشتی است در کوہ چگونہ دودا

چوں ندارد یار بی یار چگونہ رودا

اور شمس فخری نے ''معیار جمالی'' میں لکھا ہے کہ اکابر عصر نے بہرام کو شعر کے کہنے سے منع کیا کہ جو بنائے شعر کذب پر ہے بادشاہوں کو سزاوار نہیں کہ حرف دروغ سے زبان کو آلودہ کریں اور اس کو اس شغل سے باز رکھا۔ بعد اس کے شعر فارسی ابوحفص حکیم سغدی نے کہا۔ لیکن خان آرزو نے ''مثمر'' میں ''دبستان مذاھب'' سے نقل کیا ہے کہ آبادیوں کے زمانے میں ایک بادشاہ تھا فرھوش نام۔ اس کے عہد میں سخن پیوند یعنی شعرا بے قیاس تھے۔ ان میں سے سات شاعر ایسے تھے کہ ھفتے میں ایک ایک روز اس کے سامنے اشعار گزرانتے تھے۔ وہ بادشاہ روز یک شنبہ میں کہ اس کو خورشید روز کہتے ہیں، حمام کر کے ھکیل آفتاب میں گیا اور بعد پرستش کے گھر آیا۔ ایک شاعر شندوس نام ہمراہ تھا۔ جو کہ بادشاہ یزدانیوں کے مذھب کے موافق زندبار یعنی حیوانات غیر موذی کے قتل کرنے سے مجتنب تھا، اس کے کھانے کے واسطے خشکہ اور ماش مقشر کی دال حاضر کی۔ اس نے شندوس سے پوچھا کہ یہ کھانا کس طرح کا ہے؟ شندوس نے دال کے حق میں کہا کہ شاید کفارۂ گناہ کے واسطے برھنہ ہوئی ہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کے دھن کو جواہر سے پر کر دیا۔ اس بادشاہ کی بی بی شکر نام بھی حاضر تھی۔ شاعر پر عاشق ہوئی اور شب کے وقت کسی حیلے سے اس کے گھر گئی۔ اتفاقاً بادشاہ بھی آگاہ ہو کر متعاقب وہیں پہنچا۔ شاعر نے

اول بہت عذر کیا اور بعد اس کے کہا کہ عورت کسی سے خوف نہیں کرتی، عورت سے ڈرنا چاہیے، تو فرھوش سے بادشاہ کو چھوڑ کر مجھ سے نوکر کے ساتھ مواصلت کی طلب گار ہے۔ ناچار عورت مایوس ہو کر اپنے گھر چلی آئی۔ صبح کے وقت شندوس دربار میں حاضر ہوا، بادشاہ نے اس سے کہا، ''اگر سچ نہ کہے گا، مارا جاوے گا۔ تو نے یہ کیا کہا تھا کہ عورت کسی سے نہیں ڈرتی''۔ شندوس نے جواب دیا کہ:

زن شاہ است در داور گردا
گزر کرد و نہ دارد بیم از کس

بادشاہ اس بات سے خوش ہوا اور 'شکر' اس کو عطا کی۔ داور شاپور کے وزن پر شجاعت اور گردا کاف فارسی سے فردا کے وزن پر دریاے محیط کو کہتے ہیں۔ ترجمہ اس کتاب کا تمام ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہرام سے پہلے بھی شاعر موجود تھے بلکہ اگر آبادیوں کی سلطنت کا زمانہ جیسے کہ مقدمے میں مذکور ہوا، پایۂ اعتبار میں رکھا جاوے، آدم ابوالبشر علیہ الصلوۃ والسلام سے پہلے وجود شعرا کا متحقق ہوتا ہے، اعوذ باللہ من ھفوات اللسان واباطین البیان:

سخن گو چو گوہر بر آرد فروغ
چو ناباور افتد نماید دروغ

تیسرا مطلب عروض میں:

جاننا چاہیے کہ عروض ایسا علم ہے کہ اس سے شعر کا صحیح اور سقیم دریافت ہوتا ہے۔ شمس فخری نے ''معیار جمالی'' میں لکھا ہے ''عروض مشتق ہے عارض سے اور عارض وہ شخص ہے کہ لشکر کو بادشاہ پر عرض کرے۔ جو کہ شعر کے نیک و بد کا عرض شاعر پر اس علم سے ہوتا ہے، اس کا نام عروض مقرر کیا ہے'' اور سیفی نے کتاب عروض میں لکھا ہے ''عروض مکۂ معظمہ کا اسم مبارک ہے۔ جو کہ خلیل ابن احمد اسی خاک پاک میں علم عروض کے ساتھ ملہم ہوا تھا، تیمناً اس علم کا نام عروض رکھا۔'' ان دونوں کتاب میں نام

کی وجہ متعدد مذکور ہیں، لیکن راقم نے اختصار کی رعایت سے انہیں دو قول پر قناعت کی۔

مخفی نہ رہے کہ شعر کلام موزوں ہے جیسے کہ دریافت ہوا اور ہر موزوں کو میزان سے ناگزیر ہے کہ اس کے وسیلے سے وزن اشعار کا معین ہو جاوے۔ اس واسطے علم عروض کو شعر کے واسطے میزان مقرر کیا ہے اور ماہیت وزن کی اول دریافت ہو چکی ہے۔ وزن کے دریافت کی کیفیت یہ ہے کہ چند الفاظ معین کیے ہیں، ان کو ''ارکان شعر'' کہتے ہیں اور ان الفاظ کو لفظ ''فعل'' سے مشتق کیا ہے۔ اس واسطے کہ جو فا اور عین اور لام اوزان صرفی میزان ہے، اقتضائے مناسبت سے چاہا کہ اوزان عروضی کی میزان بھی اسی لفظ سے اشتقاق کی جاوے کہ ان حروف کا جامع ہونا کہ تسمیہ میزان کا ان کلمات پر لفظاً اور معناً راست آ جاوے اور اس اشتقاق کی مناسبت سے ان الفاظ کو افاعیل اور تفاعیل بھی کہتے ہیں۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی تو اب جاننا چاہیے کہ افاعیل بہ اعتبار صورت کے آٹھ ہیں اور بہ اعتبار واقع کے دس، لیکن اس کی کیفیت کماینبغی جب دریافت ہو گی کہ ان کے اجزا پر اطلاع حاصل ہو۔

پوشیدہ نہ رہے کہ ارکان اور افاعیل کی ترکیب تین جزو میں منحصر ہے: ایک دو حرفی اور یہ یا اس طرح سے ہے کہ اول متحرک ہو اور دوسرا ساکن، جیسے گر اور بر، یا دونوں متحرک ہوں جیسے ''ار'' الف اور رائے مہملہ مفتوح سے۔ اس دو حرفی جز کو سبب کہتے ہیں۔ اس واسطے کہ سبب لغت میں رسن ہے اور رسن غالباً دوتا ہوتی ہے۔ قسم اول کو سبب خفیف کہتے ہیں کہ ایک متحرک سے آغاز کر کے دوسرے ساکن پر توقف کرنا تلفظ میں سبک ہے اور دوسری قسم کو سبب ثقیل کہ تلفظ دونوں متحرک کا بہ نسبت اول کے گراں ہے۔ دوسرا سہ حرفی اور یہ بھی یا اس طرح ہے کہ دو حرف متواتر متحرک اور تیسرا ساکن ہو، جیسے بکن، یا دو متحرک میں ایک ساکن فاصل ہو جیسے قال فعل ماضی، اس جزو کو وتد کہتے ہیں اور وتد لغت میں میخ ہے۔ جو کہ میخ بہ نسبت رسن کے

زیادہ قوی ہوتی ہے اور کلمہ سہ حرفی بھی دو حرفی سے قوت میں زیادہ ہے، اس واسطے اس نام سے مسمّی ہوا۔ اول کو وتد مقرون اور وتد مجموع کہتے ہیں کہ دو متحرک باہم اور نزدیک ہیں اور دوسرے کو وتد مفروق کہ ایک ساکن نے دو متحرک میں فرق کر دیا ہے۔ تیسرا چہار حرفی یا پنج حرفی کہ تین یا چار حرف متواتر متحرک اور چوتھا یا پانچواں ساکن ہو، جیسے ''بلَغَ'' یا ''بدلِ مَن'' لام کے کسرے سے اس کو فاصلہ کہتے ہیں اور فاصلہ لغت میں ستون ہے۔ یہ معنی کتب عروض سے منقول ہے، والا کتب لغت سے مستفاد نہیں ۔ بہر کیف جو کہ ستون میخ سے قوی تر ہے، اس واسطے اس جز کو فاصلہ کہا اور شاید فاصلہ اس واسطے کہتے ہیں کہ ستون میخ سے دراز ہوتا ہے اور یہ کلمہ بھی سہ حرفی سے دراز تر ہے اور جو کہ یہ جز دو قوم ہے، چہار حرفی کو کہ پنج حرفی سے باعتبار ایک حرف کے کم ہے، فاصلہ صغریٰ کہتے ہیں اور پنج حرفی کو چہار حرفی سے باعتبار ایک حرف کے زیادہ ہے 'فاصلہ کبریٰ'' اور ابراہیم بن عبد الرحمان عروضی اول کو فاصلہ صاد مہملہ سے کہتا ہے، اور دوسرے کو فاضلہ ضاد منقوطہ سے۔ اس واسطے کہ فضل لغت میں زیادتی ہے اور پنج حرفی باعتبار ایک حرف کے زیادہ ہے اور ابن خباز کہتا ہے کہ بعضے ان دونوں قسم کو فاضلہ ضاد معجمہ سے کہتے ہیں، کہ دونوں وتد سے فضل اور زیادتی رکھتے ہیں۔ اول باعتبار ایک اور دوسرا باعتبار دو حرف کے۔ لیکن امتیاز کے واسطے چہار حرفی کو صغریٰ اور پنج حرفی کو کبریٰ کے ساتھ مقید کرتا ہے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ بعضے فاصلہ کو جز علحدہ شمار نہیں کرتے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ فاصلہ صغریٰ سبب ثقیل اور سبب خفیف سے مرکب ہے اور فاصلہ کبریٰ سبب ثقیل اور وتد مقرون سے۔ پس اجزائے ارکان واقع میں دو ہیں۔ لیکن ماہران فن اور واقفان سخن پر واضح ہے کہ یہ تسمیہ اصطلاحی ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فاصلہ ان اجزا سے واقع میں مستفاد نہیں ہے۔ اہل فن نے بطریق توسع کے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ سبب ثقیل کے بعد جب سبب خفیف یا وتد مجموع واقع ہو تو اس کو فاصلہ کہیں، جیسے متفا بحر کامل اور

علتن وافر میں اور اگر کوئی سبب وتد مفروق کے ساتھ مرکب ہو تو ان اجزا کو انہیں کے نام سے مذکور کریں۔ مثلاً فعلات ضم تا سے اور فاع لاتن اور مستفع لن منفصل۔ جب یہ معلوم ہو چکا تو اب سننا چاہیے کہ ان اجزا کی تخصیص کی وجہ اسامی مذکورہ سے کیا ہے؟ کس واسطے کہ ایک سے دوسرے کا قوی تر ہونا رسن اور میخ اور ستون میں منحصر نہیں ہے۔

پوشیدہ نہ رہے کہ شعر کو عرب صحرانشین کے گھر سے تشبیہ دے کر بیت کہتے ہیں۔ اور ان کا گھر موی اور پلاس کا ہوتا ہے اور اس گھر کے اجزا میں سے رسن اور میخ اور ستون ہے۔ اس واسطے اجزا بیت کو ان اسامی کے ساتھ مسمّیٰ کیا۔ اس تمہید کے بعد مبین ہوتا ہے کہ ارکان دہ گانہ یہ ہیں: فعولن، فاعلن، مفاعلین، فاعلاتن، فاع لاتن، مستفعلن، مستفع لن، مفاعلتن، منفعالن، مفعولات، تائے مضموم سے، بگیر تنوین خما سے، یعنی فعولن اور فاعلن وتد مجموع، اور سبب خفیف سے مرکب ہے، اور سباعیات سے مفاعیلن، اور فاعلاتن، متصل اور مستفعلن متصل اور ایک وتد مجموع اور دو سبب خفیف سے اور فاع لاتن اور مستفع لن اور مفعولات وتد مفروق اور دو سبب خفیف سے۔ اس واسطے فاع اور تفع کی عین کو سبب سے منفصل لکھتے ہیں، کہ جز وتد مفروق کا سبب سے اتصال پا کر وتد مجموع کا موہم نہ ہو اور متفاعلن اور مفاعلتن وتد مجموع اور فاصلہ صغریٰ سے کہ عبارت ہے، مجموع سبب ثقیل اور خفیف سے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ فاصلہ کبریٰ یعنی وہ جز کہ سبب ثقیل اور وتد مجموع سے مرکب ہے اصول سے نہیں ہے، بلکہ افاعیل مزاحف سے بہم پہنچتا ہے، جیسے فعلتن کے مستفعلن سے بعد خبن اور طے کے حاصل ہو۔ کس واسطے کہ چہار حرکت کا متوالی ہونا گرانی لفظ کا موجب ہے، اور لفظ ثقیل اصول میں مقرر کرنا شائستہ نہ تھا۔ البتہ فروع میں اس قدر گرانی متحمل ہے۔ بعد اس بحث کے واضح ہو گیا کہ دونوں فاعلاتن حروف و حرکات کی کمیت میں ایک ہیں۔ لیکن باعتبار کیفیت کے متفاوت

ہیں۔اور اسی طرح دونوں مستفعلن اور ان ارکان میں وتد مفروق کے اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ لات مفعولات کا انفکاک بحور کے وقت مضارع اور مجتث اور خفیف میں فاع لاتن کا پہلا جز اور مستفعلن کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ جو کہ وہ وتد مفروق ہے تو ان دونوں ارکان کو بھی اسی وتد پر مشتمل قرار دیا گیا۔ اس مرام کی توضیح یہ ہے کہ اربابِ فن نے ارکان بحور کے واسطے ایسے الفاظ اختیار کیے ہیں کہ ان کے اجزا کی تقدیم و تاخیر سے ایک رکن دوسرے رکن کی صورت حاصل کرتا ہے، اور ایک بحر دوسری بحر کی۔ امر اول کو انفکاک ارکان اور دوسرے کو انفکاک بحور کہتے ہیں اور آسانی تفہیم کے واسطے ہر امر کے لیے دائرے معین کیے ہیں کہ طالب کاہل کوش اس راہ میں درماندہ اور نابلد اس وادی میں سراسیمہ نہ ہو جاوے۔ مثلاً فعولن کی لن کی تقدیم اور فعو کی تاخیر سے فاعلن اور فاعلن کے علن کی تقدیم اور فا کی تاخیر سے فعولن صورت پذیر ہے۔ ان دونوں ارکان کو ایک دائرہ سے قرار دیا ہے اور فاعلاتن اور مستفعلن متصل اور مفاعلین ایک دائرہ اور متفاعلن اور مفاعلتن ایک دائرہ سے۔ اس قرار پر جب مفعولات کی لات کو مقدم اور مفعو کو موخر کیا جاوے تو لات و مفعو حاصل ہوگا۔ جو کہ لات وتد مفروق ہے فاع لاتن میں کہ اسی کے وزن پر ہے۔ فاع وتد مفروق مقرر کیا گیا اور جب مف کو موخر اور عولات کو مقدم کریں عولات مف حاصل ہوگا۔ اسی واسطے مستفع لن میں کہ یہ بھی اس کے وزن پر ہے تفع کو وتد مفروق ٹھیرایا اور دونوں کے عین کو لام سے جدا لکھا، تا معلوم رہے کہ یہ دونوں ارکان علا اور علن سے مرکب نہیں ہیں۔ جو کہ ایک رکن ارکان بحر سریع سے مفعولات ہے اور مضارع اور مجتث اور خفیف سریع سے منفک ہوتا ہے، اس واسطے ان بحور میں ارکان مفروق مقرر کیے گئے ہیں، نہ مجموعی اور قدما مثل صاحب ابن عباد اور زمخشری صاحب قسطاس سوائے مفعولات کے کسی رکن میں وتد مفروق کے قائل نہیں۔ اس صورت میں انفکاک بحور اس طرح سے کہ بحور ثلثہ میں فاعلاتن اور مستفعلن متصل

حاصل ہو رموز مکتومہ سے ہے اور اس کی تقریر اس مختصر میں گنجائش پذیر نہیں۔

اس مقدمہ دورو دراز کے بعد سامعان سخن سنج کے گوش گزار کیا جاتا ہے کہ ان ارکان عشرہ اور افاعیل دہ گانہ سے انیس بحر حاصل ہوتے ہیں، کہ اشعار عرب و عجم کی بنا ان پر موسس اور عدد اوزان ان میں منحصر ہے۔ وہ بحور یہ ہیں: متقارب آٹھ بار فعولن، متدارک کہ اس کو رکض بھی کہتے ہیں، آٹھ بار فاعلن، رجز آٹھ بار مستفعلن، ھزج آٹھ بار مفاعیلن، کامل آٹھ بار متفاعلن، رمل آٹھ بار فاعلاتن، وافر آٹھ بار مفاعلتن، اور عرب رجز سے وافر تک بنائے اشعار چھ رکن پر رکھتے ہیں۔ سریع مستفعلن مستفعلن مفعولات دوبار، مقتضب مفعولات مستفعلن مفعولات مستفعلن دوبار، طویل فعولن مفاعیلن چار بار، مدید فاعلاتن فاعلن چار بار، بسیط مستفعلن فاعلن چار بار، خفیف فاعلاتن مستفع لن فاعلاتن دوبار، مجتث مستفع لن فاعلاتن چار بار مضارع مفاعیلن فاع لاتن چار بار، منسرح مستفعلن مفعولات چار بار۔ جدید اور اس کو غریب بھی کہتے ہیں فاعلاتن فاعلاتن مستفع لن دوبار، قریب مفاعیلن مفاعیلن فاع لاتن دوبار،

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''منفک'' ہے۔

مشاکل فاعلاتن مفاعیلن مفاعیلن۔ عرب بحر مقتضب سے مفعولات دوم اور مجتث سے مستفعلن دوم اور مضارع سے فاعلاتن دوم اور منسرح سے مفعولات دوم حذف کر کے مسدس استعمال کرتے ہیں۔ معلوم کیا چاہیے کہ ان انیس بحر سے پانچ بحر یعنی طویل اور مدید اور بسیط اور وافر اور کامل مخصوص عرب سے ہیں کہ فارسیوں نے بعد اختلاط اور مزاولت اشعار عرب کے تقلیداً ان اوزان میں شعر کہے ہیں، اور تین بحر یعنی جدید اور قریب اور مشاکل فارسی کے ساتھ مخصوص ہیں، اور گیارہ مشترک۔

پوشیدہ نہ رہے کہ خلیل ابن احمد جب اوزان عرب میں تجسس کافی اور تفحص شاقی عمل میں لایا، اوزان شعر کے ضبط کے واسطے پندرہ بحر مرکب کیں، اور جو جو بحر کہ انفکاک میں مشترک تھیں ان سب کو ایک ایک دائرے میں رکھا۔ جو کہ بحر متقارب کے ساتھ کوئی بحر شریک نہ تھی اس کو ایک دائرے میں رکھ کر اس دائرے کا نام مفردہ مقرر کیا۔ ابوالحسن اخفش نے جب اس میں نظر کی فعولن کے سبب کو وتد سے مقدم رکھ کر بحر متدارک کو حاصل کیا، اور متقارب کے ساتھ دائرے میں رکھ دیا۔ اور شمس فخری نے 'معیار جمالی' میں لکھا ہے کہ اس بحر کو ماہران علم عروض نے خلیل ابن احمد کے دوسو برس کے بعد استخراج کیا۔ جدید کو بوزرجمہر اور قریب کو مولانا یوسف عروضی نیشاپوری نے پایا اور مولانا تتبع اوزان فارسی میں خلیل ابن احمد سے پایہ کم نہیں رکھتا۔

ا۔ نول کشوری نسخے میں 'سے' نہیں ہے۔

فارسی میں علم عروض اول اسی نے تصنیف کیا ہے۔ شمس فخری نے لکھا ہے کہ مولانا یوسف نے جب بحر سریع کی ترتیب کو ملاحظہ کیا، مفتعلن اول کے وتد مجموع یعنی علن کو مفتعلن ثانی کے وتد مفروق یعنی مفت کے ساتھ پیوند کر کے مفاعیل لام مضموم سے حاصل اور اجزا کی تقدیم و تاخیر سے مفاعیل مفاعیل فاع لات مرکب کیا۔ ہر چند یہ ترتیب بعینہٖ مالوف طبائع نہ تھی، لیکن جو کہ اس کا اخرب فی الجملہ مطبوع تھا، اس کو ایک بحر ٹھیرا کر بحر سریع کے ہمراہ دائرے میں رکھ دیا۔ یہاں تک ترجمہ تھا شمس فخری کے قول کا لیکن جب کہ اس بحر کا استخراج سریع مزاحف سے مقرر کیا جاوے تو ناگزیر کہا جاوے گا کہ مفاعیل اور فاع لات کا حصول جو کہ مفاعیلن اور فاعلاتن سے اقرب تھا، اس کے اجزا دو مفاعیلن اور ایک فاع لاتن مقرر کیے۔ صحیح یہ ہے

اس کا انفکاک بحر سریع سالم سے وقوع میں آیا تا کہ مفاعیلن اور فاع لاتن بعینہما حاصل ہو جاویں، کس واسطے کہ علن مستف مفاعیلن اور لات مفعوفاع لاتن کے وزن پر ہے اور اس جگہ سے معلوم ہوا کہ فاع لاتن اس بحر کا منفصل ہے۔ اور واضح ہو کہ بحور ثلثہ میں مستفع لن اور فاع لاتن منفصل ہے، کس واسطے کہ بحر جدید میں مستفع لن رکن ثالث کے عولات اور رکن اول کے مس کے پیوند سے حاصل ہوا ہے، اور بحر قریب کا حال مرقوم ہو چکا، اور مشاکل میں فاع لاتن سریع کے رکن اول یعنی مستفعلن کے مستف کے ساتھ لات کے پیوند سے حاصل ہوا۔ بحور شعر کی ترکیب کا طریق بھی اس جگہ مرقوم کرنا ناظرین کتاب کی بصیرت کے واسطے مستحسنات بل واجبات سے ہے۔ اور جو کہ اس امر میں علامہ زمخشری صاحب قسطاس کا بیان دل چسپ ہے، اسی کو نذر احباب کرتا ہوں۔

معلوم کیا چاہیے کہ ترکیب بحور میں عروضیوں نے چار طریقے اختیار کیے ہیں: اول یہ کہ ایک ہی جزو کی تکرار سے حاصل کیا اور وہ سات بحر ہیں: متقارب، متدارک، رجز، ہزج، کامل، رمل، وافر۔ دوسرا یہ کہ ایسے اجزا کو باہم مرکب کیا ہے کہ وہ نسق واحد کے اعتبار سے حکم واحد میں ہیں، مثلاً "مستفعلن اور مفعولات کہ اسباب دونوں میں مقدم اور وتد موخر ہے، اگر چہ ایک کا وتد مجموع اور دوسرے کا مفروق ہے۔ اس طرح کی دو بحر ہیں سریع اور مقتضب۔ تیسرا یہ کہ ایسے خماسی و سباعی کو مرکب کیا کہ اگر سباعی سے زیادتی کو ساقط کریں تو خماسی کے ہم وزن باقی رہ جاوے۔ یہ امر فعولن اور مفاعیلن اور فاعلن اور مستفعلن اور فاعلاتن میں واقع ہے۔ کس واسطے کہ اگر مفاعیلن اور ع فاعلاتن کے اخیر اور مستفعلن کے اول سے سبب ساقط ہو جاوے، تو ایک سبب اور وتد باقی رہے اور وہ نہیں ہے مگر فعولن اور فاعلن، ایسی تین بحر ہیں طویل، مدید، بسیط۔ چوتھا یہ کہ ایسے سباعیات کو باہم پیوند دیا کہ ایک سبب کے حذف سے خماسی کے وزن پر باقی رہے۔ یہ امر فاعلاتن اور

مستفعلن اور مفاعیلن واقع ہے، اس واسطے کہ تن اور مس اور تن کی اسقاط سے فاعلا اور تفعلن اور مفاعی رہتا ہے کہ فاعلن اور فعولن کے وزن پر ہے۔اس قسم کے تین بحر ہیں خفیف، مجتث، مضارع۔ یہاں تک زمخشری کے قول کا خلاصہ مسطور ہوا۔

اب معلوم کیا چاہیے کہ یہ حال ہے سولہ بحر کا۔سوا ان تین بحر کے کہ فارسی کے ساتھ مخصوص ہیں، یعنی جدید، قریب، مشاکل، ان میں دو طریق ہیں: اول یہ کہ وتد درمیان دو سبب کے واقع ہو جیسے بحر جدید میں۔ دوسرا یہ کہ وتد دو سبب سے مقدم ہو جیسے قریب و مشاکل میں، گو کہ اول میں مستفع لن اور ان دونوں میں فاع لاتن وتد مفروق رکھتا ہے اور باقی ارکان وتد مجموع۔ سابق مسطور ہو چکا ہے کہ جو بحور کہ انفکاک میں شریک ہیں، ان کو ایک دائرے سے قرار دیتے ہیں۔اب جاننا چاہیے کہ بحور شانزدہ گانہ کے واسطے پانچ دائرے مقرر کیے ہیں، ایک دائرہ طویل اور مدید اور بسیط کے واسطے، اس دائرے کو مختلفہ کہتے ہیں۔ دوسرا دائرہ وافر اور کامل کے واسطے، اس دائرے کو موتلفہ کہتے ہیں۔تیسرا دائرہ ھزج اور رجز اور رمل کے واسطے، اس دائرے کو مجتلبہ کہتے ہیں۔چوتھا دائرہ سریع اور منسرح اور خفیف اور مضارع اور مقتضب اور مجتث کے واسطے، اس دائرے کو مشتبہہ کہتے ہیں۔ پانچواں دائرہ متقارب اور متدارک کے واسطے، اس دائرے کو متفقہ کہتے ہیں۔اور جو کہ جدید اور قریب اور مشاکل سریع سے حاصل ہوتے ہیں ان کے واسطے دائرۂ جداگانہ ضرور نہ ہوا۔پس ان تینوں کو بھی دائرۂ مشتبہہ سے قرار دیا چاہیے۔

اس مقام میں ازدیادِ بصیرت کے واسطے ایک دائرے کے انفکاک پر اشارہ کیا جاتا ہے تاکہ باقی کو اس پر قیاس کریں۔معلوم کیا چاہیے کہ اگر بحر وافر کے فاصلے سے شروع اور وتد پر تمام کریں، یعنی علتن مفاعلتن مفاعلتن مفا بحر کامل حاصل ہو جاوے، اور اگر بحر کامل کے وتد سے شروع اور فاصلے پر تمام کریں یعنی علن متفاعلن متفاعلن متفا وافر بہم پہنچ جاوے۔ھوشیار مغز فطن کو اسی قدر اشارہ کافی ہے والا

نابلدان کوچۂ دانش تو اگر خضر قائد طریق ہو رہ روشن کو پردۂ ظلمات سے کم تصور نہ کریں گے۔

پوشیدہ نہ رہے کہ اشعار ان بحور نوزدہ گانہ میں موزوں کرنا بغیر اس کے کہ کچھ تغیر ان کی صورت کذائی میں راہ پاوے، نازک طبعان لطیف نہاد کو ناگوار اور ندرت طرازان غرائب پسند کو ناخوش معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے کبھی بعض رکن اور کبھی سب ارکان میں کسی طرح کے تغیر کو راہ دے کر ہر ہر بحر سے اوزان مختلفہ حاصل کرتے ہیں، کہ شعر ان اوزان میں دل کش اور نظم اس وضع پر دل پسند ہو جائے۔ اس جگہ ان تغیرات کی کیفیت سے آگاہ کرنا بھی ناگزیر ہے۔

دریافت کیا چاہیے کہ جو تغیر کہ ارکان بحور اور تفاعیل اوزان میں واقع ہوتے ہیں، عروضیوں کی اصطلاح میں ان کو زحاف کہتے ہیں، زاء معجمہ کے کسرہ سے۔ اور زحاف جمع زحف کی ہے، زاء معجمہ کے فتح سے کہ اس کے معنی لغوی اصل سے دور پڑنا ہے۔ اسی واسطے جو تیر کہ نشانہ سے دور گر پڑے اس کو سہم زاحف کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جس رکن میں کچھ تغیر واقع ہوگا تو وہ اپنی اصل پر نہ رہے گا، گویا اصل سے دور گر پڑا۔ اور عروضیوں کی عادت یہ ہے کہ اس تغیر کو زحاف کہتے ہیں۔ لفظ جمع کے ساتھ نہ زحف اگرچہ تغیر مفرد ہو، اور اس کی جمع ازاحیف کرتے ہیں، اور زحف نقصان وزن کو، مثلاً اگر کہیں کہ اس بیت میں زحاف ہے تو مراد یہ ہے کہ اس کے تمام ارکان یا بعض میں تغیر ہے، اور اگر کہیں کہ بیت میں زحف ہے تو یہ مراد ہے کہ اس کے وزن میں نقصان ہے۔ اور جس رکن میں زحاف ہو اس کو رکن مزاحف کہتے ہیں، اور جس میں نہ ہو اس کو سالم۔ اب جاننا چاہیے کہ تغیر تین طرح ہے: زیادت حرف یا نقصان حرف یا نقصان حرکت، اور اوزان عجم میں کمی پانچ حرف تک ممکن ہے، جیسے مفاعیلن سے لن باقی رہ کر فع سے بدل جاوے۔ اس کی تفصیل بیان زحافات میں معلوم ہو جاوے گی۔ اب زحافوں کی تفصیل وتفسیر میں سرگرم ہوتا

ہوں۔ ازاحیف ارکان چھیالیس ہیں۔ تین تیس مصطلح عرب اور تیرہ مصطلح عجم۔ جو کہ مصطلح عرب میں یہ ہیں، قبض، قصر، حذف، خبن، کف شکل، خرم، خرب، شتر، قطع، شعیث، طی، وقف، کشف، صلم، اسباغ، اذالہ، خبل، تلم، ثرم، عصب، عضب، عقل، نقص، قطف، جم، قصم، عقص، اضمار، کبل، وقص، جزل، ترفیل۔ ان الفاظ کے معنی لغوی و اصطلاحی بیان کیے جاتے ہیں۔ قبض: اس کا ترجمہ فارسی گرفتن اور اصطلاح میں ساقط کرنا سبب خفیف کے دوسرے حرف کا جو رکن کا پانچواں حرف واقع ہوا ہو جیسے فعولن سے نون اور مفاعیلن سے یائے تحتانی۔ اول سے فعول ضم لام سے باقی رہے گا اور دوسرے سے مفاعلن اور اس رکن کو مقبوض کہتے ہیں۔ قصر: لغت میں کوتاہ کرنے کو کہتے ہیں، اور اصطلاح میں اس سبب خفیف سے کہ آخر رکن میں واقع ہو، ساکن کے اسقاط اور اس کے ماقبل کے ساکن کرنے کو کہتے ہیں، جیسے فعولن سے فعول اور مفاعیلن سے مفاعیل اور فاعلاتن سے فاعلات، لام اور تاے ساکن کے ساتھ، اور جو کہ قاعدہ مقرری ہے کہ اگر بعد تغیر کے لفظ غیر مستعمل باقی رہے تو اس کو حتی الوسع ایسے لفظ سے بدلتے ہیں کہ لفظ مستعمل اور اس کے وزن پر ہو۔ پس مفاعیل کو فعولان اور فاعلات کو فاعلان سے بدل کر دیا، اور بعضے مفاعیل اور فاعلات بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس رکن کو متصور کہتے ہیں۔ حذف: ترجمہ اس کا بریدن اور اصطلاح میں اخیر رکن سے سبب خفیف کے ساقط کرنے کو کہتے ہیں۔ پس فعولن سے فعو اور مفاعیلن سے مفاعی اور فاعلاتن سے فاعلا باقی رہا، اور موافق قاعدے کے فعل اور فعولن اور فاعلن سے مبدل ہوا، ان ارکار کو محذوف کہتے ہیں۔ خبن: خای معجمہ سے کپڑے کے کنارے کا موڑنا، اور اصطلاح میں اس سبب خفیف کا ساکن گرانا کہ رکن کا حرف دوم ہو، جیسے فاعلاتن سے فعلاتن اور مستفعلن سے متفعلن باقی رہا، اور مفاعلن سے بدلا گیا۔ ان ارکان کو مخبون کہتے ہیں۔ کف: باز رکھنا اور اس ساکن ہفتم کو گرانا کہ سبب حفیف کا دوسرا حرف ہو۔ پس فاعلاتن سے فاعلات ضمہ ا

تاے فوقانی سے باقی رہے گا۔ اس رکن کو مکفوف کہتے ہیں۔ شکل: گھوڑے کے ہاتھ اور پاؤں کو شکال سے باندھنا اور رکن میں خبن اور کف کا اجتماع۔ پس فاعلاتن سے فعلات ضمہ تا سے باقی رہے گا، اور

ا۔ نول کشوری نسخے میں "ضمیر" ہے۔

اس کو مشکول کہتے ہیں۔ خرم: لغت میں پردۂ بینی کا کاٹنا اور رکن کی اول سے وتد مجموع کے پہلے حرف کو ساقط کرنا۔ لیکن یہ تسمیہ مفاعیلن کے ساتھ مختص ہے اور فعولن میں ثرم ثاے مثلثہ اور مفاعلتن میں عضب ضاد معجمہ کے ساتھ کہتے ہیں، جیسے کہ بعد اس کے بیان ہوگا۔ مفاعیلن باقی رہ کر مفعولن سے بدل جائے گا اور اس رکن کو اخرم کہتے ہیں۔ خرب: خاے معجمہ کے ساتھ ویران کرنا اور کان کا چیرنا اور اصطلاح میں خرم اور کف کا جمع کرنا۔ پس مفاعیلن سے فاعیل ضم لام سے باقی رہ کر مفعول سے مبدل ہو جاے گا اور اس رکن کو اخرب کہتے ہیں۔ شتر: عیب کرنا اور خرم اور قبض کا اجتماع۔ پس مفاعیلن سے فاعلن باقی رہتا ہے۔ اس رکن کو اشتر کہتے ہیں۔ قطع: کاٹنا اور آخر رکن میں وتد مجموع کے ساکن کو ساقط کر کے ماقبل کا ساکن کرنا۔ پس مستفعلن سے مستفعل لام ساکن کے ساتھ باقی رہ کر مفعولن سے بدل جائے گا۔ لیکن فاعلاتن میں یہ زحاف بعد حذف کے واقع ہوتا ہے، کیوں کہ بعد اسقاط تن کے وتد اخیر رکن شمار کیا جاوے گا۔ پس فاعل باقی رہ کر فعلن سے کہ عین ساکن کے ساتھ ہے، بدل جاوے گا۔ مگر یہ اصطلاح فارسی کی ہے، اور یہ زحاف وتد میں ایسا ہے کہ قصر سبب میں اس رکن کو مقطوع کہتے ہیں۔ تشعیث: لغت میں آشفتہ اور ژولیدہ ہونا، اور اصطلاح میں رکن فاعلاتن کے وتد سے ایک متحرک کا ساقط کرنا، یا وتد کے ساکن کو ساقط کر کے متحرک کو ساکن کرنا، یا خبن کے ساتھ الف

کو ساقط کر کے عین کو

ا۔ نول کشوری نسخے میں ''پرہ'' ہے۔

ساکن کرنا۔ پہلی صورت میں یافاعاتن باقی رہے گا۔ اس واسطے کہ لام حرف اخیر سے مشابہ ہے اور اخیر محل حوادث ہوتا ہے۔ یہ مذہب ہے خلیل ابن احمد عروضی رحمت اللہ علیہ کا یا افالاتن باقی رہے گا۔ اس جگہ اسقاط عین خرم کی مشابہت سے ہے اور یہ مذھب ہے اخفش کا۔ اور دوسری صورت میں فاعلتن لام ساکن کے ساتھ قطع کی مشابہت سے اور یہ مذھب قطرب کا ہے۔ اور تیسری صورت میں فعلاتن عین ساکن سے اضمار کی مشابہت سے۔ یہ مذھب زجاج کا ہے۔ اس مذہب کو بہ نسبت اور مذاہب کے قوت زیادہ ہے، کس واسطے جو وتد کہ رکن کے بیچ میں واقع ہو، اس سے کچھ گرانا عروضیوں کی عادت کے خلاف ہے۔ اور خرم کی تشبیہ کا اعتبار کرنا بے وجہ ہے، کس واسطے کہ خرم اس وتد میں آتا ہے کہ رکن کے اول میں ہو اور قطع اس وتد میں جو رکن کے اخیر میں ہو اور فاصلے کے متحرک اول کا ساکن کرنا بحر کامل میں معہود ہے، جس کو اضمار کہتے ہیں، اور اس کا بیان آوے گا۔ جب تک تغیر معہود ممکن ہو غیر معہود میں ارتکاب کرنا معقول نہیں۔ بہرکیف اس کی جگہ مفعولن رکھیں گے۔ حاصل تشعیث کا یہ ہے کہ فاعلاتن سے مفعولن بہم پہنچے، کس طرح سے ہو اس رکن کو مشعث کہتے ہیں۔ طے: لغت میں لپیٹنا یعنی نوردیدن اور اصطلاح میں اسقاط سبب خفیف کے اس ساکن کا رکن میں حرف چہارم واقع ہو۔ پس مستفعلن سے مستعلن اور مفعولات سے مفعلات باقی رہ کر مفتعلن اور فاعلات سے بدل جاوے گا۔ اس کو مطوی کہتے ہیں۔ وقف:

۔نول کشوری نسخے میں 'یا'' نہیں ہے۔

باز استادون اور اصطلاح میں تا ی مفعولات کا اسکان۔ اس کو موقوف کہتے ہیں۔ کشف: اس میں دو لغت ہیں، شین معجمہ سے برہنہ کرنا اور سین مہملہ سے پاشنہ پٹھے کا کاٹنا، لیکن علامۂ زمخشری صاحب 'قسطاس' کے نزدیک شین معجمہ سے تصحیف ہے، بہر کیف تا ے مفعولات کے اسقاط کو کہتے ہیں۔ یہ رکن مفعولن کے ساتھ بدل جاتا ہے اور مکشوف کے ساتھ مسمّی ہوتا ہے۔ **صلم**: جڑ سے کان کاٹنا اور معنی اصطلاحی ا میں اختلاف ہے۔ صاحب 'قسطاس' اور صاحب اسمٰعیل عباد اور صاحب 'شرح عروض' اندلسی وغیرہم کہ عروضی عرب ہیں، آخر رکن سے وتد مفروق کے اسقاط کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں یہ زحاف مفعولات کے ساتھ مختص ہوا، اور بعضے عروضیان فارسی مثل مولانا یوسف عروضی اور شمش الدین قیس فاعلاتن میں حذف اور قطع کی جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ پس فاعل لام ساکن کے ساتھ باقی رہا۔ بہر صورت **فعلن** سے بدل جائے گا۔ شمش فخری نے عروضیان فارس کا مذہب نقل کر کے اعتراض کیا ہے کہ ہم تشعیث میں کہہ چکے ہیں کہ جو وتد رکن کے بیچ میں ہو، اس میں تصرف جائز نہیں۔ پس یہ قول مناسب نہ ہوا۔ مولف تذکرہ کہتا ہے کہ یہ اعتراض مہمل ہے۔ کس واسطے کہ حذف کے بعد وتد اخیر رکن کا حکم پیدا کیا، اور منع جب ہے کہ وتد کا درمیان ہونا بالفعل محقق ہو جیسے تشعیث میں۔ لیکن سوائے مولانا یوسف اور شمس قیس کے اور عروضی اس اجتماع کو قطع کے نام مخصوص کرتے ہیں، جیسے کہ سابق مرقوم ہو چکا۔ بہر کیف

ا۔نول کشوری نسخے میں ''اصطلامی'' ہے۔

جس رکن میں صلم واقع ہو اس کو اصلم کہتے ہیں۔ اسباغ: اور تسبیغ لغت میں دراز کرنا اور اصطلاح میں ایک حرف ساکن کا زیادہ کرنا اس سبب خفیف پر کہ اخیر رکن ہو۔ پس فاعلاتن اور مفاعیلن سے فاعلاتان اور مفاعیلان حاصل ہوتا ہے، اور فاعلاتان کو کہ غیر مستعمل ہے، فاعلیان سے بدل دیتے ہیں۔ اس رکن کو مسبغ تفعیل سے اور مسبغ انفعال سے کہتے ہیں، اور بعضے اس زحاف کو اشباع شین معجمہ اور عین مہملہ کے ساتھ کہتے ہیں۔ گویا ایک کی زیادتی سے رکن سیر ہو گیا۔ پس اس رکن کو مشبغ شین معجمہ سے کہیں گے۔ اذالہ: ذال معجمہ کے ساتھ دامن کا لٹکانا اور اصطلاح میں اس وتد میں ایک حرف کے زیادہ کرنے کو کہتے ہیں کہ اخیر رکن ہو جیسے مستفعلان اور متفاعلان، اس رکن کو مذال کہتے ہیں۔ ثلم: ثای مثلثہ کے ساتھ کسی چیز میں رخنہ پڑنا اور فعولن کے فا کا گرانا تا کہ عولن باقی رہ کر فعلن کے ساتھ بدل جاوے، اور اس رکن کو اثلم کہتے ہیں۔ ثرم: ثای مثلثہ اور رای مہملہ کے ساتھ آگے کے دانتوں کا ٹوٹنا اور اصطلاح میں ثلم اور قبض کا اجتماع، تا کہ فعولن سے عول ضم لام کے ساتھ باقی رہے اور فعل سے بدل جاوے۔ اس رکن کو اثرم کہتے ہیں۔ یہ دونوں زحاف یعنی ثلم اور ثرم حقیقت میں خرم اور خرب ہیں، لیکن فعولن میں اس نام کے ساتھ مسمّیٰ ہوتے ہیں، جیسے خرم کی بحث میں مبین ہو چکا۔ خبل: خای معجمہ اور بای موحدہ کے ساتھ، لغت میں عقل کی تباہی اور اصطلاح میں خبن اور طے کا اجتماع۔ پس مستفعلن سے متعلن تا اور عین متحرک کے ساتھ فاصلۂ صغریٰ باقی رہ کر فعلتن سے بدل جائے گا۔ اس رکن کو مخبول کہتے ہیں۔ عضب: عین مہملہ اور ضاد معجمہ کے ساتھ بز کی شاخ کا ٹوٹنا اور مفاعلتن سے حرف اول کا اسقاط۔ پس فاعلتن باقی رہ کر مفتعلن کے ساتھ بدل جاوے گا۔ اس رکن کو اعضب کہتے ہیں۔ عصب: عین اور صاد مہملتین کے ساتھ ستور کا باریک میان ہونا کرسنگی سے، اور مفاعلتن کے لام کا ساکن ہونا۔ پس مفاعیلن کے ساتھ بدل جاوے گا۔ اس کو معصوب کہتے ہیں۔ عقل: شتر کا زانو رسی

سے باندھنا اور لام مفاعلتن کا اسقاط کہ مفاعتن باقی رہ کر مفاعلن سے بدل جاوے۔ اس کو معقول کہتے ہیں۔ نقص: کم کرنا اور کف اور عصب کا اجتماع۔ پس مفاعلتن سے مفاعلت تاے مضموم کے ساتھ باقی رہ کر مفاعیل سے بدل جاوے گا، اس کو منقوص کہتے ہیں۔ قطف: قاف اور طای مہملہ کے ساتھ درخت سے میوہ توڑنا اور حذف اور عصب کا اجتماع۔ پس مفاعلتن سے مفاعل لام ساکن سے باقی رہ کر فعولن سے بدل جاوے گا، اس رکن کو مقطوف کہتے ہیں۔ قصم: قاف ارو صاد مہملہ سے، آگے کے دانتوں کا ٹوٹنا اور عصب اور عضب کا جمع ہونا۔ اس زحاف سے مفاعلتن فاعلتن لام ساکن سے ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ مفعولن رکھتے ہیں اور اس کو اقصم کہتے ہیں۔ جم: گوسپند کا بے شاخ ہونا، اور عضب اور عقل کا اجتماع۔ اس صورت میں مفاعلتن سے فاعتن رہ کر فاعلن سے بدل جاوے گا۔ اس کو اجم کہتے ہیں۔ عقص: عین مہملہ اور قاف اور صاد بے نقطہ سے، شاخ گوسپند کا پیچیدہ ہونا اور عجب اور نقص کا اجتماع۔ پس مفاعلتن سے فعلت لام ساکن اور تاے مضموم سے باقی رہ کر مفعول سے بدل جاوے گا، اس کو اعقص کہتے ہیں۔ اضمار: ستور کی کمر کا باریک ہونا، اور تاے متفاعلن کا اسکان۔ پس وہ رکن مستفعلن سے بدل جاوے گا اور اس کو مضمر کہتے ہیں۔ وقص: قاف اور صاد مہملہ سے گردن کا توڑنا اور اضمار اور خبن کا اجتماع۔ پس متفاعلن کی تاے فوقانی اضمار سے ساکن اور خبن سے ساقط ہو کر مفاعلن حاصل ہوگا، اس رکن کو موقوص کہتے ہیں۔ کبل: باے موحدہ سے بند کرنا، اور خبن اور قطع کا اجتماع۔ پس مستفعلن ہو جاوے گا۔ اس کو مکبول کہتے ہیں۔ جزل: جیم اور زای تازی سے کاٹنا اور طی اور اضمار کا اجتماع۔ اس زحاف سے متفاعلن متفعلن رہ کر مفتعلن سے بدل جاتا ہے، اس کو مجزول کہتے ہیں۔ ترفیل: دامن دراز کرنا اور سبب خفیف ایسے وتد مجموع پر زیادہ کرنا کہ آخر رکن ہوتا کہ مستفعلن اور متفا مستفعلا تن اور متفاعلاتن ہو جاوے۔ اس کو مرفل کہتے ہیں۔ یہاں تک بیان تھا ان

ازاحیف کا کہ مصطلح اہل عرب ہیں ا۔

اب بیان ان زحافوں کا کیا جاتا ہے کہ اہل فارس کے مصطلح ہیں۔ جدع: جیم تازی اور دال اور عین مہملتین سے مفعولات کے دونوں سبب خفیف کو ساقط کر کے تائے فوقانی کا ساکن کرنا۔ اس کی جگہ فاع رکھیں گے اور اس رکن کو مجدوع کہتے ہیں۔ تہم: حذف اور قصر کا اجتماع، پس مفاعیلن سے مفاع باقی رہ کر فعول سے مبدل ہو جاوے گا۔ اس کو اہتم کہتے ہیں۔ جحف: اول جیم تازی اور

ا۔ میں، (نسخہ مطبوعہ مطبع مرتضوی دھلی ۱۲۷۱ھ)

دوم حائے مہملہ فاعلاتن میں سے۔ اول خبن کے ساتھ الف کو گرانا، تا کہ فعلاتن باقی رہے، پھر فاصلے کا بھی ساقط کرنا، پس تن باقی رہ کر فع سے بدل جائے گا، اس کو مجحوف کہتے ہیں۔ تخلیق: خائے معجمہ کے ساتھ بعینہٖ خرم ہے مگر یہ کہ خرم جب کہتے ہیں کہ بیٹ کے رکن اول میں واقع ہو اور تخلیق جب کہ سوائے رکن اول کے اور کسی رکن میں ہو۔ پس مفعولن صدر میں اخرام اور حشو میں مثلاً مخلق کے نام کے ساتھ مسمی ہوتا ہے۔ سلخ: فاع لاتن مفروقی سے دونوں سبب کو ساقط کر کے وتد مفروق کی عین کا ساکن کرنا، اس کو مسلوخ کہتے ہیں۔ طمس: فاع لاتن مفروقی سے دونوں سبب کو ساقط کر کے جو باقی رہے یعنی فاع، اس کے عین کا گرانا، پس فاع کو فع سے بدلیں گے۔ اس کو مطموس کہتے ہیں۔ جو عروضی کہ فاع لاتن مفروقی کے وجود کے قائل نہیں ہیں، ان کے نزدیک اس زحاف کا بھی وجود نہیں ہے۔ جب: مفاعیلن سے دونوں سبب کا ساقط کرنا، پس مفاعل سے بدل جاوے گا۔ اس رکن کو مجبوب کہتے ہیں۔ زال: خرم اور ہتم کا اجتماع، پس مفاعیلن سے میم بہ سبب خرم کے ساقط ہوئی، اور بسبب ہتم کے کہ حذف اور قصر کی جمع ہوبی کو کہتے ہیں۔ دوسرا سبب خفیف تمام اور

سبب خفیف اول سے یائے تحتانی ساقط، اور عین ساکن ہو کر فاع باقی رہا۔ اس کو ازل کہتے ہیں۔ نحر: جدع اور کشف کا اجتماع، پس مفعولات سے لا باقی رہ کر فع سے بدل جاوے گا، اس کو منحور کہتے ہیں۔ رفع: اس رکن سے کہ دو سبب خفیف اس کے اول ہوں، ایک سبب کا ساقط کرنا، پس مستفعلن سے تفعلن باقی رہ کر فاعلن سے بدل جاوے، اس کو مرفوع کہتے ہیں۔ ربع: فاعلاتن میں حذف اور قطع سے فاعل حاصل کر کے خبن کے ساتھ الف کا گرانا، پس فعل باقی رہے گا، اس کو مربوع کہتے ہیں۔ تبر: جب ارحزم کا اجتماع، پس فاعیلن سے عیلن بسبب جب کے اور میم بسبب حزم کے اساقط ہو کر فا باقی رہے گا اور رفع سے بدل جاوے گا، اس کو اتبر کہتے ہیں۔ صاحب قسطاس فاعلاتن میں حرف اور قطع کے اجتماع کو تبر کہتا ہے۔ اس صورت میں فاعل باقی رہ کر فعلن سے بدل جاوے گا۔ حذف ساقط کرنا وتد کا، پس مستفعلن سے مستف باقی رہ کر فعلن سے بدل جاوے گا۔ جب ازاحیف عرب وعجم کا بیان ہو چکا تو اب سننا چاہیے کہ ارکان مزاحف کا اسم اس زحاف سے یا افعل کے وزن پر مشتق ہوتا ہے، یا اسم مفعول کے وزن پر مجرد ہو، یا مزید فیہ اول جیسے اتبر اور اھتم اور ازل وغیرھا، اور دوم جیسے مقصور اور مقطوع اور مشعت اور مسبغ مشدد یا مسبغ بدون تشدید اور نہ دال اور بعد اس کے ان چند چیزوں کا بیان کیا جاتا ہے کہ ان سے آگاہ ہونا واجبات اور ان پر مطلع ہونا مغتنمات سے ہے۔

پوشیدہ نہ رہے کہ بیت کے مصرع اول کے رکن اول کو صدر اور ابتدا کہتے ہیں اور اس کے رکن اخیر کو عروض اور دوسرے مصرع کے رکن اول کو مطلع کہتے ہیں، اور اس کے رکن اخیر کو ضرب اور عجز اور بعضے اسی مصرع کے رکن اول کو ابتدا کہتے ہیں، نہ مصرع اول کے اور اگر صدر اور عروض یا مطلع اور ضرب کے بیچ میں

ا۔ نول کشوری نسخے میں 'کہ' ہے۔

کوئی رکن ہو، اس کو حشو کہتے ہیں۔ سالم وہ ہے کہ اس کے ارکان میں زحاف واقع نہ ہوا ہو۔ صحیح اس بیت کو کہتے ہیں کہ اس کے عروض وضرب میں نقصان نہ ہو۔ نقیص وہ بیت ہے کہ اس کے ارکان میں زحاف نے راہ پائی ہو۔ تام وہ بیت ہے کہ اس کے صدر میں زحاف نہ ہو، اگرچہ عروض اور ضرب میں نقصان ہوا ہو۔ وافی وہ بیت ہے کہ تجزیہ سے سالم ہو گو کہ اس میں تجزیہ جائز ہو۔ معتدل وہ بیت ہے کہ عروض اور ضرب ایک طرح کی ہوں کہ حروف اور حرکاۃ میں کچھ تفاوت نہ ہو۔ موفور وہ بیت ہے کہ اس کے اول میں وتد ہو اور وہ وتد خرم سے سالم رہے، پس موفور اخرم کا ضد ہے۔ معرا وہ بیت ہے کہ اس کے عروض اور ضرب میں بطریق اشتباع اور اذالہ اور ترفیل کے کچھ زیادہ نہ کریں۔ کنمنہ مو وہ بیت ہے کہ اصل دائرے سے دونوں مصرعوں کے آخیر سے ایک ایک جزو کم کریں۔ مشطور وہ بیت ہے کہ اصل دائرے سے نصف کم کریں، مثلاً مثمن کو مربع کریں۔ منہوک وہ بیت ہے کہ اصل دائرے سے دو ثلث کم کریں، جیسے منسرح سے کہ مستفعلن مفعولات مستفعلن دو بار ہے، چار رکن کم کر کے بیت کی بنا دو رکن مستفعلن مفعولات پر رکھیں، مثلاً ''من بشری الباذنجان'' عربی میں اور کہ ''می خرد باذنجان'' فارسی میں ایک بیت ہے۔ اول مستفعلن مفعولان اور دوسری مفاعلن مفعولان کے وزن پر۔

بعد ان مراتب کے لازم ہے کہ اوزان رباعی کا حال مجملاً مرقوم ہو۔ معلوم کیا چاہیے کہ رباعی کے اوزان ھزج مثمن سے ماخوذ ہیں اور وہ اوزان دس رکن سے ترکیب پاتے ہیں۔ ایک ان میں سے سالم ہے یعنی مفاعیلن اور نو مزاحف اور وہ یہ ہیں: مفعولن اخرم، مفعول اخرب، مفاعیل مکفوف، مفاعلن مقبوض، فاعلن اشتر، فعول سکون لام سے اھتم فعل مجبوب، فاع ازل، فع ابتر۔ ان ارکان دوگانہ سے چوبیس وزن حاصل ہوتے ہیں۔ بارہ ایسے کہ ان کے اول مفعولن اخرم اور بارہ ایسے

کہ ان کے اول مفعول اخرب ہے اور ان اوزان کا رکن اخیر ان چار رکنوں میں سے ایک ہوتا ہے۔فعول فعل فاع فع۔اگر رباعی ان اوزان پر نہ ہو اس کو اصطلاح میں رباعی نہ کہیں گے، اور جائز ہے کہ ہر مصرع رباعی کا اوزان مختلفہ رکھتا ہو یا سب ایک وزن پر ہوں۔اور عادت عروضیوں کی یہ ہے کہ ان اوزان کے واسطے دو شجرے معین کرتے ہیں۔ایک شجرہ ان بارہ وزن کے واسطے جن کے اول مفعولن اخرم ہے۔اس کو شجرۂ اخرم کہتے ہیں، اور دوسرا شجرہ ان بارہ وزن کے واسطے جس کے اول مفعول اخرب ہے۔اس کو شجرۂ اخرب کہتے ہیں۔راقم ان دونوں شجرہ کو مرقوم اور مثالیں ہر وزن کے بنا بر اختصار کے حذف کرتا ہے۔

نقشہ شجرۂ اخرام

شجرۂ اخرب

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

معلوم ہو کہ تقطیع شعر کا طریق ازبس کہ مشہور اور موزوں طبع کو طریقہ اس کو معلوم ہے، اس واسطے اس جگہ طول کلام سے حذر کیا اور اس کی تحریر کو لا طایل سمجھا۔

چوتھا مطلب:

قافیہ:

اس میں بھی کمال اختصار پر نظر ہے کہ طول عبارت سے طبیعت سامع ملول اور خاطر نازک رنجیدہ نہ ہو۔ اس میں ایک مقدمہ اور کئی فصل ہیں۔

مقدمہ تعریف قافیہ میں:

طالبان کمال پر مخفی نہ رہے کہ قافیہ ایسے حروف و حرکات کا نام ہے کہ اواخر ابیات یا اواخر مصاریع میں واجب التکرار یا مستحسن التکرار ہوں، اور قید اخیر کا فائدہ یہ ہے کہ شعرائے فارس تاسیس اور دخیل کو، مثلاً مستحسنات بدیعی کے قبیل سے جانتے ہیں، نہ یہ کہ قافیہ کے متحقق ہونے میں ان سے چارہ نہیں۔ ہر چند اس صورت میں ذکر ان حروف کا تعریف قافیہ میں ضرور نہ تھا لیکن جو کہ شعرائے عرب کے نزدیک ماہیت قافیہ کی جزو ہیں، عروضیان فارسی نے ان کی تقلید سے ان کو بھی اجزائے قافیہ کے ساتھ محسوب کر لیا ہے۔ پس ان حروف کو حروف قافیہ سے شمار کرنا بہ عتبار مجاز کے ہے۔

فصل حروف قافیہ:

جاننا چاہیے کہ قافیہ کے نو حرف مشہور ہیں۔ روی، تاسیس، دخیل، ردف، قید، وصل، خروج، مزید، نایرہ۔ روی: حرف آخر قافیہ جیسے کاروبار کی ری اور تغافل اور تجاہل کا لام اور کم اور دم کی میم، لیکن کاہے حروف زایدہ کو بہ تکلف روی قرار دے کر حرف اصلی کے ساتھ مشابہ کر دیتے ہیں، جیسے دیں اور زریں کہ نون غنہ حرف زاید ہے کہ یائے نسبت کو لاحق ہو گیا ہے، اور عالم یعنی ماسوائے اللہ اور حالم ای حال

من ۔تاسیس وہ الف ہے کہ روی سے پہلے اور روی اس میں ایک حرف متحرک واسطہ ہو جیسے جاھل اور کاھل کا الف، اور ھائے ھوز کا نام دخیل ہے اور دخیل کا اختلاف درست ہے۔ کس واسطے کہ جاھل کا قافیہ عادل کے ساتھ روا ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ ہر قافیہ میں وہ ہی حرف بعینہٖ مکرر ہو اور یہ دونوں واجب التکرار نہیں۔ اس واسطے عادل کا قافیہ دل کے ساتھ بھی درست ہے۔ ردف ساکن ماقبل مفتوح اور واو ساکن ماقبل مضموم اور یائے ساکن ماقبل مکسور کہ حرف روی سے پہلے بلاواسطہ واقع یا حرف ساکن واسطہ ہو۔ اول جیسے کار اور بار اور دور اور شور اور دیر اور زیر، اور دوم جیسے کاست اور ماست اور دوست اور پوست اور زیست اور چیست ۔لیکن جاننا چاہیے کہ جب ردف اور روی میں حرف ساکن واسطہ نہ ہو تو الف اور واو اور یا کو مطلقاً ردف کہتے ہیں، اور جب حرف ساکن واسطہ ہو تو ان تینوں حرف کو ردف اصلی اور اس ساکن کو ردف زاید کہتے ہیں۔ اور ردف زاید چھ حرف ہوتے ہیں جیسے اس بیت میں مذکور ہیں:

ردف زاید شش بود ای ذو فنون
خای و رای و سین و شین و فا و نون

مثلاً تاخت اور باخت، توخت اور سوخت، ریخت اور بیخت تینوں حرف کے ساتھ ۔کارد اور آرد حرف الف کے ساتھ، کاست اور ماست اور دوست اور پوست اور چیست اور زیست، تینوں حرف کے ساتھ۔ کاشت اور داشت فقط الف کے ساتھ اور یافت اور تافت اور کوفت اور روفت، ماضی روفتن کی کہ رفتن اس کا مخفف ہے اور شگیفت اور فریفت تینوں حرف کے ساتھ، اور ماند اور افشاند فارسی میں سوائے الف کے اور حرف کے ساتھ دیکھا نہیں گیا، لیکن الفاظ ہندی میں واؤ اور یا کے ساتھ بھی پایا جاتا ہے۔

جیسے بوند بہ معنی قطرہ اور توند بہ معنی شکم بزرگ اور نیند بہ معنی خواب اور گیند بہ معنی

گوی۔ غایت یہ ہے کہ واو یا ایک میں معروف اور دوسرے میں مجہول ہے۔ اور ردف اصلی دو قسم ہے، معروف اور مجہول۔ معروف وہ واو اور یاے تحتانی ہے کہ اس کے پہلے ضمہ اور کسرہ خالص ہو، جیسے نور اور حور اور میر اور پیر اور مجہول وہ کہ اس کی پہلی حرکت خالص نہ ہو، جیسے زور اور شور اور دیر اور زیر۔ اور معروف اور مجہول کا جمع کرنا متقدمین کے نزدیک بعض میں درست اور بعض میں نادرست ہے۔ اس کا بیان خوف اطناب سے اس مختصر میں مناسب نہیں۔ لیکن متاخرین کے نزدیک مطلقاً ناجائز ہے اور باوجود جائز نہ ہونے کے کوئی ایسا نہیں کہ اس سے احتراز کرتا ہو۔ جو کہ اس کے امثلہ واضح اور مشہور ہیں اس واسطے مثال کا لکھنا امر زاید معلوم ہوا۔ قید: سوائے حروف ثلثہ مذکورہ کے وہ حرف ساکن ہے کہ روی سے اول بغیر واسطے کے واقع ہو۔ پس قید میں واو ماقبل مفتوح اور یاے ماقبل مفتوح اور تمام حروف صحیح داخل ہو گئے، مثلاً دور اور غور اور سیر اور دیر فتحہ اول کے ساتھ اور درد اور زرد اور پست اور مشت۔ اختلاف اس حرف کا نہایت مکروہ ہے اور طبایع سلیم پر نہایت گراں، لیکن اگر قریب المخرج ہو تو البتہ چنداں گرانی محسوس نہ ہو، جیسے شہر اور بحر۔ وصل وہ حرف زاید ہے کہ روی کو لاحق ہو، جیسے بارش اور خارش۔ خروج وہ حرف ہے کہ وصل کو لاحق ہو۔ مزید وہ حرف ہے کہ خروج کو لاحق ہو جیسے دانائی اور توانائی کہ نون روی اور الف وصل اور پہلے یا خروج اور دوسری مزید۔ نایرہ وہ حرف جو کہ مزید کو لاحق ہو۔ اس کی مثال قوافی فارسی میں بیشتر پائی جاتی ہے، جیسے گفتمشاں و سفتمشاں کہ یا وصل اور میم خروج اور شین مزید اور الف و نون نایرہ۔

فصل حرکات قافیہ:

معلوم کیا چاہیے کہ حرکات قافیہ چھ ہیں: رس، اشباع، حذو، توجیہ، مجری، نفاذ۔ رس: الف تاسیس کے پہلے حروف کی حرکت مثلاً جاہل اور کامل کے جیم اور کاف کا فتحہ اشباع دخیل کی حرکت ضمہ ہو یا فتحہ یا کسرہ مثلاً تجاہل اور تغافل، داور اور خاور، کافر اور

مسافر۔ حذو: ردف اور قید کے ماقبل کی حرکت مثلاً دار اور دور اور دیر کی حرکات ثلثہ اور گرد اور درد کا فتحہ۔ توجیہ: روی ساکن کے ماقبل کی حرکت جیسے بر اور سر کی باے موحدہ اور سین مہملہ کا فتحہ۔ لیکن اشباع اور توجیہ میں فرق نہیں رہتا، کس واسطے کہ جاہل کی حاے حوز کی حرکت پر یہ بھی صادق آتا ہے کہ ماقبل روی ساکن کے حرکت ہے۔ پس توجیہ میں یہ قید بڑھانی چاہیے کہ ماقبل روی کی حرکت بشرطیکہ وہ ماقبل حرف دخیل نہ ہو۔ مجری: روی کی حرکت جب کہ کسی حرف کے ملنے سے متحرک ہو جاوے، مثلاً بارش کی رے کا کسرہ۔ نفاذ: وصل کی حرکت جیسے بارش اشک کی شین کا کسرہ۔ اور اگر خروج اور مزید بھی متحرک ہو جاوے تو ان کی حرکات کو بھی نفاذ کہتے ہیں۔ جیسے داناے دل دونوں یاے تحتانی کے دونوں زیر اور نایرہ اگر ایک حرف ہو جیسے گفتہ ایم اور سفتہ ایم تو وہ ضرور ہے کہ ساکن ہو اور اگر ایک سے زیادہ ہو تو جونسا حرف متحرک ہوگا، اس کی حرکت کو بھی نفاذ کہیں گے، جیسے بردستیمش میں حرکت میم کی۔ کس واسطے کہ دال روی اور حرف رابط کا سین وصل اور تاے فوقانی خروج اور یاے تحتانی مزید اور میم متحرک اور شین ساکن نایرہ ہے۔

فصل عیوب قافیہ کے بیان میں:

جاننا چاہیے کہ ہر چند عیوب قافیہ کہ جن سے شاعران نازک کلام کو احتراز چاہیے، بہت ہیں لیکن ازبس کہ راقم اوراق کی نظر اختصار پر ہے، عیوب مشہورہ پر اکتفا کرتا ہے۔ وہ عیوب یہ ہیں: اقوا، اکفا، سناد، ایطا، معمول۔ ان عیوب کا بیان یہ ہے کہ اقوا حذو اور توجیہ کے اختلاف کو کہتے ہیں۔ حذو کا اختلاف کئی طرح ہے۔ ایک یہ کہ ہر جگہ حرکت ردف کی ہو، لیکن جداگانہ، مثلاً دار اور دور اور دیر، یہ اختلاف قطعاً جائز نہیں۔ دوسرا یہ کہ ایک جگہ حذو ردف کا ہو اور دوسری جگہ قید کا، خواہ قید حرف صحیح ہو، جیسے شور اور شعر، خواہ حرو اعلت ماقبل مفتوح ہو، جیسے دور بضم دال اور دور بفتحہ ف دال، یا دیر بہ کسرہ دال اور دیر بفتحہ دال۔ یہ صورت روی ساکن کے ساتھ کسی

طرح روا نہیں اور نہ کسی نے استعمال کی ہے۔ لیکن حرکت روی کے ساتھ بعضوں کے کلام میں پائی جاتی ہے، گو کہ درست یہ بھی نہیں ہے۔ جیسے طوسی اور فردوسی۔ تیسرا یہ کہ ایک جگہ حذو ہو اور دوسری جگہ حذو نہ ہو، جیسے کار اور گر، اور اختلاف توجیہ جیسے مقتل اور محفل۔ لیکن جب روی متحرک ہو جاوے تو ماقبل روی کی حرکت کا اختلاف روا ہے۔ جیسے بے دلی اور بے کلی اور رہم سری اور عنصری۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرکت روی کی صورت میں وہ حرکت توجیہ نہیں ہے اور جب توجیہ نہ ہوئی تو حرکات قافیہ میں سے نہ ہوئی اور جب حرکات قافیہ سے نہ ہوئی تو اس کا اختلاف قافیہ کا عیب نہ ہوا۔ اکنا: حرف روی کا اختلاف جیسے آب اور بادسنا داختلاف ردف جیسے جان و دین۔ ایطا: تکرار قافیہ یہ دو طرح ہے۔ خفی اور جلی۔ ایطائے خفی یہ ہے کہ تکرار ظاہر نہ ہو جیسے آب اور گلاب، کس واسطے کہ گلاب بہ سبب کثرت استعمال کے ایک کلمہ معلوم ہوتا ہے اور اسی قبیل سے ہے تائے مصدر کلمات عرب میں جیسے منت اور الفت اور رفعت۔ اور ایطائے جلی یہ کہ تکرار ظاہر ہو، جیسے دولت مند اور خردمند، ستم گر اور فسوں گر۔ اور جو قافیہ کہ ایطائے جلی پر مشتمل ہو اس کو قافیہ شایگان کہتے ہیں۔ پس ایطا عیب قافیہ ہے اور شایگاں قافیہ معیوب ہے۔ لیکن معلوم کیا چاہیے کہ ایطا جب ہے کہ مطلع کے پہلے مصرعے کا قافیہ مکرر نہ ہوا ہو بلکہ مکرر مطلع کے مصرع ثانی یا اور ابیات غزل کا قافیہ ہو۔ کس واسطے کہ مطلع کے پہلے مصرع کی تکرار کو ردمطلع کہتے ہیں نہ ایطا، اور ردمطلع عیوب میں داخل نہیں اور اس کی وجہ طول چاہتی ہے، اس واسطے اس کے بیان سے اغماض کیا۔ معمول: وہ قافیہ ہے کہ کلمہ قافیہ ہونے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، مگر بعد تصرف کے قافیہ ہو جاوے۔ اور یہ تصرف دو طرح ہے: ایک تخیل کے ساتھ، یعنی ایک کلمے کے دو جزو کر کے ایک کو قافیہ ٹھیراویں اور دوسرے کو ردیف، مثلاً بنا قافیہ کی الف پر ہو اور ردیف منفی، جیسے 'تجھ سا نہ تھا' اور 'کیا نہ تھا' اور ان کے ساتھ 'مے خانہ تھا' قافیہ کریں۔ پس مے خانہ کے دو جزو کر کے 'مے خا' کو قافیہ اور 'نہ' کو ردیف میں

محسوب کیا۔ اور دوسرا ترکیب کے ساتھ، یعنی دو کلمہ کو ایک کلمہ قرار دے کر قافیہ کریں، مثلاً قافیہ 'خانہ تھا' اور 'شانہ تھا' اور 'دانہ تھا' ہو اور 'کیا نہ تھا' ان کے ساتھ استعمال کریں۔ پس ظاہر ہے کہ لفظ 'نہ' اور 'کیا' کو ایک کلمہ قرار دے کر 'خانہ' وغیرہ کے ساتھ قافیہ کیا ہے۔ لیکن اہل تمیز پر واضح ہو کہ معمول عیب قافیہ نہیں بلکہ قافیہ معیوب ہے، جیسے شایگان، اور عیب قافیہ تحلیل یا ترکیب ہے۔ مگر عادت ارباب فن کی یہ ہے کہ شمار عیوب میں لفظ معمول مذکور کرتے ہیں۔

فصل روی کے احوال میں:

روی دو اسم ہے: مقید اور مطلق۔ روی مقید روی ساکن کو کہتے ہیں، جیسے کار اور بار۔ اور روے مطلق روی متحرک کو۔ اور اگرچہ جمہور اسی روی متحرک کو مطلق کہتے ہیں کہ بہ سبب وصل کی حرکت حادث ہوئی ہو، جیسے بارش اور خارش کی راء مہملہ کا کسرہ ،لیکن راقم کے نزدیک وہ روی بھی مطلق ہے کہ اس کی حرکت اضاف یا صفت سے حاصل ہو۔ جیسے 'کار خلق' اور 'یار خلق' اور 'کار نیک' اور 'یار نیک'۔

فصل اوصاف اور القاب قافیہ کے بیان میں:

جو قافیہ کہ سوائے روی کے اور کوئی حرف قافیہ نہ رکھتا ہو اس کو مجرد کہتے ہیں، جیسے سر اور بر، اور اگر اور حرف رکھتا ہو تو اس حرف کے ساتھ ملقب ہوتا ہے، جیسے کار اور بر قافیہ مردف اور ابر اور صبر قافیہ با حرف قید اور جاہل اور کاہل قافیہ موسس۔ ان امور کی تفصیل اس قدر ہے کہ یہ مختصر اس کی گنجایش نہیں رکھتا۔ اس واسطے اس سے اغماض انسب معلوم ہوتا ہے۔ اگر کسی کو اس امر کا اشتیاق دامن گیر ہو تو رسالۂ جناب افادت مآب استادی و مولائی مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالی کا مطالعہ کرے کہ مطالب اس میں اس کیفیت کے ساتھ ہیں کہ اس کی توصیف حیطۂ بیان سے خارج ہے۔

فصل ردیف کے بیان میں:

ردیف وہ کلمۂ مستقل ہے کہ بعد قافیے کے مذکور ہو۔ خواہ متحد المعنی، خواہ مختلف

المعنی۔ قسم اول: جیسے لفظ 'نہ تھا' اس شعر میں:

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

اور قسم دوسری جیسے اس شعر میں:

رہنے نہ اگر غیر سے دیتے تمھیں باہم
اس طرح سے ہوتے نہ کبھی تم سے جدا ہم

قافیہ 'با' اور 'جدا' ہے اور ردیف 'ہم'، لیکن مصرع اول میں بہ معنی یک دگر ہے اور دوسرے میں ضمیر متکلم۔ اور کبھی ردیف لفظ غیر مستقل بھی ہوتی ہے، جیسے قافیہ معمول میں۔ اس کی مثال کی کچھ حاجت نہیں۔

فصل حاجب کے بیان:

واضح ہو کہ حاجب وہ لفظ مستقل ہے کہ بیت اگر ایک قافیہ رکھتی ہو تو اس قافیے سے پہلے اور اگر ذو قافیتین ہو تو ان دونوں قافیوں کے بیچ میں مکرر واقع ہو۔ اول کی مثال یہ شعر ہے:

بس کہ درد و غم ہے سے شوارد یاں اے ریا رکا
اشک کا آنکھوں میں رہتا ہے بندھا اے یار تار

اور مثال دوسرے کی یہ شعر:

کس کے لب پر دل سے آہ سرد آتی ہے سدا
کان میں ہر دم جو ایک پر درد آتی ہے صدا

ہر چند کتابوں میں حاجب کی یہ ہی دو صورتیں مذکور ہیں لیکن ایک صورت اور بھی خیال میں آتی ہے۔ کہ ذو قافیتین میں دونوں قافیوں سے پہلے واقع ہو جیسے اس شعر میں:

غیروں کو جب سے تجھ پہ ہوا اختیار یار

عاشق تری نظر میں ہوا بے اختیار یار

مقصد تیسرا

اقسام شعر اور ان کی تعریف کے بیان میں

معلوم کیا چاہیئے کہ نظم کئی قسم ہے :فرد، رباعی، غزل، قصیدہ، نسیب، قطعہ، مثنوی، مسمط، ترجیع، مستزاد۔ ہر چند نسیب شعر کی قسم علیحدہ نہیں ہے بلکہ قصیدہ کا جزو ہے کہ باعتبار ایک حیثیت کے باقی اشعار سے ممتاز ہے، اور اسی طرح سے مستزاد کہ بعضے اصناف شعر مثل فرد اور رباعی اور غزل ایک صورت خاص میں اس اسم کے ساتھ مسمی ہو جاتے ہیں، اور حال اس کا اپنے اپنے محل میں مشروحاً دریافت ہو جاوے گا۔ آسانی فہم اور مبتدیوں کی تفہیم کے واسطے اقسام میں داخل کر کے ہر ایک کا بیان علیحدہ کیا جاتا ہے۔

فرد:

فرد ایک شعر کو کہتے ہیں کہ کوئی اور شعر اس کے ہمراہ نہ ہو، خواہ دونوں مصرعے مقفی ہوں، خواہ مصرع آخر۔ مثال اس کی ظاہر ہے۔

رباعی:

رباعی دو بیت کا نام ہے، خواہ مصرع اول اور ثانی اور رابع ہم قافیہ ہوں، خواہ چاروں مصرع۔ اور رباعی کے واسطے چوبیس وزن خاص معین ہیں کہ ان کا بیان عروض میں ہو چکا ہے۔ اس نظم کی دو بیت پر بنا ہونے کی وجہ یوں لکھتے ہیں کہ جس وقت شاعر نے یہ وزن اختراع کیا، اس وقت نہایت فرحت اور انبساط میں تھا اور زہرہ اور عطارد میں نظر تسدیس یا تثلیث اور آفتاب و مشتری میں نظر تثلیث تھی، اور خاص و عام اس وزن سے نہایت محظوظ تھے۔ اس نے اس نظم میں دو بیت پر اختصار کیا تا کہ طول سخن سامع میں ملال پیدا نہ کرے۔ مثال قسم اول کی یہ رباعی میر کی:

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے
کیا حرف سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رکے رہتے جنوں ہوتا ہے
اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

اور مثال قسم ثانی کی یہ رباعی میر کی:

ہجراں میں کیا سب نے کنارا آخر
اسباب گیا جینے کا سارا آخر
نہ تاب رہی نہ صبر و یارا آخر
آخر کو ہوا کام ہمارا آخر

غزل وقصیدہ:

غزل ایسے چند بیت متحد الوزن کو کہتے ہیں کہ بیت اول کے دونوں مصرع کا قافیہ باقی ابیات کے مصرع اخیر کے قوافی کے ساتھ متحد ہو۔ بیت اول کو مطلع کہتے ہیں، اور یہ ہی تعریف ہے قصیدے کی، لیکن فاصل اور فارق ان دونوں میں یہ ہے کہ غزل بارہ تیرہ بیت سے متجاوز نہیں ہوتی اور قصیدے کے واسطے نہایت نہیں ہے۔ مگر غالباً سو ڈیڑھ سو بیت سے زیادہ نہیں کہتے، اور اس زمانے میں غزل بیس پچیس بیت تک بھی کہتے ہیں۔ اور غزل وقصیدہ میں اس طرح سے فرق کرتے ہیں کہ اگر مضمون ہر بیت کا مختلف یا عاشقانہ ہو تو اس کو غزل جانتے ہیں، اور اگر مدحت یا نصائح اور مثل ان کے ہو تو قصیدہ۔ اور متاخرین غزل میں تخلص یعنی نام شاعر کا مقطع میں، اور قصیدے میں جس بیت میں چاہتے ہیں ذکر کرتے ہیں، اور قدما غزل میں بھی نام کو مقطع کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے تھے۔ اور بہتر یہ ہے کہ مضمون غزل عاشقانہ ہو تا کہ لفظ غزل کی مناسبت باقی رہے، کس واسطے کہ غزل لغت میں عورتوں سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں اور قصیدہ مغز غلیظ کو کہتے ہیں، جو کہ عادت قدما کی یہ تھی

کہ قصیدے میں الفاظ متین جو ممدوح کے تحشم اور علو شان پر دلالت کریں، استعمال کرتے تھے، اس نام کے ساتھ موسوم کیا۔

نسیب :

چند بیت کا نام ہے کہ قصیدے میں مقصد سے پہلے بطور تمہید کے مذکور کریں۔ اور جو کہ ان ابیات اور اشعار مدح وغیرہ میں کوئی واسطہ چاہیے، بعد ان ابیات کے ایسے ایک دو بیت ہوتے ہیں کہ مقصد کی طرف متوجہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ ان بیتوں کو عربی میں تخلیص اور فارسی میں گریز گاہ کہتے ہیں نسیب کو تشبیب بھی کہتے ہیں۔ اور جو کہ نسیب لغت میں عورتوں کے باتیں کرنے کو کہتے ہیں اور تشبیب ذکر ایام شباب کو، غالباً اوایل حال میں یہ بیتیں صرف عاشقانہ ہوتی ہوں گی، پھر رفتہ رفتہ اور مضامین مثل شکایت روزگار یا فخریہ وغیرہ پر بھی مشتمل ہونے لگیں۔ راقم غزل و قصیدہ کی مثال سے نسیب کی مثال پر قناعت کر کے سودا کے اس قصیدے سے جو بسنت خان کی مدح میں لکھا ہے، نقل کرتا ہے:

کل حرص نام شخصے سودا پہ مہرباں ہو
بولا نصیب تیرے سب دولت جہاں ہو
گر اشرفی روپے کی خواہش ہو تیرے دل میں
ظاہر ترے پہ ہر جا گنجینۂ نہاں ہو
لعل و گہر کی ہووے تجھ کو اگر تمنا
مصرف کے بیچ تیرے اشیاء بحر و کاں ہو
عمدہ تو اس قدر ہو سرکار بیچ تیرے
مور و ملخ سے زاید خیل ملازماں ہو
جاہ و جلا یاں تک دیوے تجھے زمانہ
جب ہو تری سواری صد فیل پر نشاں ہو

گر ملک چاہتا ہے تو تخت بیچ تیرے
ہندوستاں سے لے کر اور تا بہ اصفہاں ہو
آگے تو کیا کہوں میں دل چاہتا ہے تیرے
قبضے میں لے زمیں سے اور تا بہ آسماں ہو
سن کر یہ حرف بولا سودا کہ قدر و رتبہ
کب اشرفی روپے کا نزدیک عاقلاں ہو
یہ تو بڑے ہیں اتنے آفاق میں کہ جن کو
کیسے سے دور کچھ کام اپنا تب رواں ہو
عمدہ تو وہ کوئی ہے نزدیک فہم جس کی
اہل کمال آگے دنیا میں عز و شاں ہو
نام و نکو سے بہتر دنیا میں کیا نشاں ہے
یہ بھی کوئی نشاں ہے جو فیل پر رواں ہو
لعل و گہر جو پوچھو پتھر ہیں اور پانی
رتبہ نہ ان کو پیش ارباب ہمتاں ہو
ملکوں کی سر زمیں سے حاصل یہی ہو آخر
دو مشت خاک جس میں اک مشت استخواں ہو
ارض و سما کا ہونا قبضے کے بیچ اپنے
بے دعویٔ خدائی کیوں کر مجھے گماں ہو
جو کچھ کہا ہے تو نے تجھ کو یہ سب مبارک
میں اور میرے سر پر میرا بسنت خاں ہو

قطعہ:

ابیات متحدۃ الوزن والقافیہ ہیں بدون مطلع کے۔ پس اگر مطلع ہو اور ابیات حد قصیدہ سے کم ہوں تو غزل ہے ورنہ قصیدہ۔ مثال اس کی یہ قطعہ سودا کا ہے نواب شجاع الدولہ کی تہنیت سالگرہ میں:

گٹھاؤ ہوئے یہ اقبال و بخت کا تیرے
الٰہی تا بدم حشر یہ گرہ نہ کھلے
رہے فلک پہ درخشندگی میں تا میزاں
تو روز سالگرہ اپنی موتیوں سے تلے
عروج ہو ترے اعدا کا یوں تنزل میں
کہ جیسے مہر کی تابش سے کوہ برف گھلے

مثنوی:

وہ ابیات ہیں کہ وزن سب کا متحد اور قافیہ علیحدہ ہو، لیکن ہر بیت کے دونوں مصرع قافیہ رکھتے ہوں۔ چند بیت مثنوی میر سے بطریق نمونے کے مرقوم ہوتے ہیں:

ہے قابل حمد وہ سر انداز
جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز
اس کو مئے حسن سے چکھایا
ھستی کا نشہ اسے پلایا
پی ان نے شراب خود پرستی
طاری ہوئی اس پہ زور مستی
وہ مست شراب ناز ہے فرد
خورشید ہے اس کا جام پرورد

ہے گردش چشم اس کے افسوں
پھر جائے ہے جس کے ساتھ گردوں
عالم ہے قرابۂ مے خام
ہے دور سپہر گردش جام
مشہور جہاں جو کیف و کم ہے
بے نشہ جو ہووے تو ستم ہے
وہ مست نیاز ہے حرم میں
وہ رفتۂ ناز ہے صنم میں
ہے آب رخ زمانہ اس سے
روشن ہے تمام خانہ اس سے

مسمط:

مسمط :

مسمط وہ چند مصرعے ہیں کہ وزن وقافیہ میں متفق ہیں ہمراہ ایسے ایک مصرع کے کہ وزن میں ان مصارع سے موافق اور قافیے میں مختلف ہوتا ہے، اور گاہ گاہ یہ مصرع بھی ان مصارع کے ساتھ قافیے میں اتحاد رکھتا ہے، اور یہ امر اس مسمط کے پہلے بند سے ظاہر ہے کہ اس کے چند مصرعے مطلع غزل کے ساتھ الحاق کیے جاویں۔ مصنف 'مناظر الانشا' لکھتا ہے کہ مولانا وحید تبریزی کے رسالے میں کہ عروض اور قافیہ اور بدیع پر مشتمل ہے، مرقوم کہ مسمط چار مصرع سے دس مصرع تک ہوتا ہے۔ پس یہ تعریف مربع اور مخمس اور مسدس اور مسبع اور مثمن اور متسع اور معشر کو شامل ہے، یہاں تک کلام اس کا منتہی ہوا۔ لیکن مثلث بھی پایا جاتا ہے۔ اور جاننا چاہیے کہ جب ابیات مسمط کے مکرر ہو جاویں تو چاہیے کہ اخیر کے مصرعے قافیے میں

متحد ہوں۔ مثلث اور مربع اور مخمس کی مثال مرقوم ہوتی ہے کہ کثیر الوجود ہے اور باقی میں اشعار کم پائے جاتے ہیں۔ مثلث میر کا:

کیا کہوں میں عاشق و معشوق کا راز و نیاز
ناقہ را می راند لیلیٰ سوئے خلوت گاہ ناز
سارباں در رہ حدی می خواند و مجنوں می گریست

مربع ایک بند مرثیہ قاسم رضی اللہ عنہ کا تصنیف سودا کا:

گرد اس کے براتی سر و سینے سے ملے خاک
سب چاک گریباں کیے با دیدۂ نم ناک
فریاد و فغاں ان کی ہے بر گنبد افلاک
نے اشک تھا مرد کا یہ دیکھ نہ زن کا

مخمس سودا کا:

مجھے تو زور ہے ساقی کی یہ ادا بھائی
کہ پہلے جام کی مے خاک پر چھڑکوائی
جو پوچھا میں تو کہا مجھ سے سن یہ سودائی
چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی

بیاد آر محبان بادہ پیما را

ترجیع:

مصنف ''مناظر الانشا'' نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ ترجیع وہ شعر ہے کہ حصہ کیا جاوے ایسی بیت کے ساتھ کہ اس کے ہر مصرع میں قافیہ ہو، اور ہر حصہ اس کا چند بیت صاحب مطلع ہوتے ہیں کہ وزن اور قافیے میں اتحاد رکھتے ہوں۔ اس حصہ کرنے والی بیت کو بند ترجیع کہتے ہیں۔ اور وہ بند غالباً ہر جگہ ایک ہی بیت ہوتی ہے اور گاہ گاہ غیر اول کی اور بند چاہیے کہ ابیات سابق سے باعتبار معنی کے مرتبط ہو۔ اور شمس فخری معیار جمالی میں لکھتا ہے کہ ترجیع کئی قسم ہے۔ اول یہ کہ شاعر پانچ یا سات یا نو یا گیارہ بیتیں جس وزن اور قافیہ اور ردیف میں چاہے کہے، اور بعد ان کے ایک اور بیت لاوے، کہ اس قافیہ اور ردیف پر نہ ہو۔ اور پھر اسی قدر بیتیں کہ پہلے کہیں تھیں، کہہ کر ایک اور بیت لاوے۔ اسی طرح سے آخر تک تمام کو پہنچا دے۔ ان ابیات کو خانہ اور اس بیت کو بند کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعد ہر خانہ کی ابیات کے بند آئے ہوں کہ قافیہ اور ردیف میں اتحاد رکھتے ہوں۔ اگر ابیات بند کو جمع کریں ایک قطع ہو جاوے۔ تیسرے یہ کہ بند ہر جگہ ایک ہی بیت ہو۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ سب خانوں کی ردیف ایک اور قافیہ مختلف ہو یا بالعکس، یہاں تک شمس فخری کا کلام تمام ہوا۔ مؤلف کہتا ہے کہ صاحب 'مناظر الانشا' کے لکھنے سے کہ بند گاہ گاہ غیر مکرر ہوتا ہے، اور اقسام اربعہ مذکورہ کی پہلی اور تیسری قسم کی عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ ترکیب بند بھی ترجیع کی ایک قسم ہے۔ اور ماہران فن پر واضح ہے کہ ترکیب بند انہیں اشعار کو کہتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت پر ہو، اور شمس فخری کے اس قول سے کہ اگر ان ابیات کو جمع کریں تو ایک قطعہ ہو جاوے، معلوم ہوتا ہے کہ بند کے دوسرے ہی مصرع میں قافیہ ہو، نہ یہ کہ پہلا بند بہ شکل مطلع کے اور باقی ابیات ابیات غزل کے طور پر۔ اور شعرائے قدیم وحال کے کلام کا مشاہدہ بھی اسی کی

تائید کرتا ہے اور دو بیت پر بھی خانہ کی بنا رکھتے ہیں۔ اس روزگار میں یہ اشعار مسدس کے نام سے مشہور ہیں۔ اس مقام میں کچھ مثالیں مرقوم ہوتی ہیں۔

قسم اول:

یہ ترجیع بند مولوی عبدالکریم سوز تخلص خلف الصدق جناب استادی مولوی امام بخش صہبائی عم نوالہ کا:

یاد ایام کہ باہم تھی محبت منظور
عیش و عشرت ہی سے رہتا تھا سدا دل معمور
لب پہ آتا ہی نہ تھا حرف فراق و ہجراں
نہ جدائی کا وہاں ذکر نہ یاں کچھ مذکور
نہ اس شوق کہ کیجے ستم و جور و جفا
نہ یہ کچھ جبر ہمیں پر کہ سہیں ظلم ضرور
واں ہوا ظلم تو اک ناز سمجھ کر اس کو
یاں سہا جور تو الفت کا سمجھ کر دستور
بے قراری کا نہ تھا دل میں کہیں نام و نشان
نہ یہ تھی سینے میں سوزش نہ جگر میں ناسور
اتنی بے صبری و بے طاقتی و بے ہوشی
نہ یہ دل میں نہ وہ جاں میں نہ وہ سر میں مستور
نہ غم و درد سے پایا کبھی دن کو تاریک
نہ کبھی رات کو اندوہ سے دیکھا دیجور
دور تھا یوں ہی کبھی درد و غم و حسرت سے
جیسے اب عیش و مسرت سے ہوا ہوں مہجور
دل سے ارمان مرے رہتے تھے سب پاس ہی پاس

یاس و افسوس سدا جان سے تھے دور ہی دور
دل میں ہوتی تھی نہ اس طرح کی سوزش پیدا
جان رہتی تھی خنک اپنی مثال کافور
مجھ کو ہر وقت کے جلنے سے سروکار نہ تھا
اور جلاتا بھی اگر مجھ کو تو وہ پر تو نور
طور کی طرح جلاتی تھی تجلی مجھ کو
میں جو تھا طور کی مانند تو وہ جلوۂ طور
'ارنی' شوق میں کہہ بیٹھ کے موسیٰ کی طرح
'لن ترانی' کے اگر امر سے ہوتی مامور
تو یہ منظور نہ تھا اس کو کہ اپنے رخ کو
رکھے پردے ہی میں نظارگیوں سے مستور
بلکہ مقصود تو واں کر کے بہم راز و نیاز
شوق دیدار کو تھا صرف بڑھانا منظور
کام لب کرتے تھے کیا کیا نہ مسیحائی کا
نرگسی چشم سے ہوتا جو کبھی مین رنجور
میرے سینے میں جو تھا عیش تو تھا عیش میں دل
تھا وہ گنجینۂ عشرت تو یہ اس کا گنجور
اس طرح سے مجھے تھی جائے کسی کے دل میں
کہ بنایا ہمہ تن تھا مجھے گویا کہ مسرور
اس کی آنکھوں میں سمایا تھا کچھ اس طرح کہ میں
گویا تھا ہمہ بینائی چشم و ہمہ نور
جاں کو پاتے تھے جو تن میں تو بصد عیش و نشاط

دل کو جب دیکھتے سینے میں تو کیا کیا مسرور
یک قلم محو ہوا تھا یہ غم و درد و الم
کہ ٹھکانا ہی نہ لگتا تھا کہیں پاس نہ دور
اور دریائے مسرت میں یہ تھی موج زنی
عشرت و عیش کا اس طور سے تھا جوش و وفور
کہ اگر زخم بھی آتا تھا بدن پر کوئی
باندھ لاتا تھا اسی وقت وہ بھر کر انگور
بندھ کے انگور ٹپکتی تھی مئے عیش و نشاط
اور اس مے سے نشہ عیش کا رکھتا تھا ظہور
جان حاسد پہ برستی تھی پڑی نار پہ نار
دل پہ یاں اپنے اترتا تھا سدا نور پہ نور
اتنی سی بات پہ آپے سے گئے اپنے نکل
اتنے سے عیش پہ ہم ہو گئے کیسے مغرور
اتنی جمعیت خاطر پہ لگے یوں کہنے
کہ کوئی ہم کو پریشاں کرے، کیا مقدور
اور نہ سمجھے کہ زمانہ ہے بڑا شعبدہ باز
اس کے آگے نہیں چلتا ہے کسی کا بھی غرور
اس کی نیرنگی سے اک خلق جہاں ہے نا چار
اس کی بے رحمی سے ہے ایک زمانہ مجبور
دیکھتا ہے کہیں جس خانۂ دل کو آباد
اس کے ڈھا دینے میں کرتا ہی نہیں ہے یہ قصور
خاک میں سب کو ملا کر نہ رکھا نام و نشاں

نہ رہا روم میں قیصر تو نہ چیں میں فغفور
ہوتے اس کے ستم و جور سے کیوں کر آگاہ
پاتے کس طرح سے اس شعبدہ بازی پہ شعور
کہ کبھی جور فلک سے نہ ہوئے تھے عاجز
اور کبھی قہر سے اس کے نہ ہوئے تھے مقہور
کبھی گرداب الم میں نہ پڑے تھے آ کر
نہ کیا تھا کبھی دریائے صعوبت سے عبور
یاں بھی کی آخر وہی شعبدہ بازی آغاز
کہ ہر اک اپنی ہے عادت سے جہاں میں مجبور
یعنی وہ راز کہ تھا لاکھ طرح سے پنہاں
کر دیا بات کی ہی بات میں سب پر مشہور
کھل گئی عشق کی غیروں پہ حقیقت جس دم
لگ گئی آگ انہیں سن کے یہ ذکر و مذکور
میرا آزار انہیں ٹھیر گیا مد نظر
میری ایذا ہوئی ہر طرح سے ان کو منظور
اور ہر ایک نے چاہا کہ بلا سے کچھ ہو
مار ہی ڈالیں اسے جان سے حتی المقدور
شہد کا شہد گیا ہاتھ سے اپنے ھیہات
اور چبھی مفت رگ جاں میں نیش زنبور
چل سکا مجھ پہ نہ جب اور کوئی بس ان کا
میرے تکلیف کے دینے سے رہے سب مجبور
تفرقہ ڈال دیا مجھ میں اور اس میں ایسا

لفظ مہمل سے ہو جس طرح سے معنی مہجور
ان کے بہکانے سے یوں حرف وفا میٹ دیا
جیسے تھا ہی نہ کبھی لوح پہ دل کی مسطور
دم کے دم میں وہ بگڑا کہ کہوں کیا ہمدم
اتنی مضبوط محبت پہ خلاف دستور
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

تھی عجب نام خدا حسن کے اس گل کی بہار
حسن و خوبی کا شگفتہ تھا وہ گویا گلزار
دل نے چاہا کہ یہاں کا بھی تماشا کیجئے
ورنہ ہو گا یہ مزا مفت نصیب اغیار
ہاتھ ملنے کے سوا کچھ بھی نہ حاصل ہو گا
اور چلی جائے گی یوں ہی یہ بہار آخر کار
میں بھی سمجھا کہ اگر دل کا نہ مانا کہنا
تو یہ دل ہی کہیں ہو جاوے نہ مجھ سے بیزار
دل ہی بیزار جو ہو گا تو خرابی ہو گی
جاں بھی تنگ آن کے ہو جائے گی پھر رو بہ فرار
دل کے کہنے کو ہر اک طرح مقدم جانا
اور ہرا سیر و تماشے کے لیے میں تیار
کر کے ہر ایک سے ہر طرح رسائی پہنچے
ایسے کوچے میں کہ تھا واں کا پہنچنا دشوار

اور وہاں جا کے پھر اک طرز سے اک حیلے سے
جس کا منظور نظارہ تھا کیا واں بھی گذار
جا کے دیکھا تو وہ دیکھا کہ نہ دیکھا نہ سنا
واں جو پایا تو یہ پایا کہ کروں کیا اظہار
بھر گیا نور سا آنکھوں میں یکایک جو مری
ہو گیا دیکھ کے حیرت سے میں نقش دیوار
آنکھ کہتی تھی کہ اب طاقت نظارہ ہے طاق
دل یہ کہتا تھا کہ یاں سے ہی نہ ہٹیو زنہار
نطر شوق کا ایما کہ اسے بت کہیے
اور پہن لیجیے الفت میں اسی کی زنار
عقل کہتی تھی کہ ہے اس میں فرشتے کا ظہور
عشق کہتا تھا کہ دے دیجے خدا اس کو قرار
کسر شاں اس کی جو بت کہیے، خدا کہیے تو کفر
اس کے حق میں تو کہیں کیا کہ ہے کہنا دشوار
اور اگر کہیے تو اتنا ہی زباں سے کہیے
کہ خدا جانے وہ کیا تھا نہیں کھلتا اسرار
نہ خدا تھا نہ بشر تھا نہ ملک تھا نہ پری
اور جو دیکھو تو ز سر تا بہ قدم پر انوار
اس قدر مایۂ خوبی ، پہ وفا بھی کچھ تھی
بے وفائی کا نہ تھا نام کو ذکر و اذکار
ہو گیا ربط نظر ملتے ہی ایسا باہم
کہ جہاں میں کہیں دیکھا نہ سنا ہو زنہار

لیک تھی کچھ تو حیا مانع نظارۂ شوق
اور تھے کچھ خلل انداز رقیب و اغیار
کبھی یہ ڈر کہ کہیں جائے مقدر نہ الٹ
نہ زمانے کے کہیں ہوویں مبدل اطوار
کبھی یہ خوف کہ اس عیش و مسرت میں بہم
تفرقہ ڈالے نہ لا کر کوئی چرخ دوار
تھے بھرے سینے میں یاں تک تو غم و درد و الم
اور اس طرح سے تھا دل پہ ہجوم افکار
منع نظارہ کے تھے اتنے تو ساماں موجود
نظریں پر اس پہ بھی ہو رہتی تھیں آپس میں دو چار
چند مدت تو یوں ہی شرم و حیا میں گذری
اور ہوئی خلق پہ آپس کی نہ الفت اظہار
بے غرض یوں رہے ظاہر تو کہ گویا کچھ بھی
نہ تعلق اسے مجھ سے نہ مجھے اس سے ہے کار
اور باطن میں جو دیکھو تو وہی شوق وصال
وہی نوبت وہی صورت وہی الفت وہی پیار
بعد چندے جو اٹھا شرم و حیا کا پردہ
نہ رہا مانع نظارۂ باغ دیدار
اب زمانے کا نہ کچھ خوف نہ کچھ بیم رقیب
نہ نصیبے کی طرف سے کوئی کھٹکا زنہار
رہ گئے بلبل و گل دونوں بہم گلشن میں
نہ وہ خاطر میں خلش ارر نہ دامن میں وہ خار

چند مدت تو اس انداز سے گذری اوقات
پھر نئے سر سے اسی غم نے کیا دل میں گذار
یعنی اس رخ پہ ابھی کھلنے بھی پائی تھی نہ آنکھ
کہ لگے ہونے عیاں، خط کے سے کچھ کچھ آثار
نہ رہیں حسن کی، پہلی سی تر و تازگیاں
نہ رہی آئینہ ساں پہلی سی تاب رخسار
زلف سنبل تھی، مگر کچھ تھی پریشانی اور
نہ وہ اگلی سی خم و چم تھی نہ ویسی طرار
نہ وہ پیشانی میں چیں اور نہ چیں میں وہ مزا
نہ وہ مژگاں کی کجی، اور نہ وہ ابرو خم دار
چشم اس کی وہی نرگس تھی پہ حیراں حیراں
نگہ اک مے تھی مگر جس سے کہ افزوں ہو خمار
لب تھے اک غنچۂ سر بستہ، سو اب وا دیکھے
تھی جو سوسن سی زباں ، ہو گئی کیسی طرار
نہ وہ غفلت، نہ تغافل، نہ وہ پہلی سی حیا
نہ وہ شوخی، نہ وہ باتیں، نہ وہ لطف گفتار
نہ وہ عشوہ، نہ وہ غمزہ، نہ وہ ناز و انداز
نہ ادائیں، نہ اشارے، نہ کرشمے ہر بار
نہ وہ پنجہ، نہ وہ ساعد، نہ وہ بازو، نہ وہ دوش
نہ وہ گردن، نہ وہ سینہ، نہ وہ ناف آئینہ دار
نہ وہ زانو، نہ وہ ساقیں، نہ وہ پائے رنگیں
نہ وہ قد اور نہ وہ قامت، نہ وہ طرز رفتار

اس کی رفتار قیامت تھی، پر از فتنہ و شور
جس سے عشاق پہ آتی تھی، قیامت ہر بار
اب نہ وہ آپ قیامت نہ کچھ اس میں فتنے
نہ وہ آفت نہ وہ محشر نہ وہ شورش زنہار
کثرت گل سے شگفتہ تھا گلستاں جس جا
پل کے پل میں نظر آنے لگے واں خار ہی خار
مجھ کو آتا ہے، اسی بات پہ ہر دم رونا
مٹ گئی دیکھتے ہی دیکھتے، کیسی یہ بہار
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

قسم ثانی میر کا

عمر گذری، ہو چکا آسودگی کا روزگار
رنج و محنت کے تئیں، آرام سے ہے ننگ و عار

معرکہ ہے یک طرف، دونوں ہوئے ہیں سامنے
زخم دل کی یہ ہنسی، وہ گریۂ بے اختیار

کجملہ ہے گھٹ رہے ہیں اک طرف کتنے جو یہ
صبر سے بے طاقتی، دل اور درد بے شمار

عاشقی جب کی تھی میں نے تب نہ تھیں یہ خواریاں
کیا کہوں کیا کچھ دکھاتا ہے مجھے اب ہجر یار

سینہ دیکھو چاک، منہ ناخن سے سب نوچا ہوا
آنکھیں دیکھو ڈوبی خون میں جی کو دیکھو بے قرار

اے کہ گفتی عشق را درمان ہجراں کردہ اند
کاش می گفتی کہ ہجراں راچہ درماں کردہ اند

اک کنارے وہ تو جو ہیں گے زمیں کے زیر یاں
خاک پر بسمل پڑے ہیں، کیسے کیسے شیر یاں

دو قدم پر ہے، یہ ہنگامہ، ترے کوچے کے بیچ
آشنائی کچھ نہیں لگنے کی تجھ کو دیر یاں

منہ پہ کھانے والے تلواروں کے بھوکے موت کے
سیکڑوں یک جا ہیں، وہ جینے سے جو تھے سیر یاں

دھڑ نہیں سر ہی پڑا ہے سر نہیں تو دھڑ ہی ہے
ہیں زیارت کردنی، یہ کشتۂ شمشیر یاں

غم زدے، بے خانماں، بے وارثے، بے کس غریب
زخموں کے دامن لے منہ پر، ہو رہے ہیں ڈھیر یاں
گر تو ہم آئی پئے طوف شہیداں دور نیست
گریہ می آید دریں جا راہ چنداں دور نیست

قسم ثالث:

اس کی مثال ریختہ میں بر سر دست نہ تھی اس واسطے فارسی مرقوم ہوئی۔

سلمان ساوجی

آئینۂ جمال جاں، گشت لقاے روے تو
آئینہ ندیدہ ام، من بصفای روے تو
برگ گل است در نظر، گو برخ تو اند کے
ماند و گر نماند او، ما و لقاے روے تو
در دو جہاں بجاں ترا، خلق ہمی خرند و من
ہر دو جہاں نہادہ ام نیم بہاے روے تو
روے تو دید چشم من، در پے دیدہ رفت دل
حست گناہ چشم من نیست جفاے روے تو
چوں بر تیغ روے ابر از کف بادشاہ ما
در عرق است دم بہ دم گل ز حیاے روے تو
کسریٰ و جم بہ جب او، ہر دوشہ دروغی اند
حاتم و معن بر درش، ہر دو گدای راستیں
وہ چہ شود اگر شوم، کشتہ راے چوں توئی
صد چو من ار فنا شود باد بقاے چوں توئی

جور تو هست دولتے، کاں نہ رسد بہ ہر کسے
کے بہ چو من رسد گہے، جور و جفاے چوں توئی
عشق بہ قدر دان ہما قلۂ سر نشیمنش
تا بسرے کہ اوفتد ظل ہماے چوں توئی
نیست مرا وفا و گر نیز بود، عجب بود
گر بہ کسے چو من رسد، بوے وفاے چوں توئی
بر سر کوی عاشقی، شاہ و گدا یکے بود
بادشہی کند کسے، کوست گداے چوں توئی
ہست ز آبروی او بر لب جوے سلطنت
سر و جلال و جاہ را نشو و نماے راستتن

قسم رابع:

یعنی خانہ کو دو بیت پر بنا کرنا بہ طرز ترکیب بند کے۔ میر:

یاد ایام کی خوبی سے خبر تجھ کو نہ تھی
سرمہ و آئینے کی، اور نظر تجھ کو نہ تھی
فکر آراستگیٔ شام و سحر تجھ کو نہ تھی
زلف آشفتہ کی سدھ دو دو پہر تجھ کو نہ تھی
شانہ تھا نہ بلد کوچۂ گیسو تیرا
آئینہ کاہے کو تھا حیرتی رو تیرا
آگہی حسن سے اپنے تجھے زنہار نہ تھی
اپنی مستی سے تری آنکھ خبردار نہ تھی
پاؤں بے ڈول نہ پڑتا تھا یہ رفتار نہ تھی

ہر دم اس طور کمر میں تری تلوار نہ تھی

خون کاہے کو یہ کوچے میں ترے ہوتے تھے

دل زدے کب تری دیوار تلے روتے تھے۔

بہ طور ترجیع بند کے۔جرأت:

نہ کیوں کہ روئیے زانوے غم پہ سر کو دھرے

بغل میں کیوں نہ دل اپنا تڑپ تڑپ کے مرے

خبر جو ہوئے اسے تو وہ کچھ خدا سے ڈرے

سو اپنے حال سے آگاہ اس کو کون کرے

نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغ نامہ برے

کہ زبے کسی ما نے برد خبرے

غم فراق سے ہے دکھ پہ دکھ الم پہ الم

جگر پہ داغ مژہ اشکبار لب پہ ہے دم

سنائے کون کہے کون اس سے اپنا غم

نہ کوئی یار نہ کوئی رفیق و نے ہم دم

نہ قاصدے نہ صبائے نہ مرغ نامہ برے

کہ زبے کسی ما نے برد خبرے

مستزاد:

مستزاد ایسا کلام منظوم ہے کہ اس کے مصرع یا بیت کے بعد اس طرح سے ایک پارہ کلام زیادہ کیا جائے کہ بہ حسب معنی اس نظم سے مرتبط ہو۔ مگر جاننا چاہیے کہ مستزاد رباعی اور غزل وغیرہ کے مقابل نہیں ہے، بلکہ رباعی وغیرہ کے ساتھ بھی جمع

ہو جاتا ہے، یعنی رباعی و غزل مستزاد ہوتی ہیں۔ اور اگر مقابل ہوتے تو ان دونوں کا جمع ہونا محال تھا اور یہ امر کہ وہ پارۂ کلام جو زیادہ کیا جاتا ہے، نثر ہے یا نظم؟ ایک بحث دور دراز رکھتا ہے۔ اس کی تفصیل استادی و مولائی جناب مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ کے رسالۂ قافیہ سے جس کا نام وافی ہے، دریافت کریں کہ اس سے بہتر کسی کتاب میں مرقوم نہیں ہے۔ ملخص کلام یہ ہے کہ وہ پارہ بھی نظم ہے، نہ نثر جیسے کہ بعضوں کا گمان ہے۔ اس جگہ رباعی مستزاد پر کفایت کرتا ہوں۔ میر:

کیا کیا آتی ہے اپنے دل میں لیکن کیا کہیے کہ آہ
محراب میں سر ماریے کب تک تجھ بن غم ہے جاں کاہ
تو مست گزارہ ہوے غیروں کی جا چھپ چھپ کر رات
ہم پھیرتے تسبیح رہیں ساری رات سبحان اللہ !!!!

خامۂ خام رقم اس مقام پر تحریر تبصرہ سے فارغ ہوا۔ اب چاہتا ہے کہ جادۂ مقصود اصلی یعنی تذکرۂ شعرائے فصاحت بیان میں سرگرم ہو اور سرانجام امر ضروری میں آمادہ۔ بلکہ مولف بے چارہ کی انگشت کو مرکب اور صفحے کو میدان قرار دے کر قریب تھا کہ جولان کرے، ناگاہ خرد دقیقہ شناس نے صدا دی کہ اے حق ناشناس! تیری طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمائے شعرائے بلیغ کی تسطیر میں حروف تہجی کی رعایت منظور ہو اور یہی طور ملحوظ۔ اس صورت میں کلام وحی نظام، حضرت سلطنت پناہی، ظل الٰہی، زیبندۂ تخت جم، پرورندۂ عسا کر خدم، خلد اللہ ملکہ اور سخن اعجاز مثابہ وارث تاج و نگیں، ولی عہد با عز و تمکین ضاعف اللہ جلالتہ و قدرہ۔ اگر انہیں اسما کی سلک میں منسلک ہو تو راہ اسائت ادب کس قدر مسلوک اور قاعدہ دانی کی مخالفت کس قدر مرعی ہوگی اور اگر اس کی تحریر سے قاطبتہً ہاتھ کھینچا جائے اور اس بحر ذخار سے ایک قطرہ اور اس چشمۂ بے کراں سے ایک نم بھی ہاتھ نہ آئے، تشنہ لبان وادیٔ استعداد کی حسرت اور تفسیدہ دلان دشت کمال کی آرزو کی شکایت کا کیا جواب ہے؟

پس مناسب یہ ہے کہ ان دونوں کلام الہام نظام کو افسر کتاب اور تاج صحیفۂ بلاغت نصاب کرے کہ سر رشتۂ ادب ہاتھ سے نہ جائے اور تقاضائے طلب بھی حرف شکوہ زبان پر نہ لائے۔

چہ خوش بود کہ بر آید بہ یک کرشمہ دو کار

اس واسطے صابر قاعدہ شناس اس پند دل پذیر کو زیور گوش اور اس نصیحت سود مند کو مفرح ہوش کرکے آغاز کتاب کو ان لآلی شاہوار اور ان جواہر آب دار سے زینت دیتا ہے۔

شہی کاں جامع قدر و جمال است
ہنر ور پرور و صاحب کمال است
خدایا بر سر ما زندہ اش دار
چو ذات خویشتن پایندہ اش دار

اشعار گوہر نثار حضرت ظل اللہ ملک سپاہ انجم حشم خورشید عالم مسند آرائے عدل و داد ماحی رسوم جور و بے داد، منبع لطف و کرم، حادم اساس ظلم و ستم، خسرو گردوں سریر، بادشاہ فریدوں نظیر، سلطان معرفت آگاہ، ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کہ کشور سخن میں اکلیم کشایان معنی سے نام ور تر اور نام بلند مقام اس عالم گیر کمال کا جہان نظم میں ظفر ہے:

پیام بر جو ادھر سے مرا نہیں آتا
تو کیا کہوں کہ مرے دل میں کیا نہیں آتا
غریق بحر محبت پہ تیرے کیا گزری
کسی سے سننے میں کچھ ماجرا نہیں آتا
نہ ہو فراق میں جب تک کہ خوب بے مزگی
وصال یار کا ہرگز مزا نہیں آتا

موڑا نہ کبھی منہ تری شمشیر جفا سے
میرا سا کسی کا بھی جگر ہو نہیں سکتا

کبھی جا کر نہ پھرتا میں گلی میں خوب رویوں کی
اگر مجھ کو نہ میرا یہ دل مضطر لیے پھرتا

نہ تھا کچھ دور تو رستہ بہت اس یار کے گھر کا
مگر ہم کو ہماری ناتوانی نے تھکا مارا

جانے دو جاتا ہے گر عمر رواں کا کارواں
ٹھیر جائے گا کہیں آخر کہاں تک جائے گا

دام سے صیاد! مرغ ناتواں چھوٹا تو کیا
یہ نہیں امید اڑ کر آشیاں تک جائے گا

میں اور دوں دل اپنا کسی کو ترے سوا
تیرا خیال یہ کدھر اے نازنیں گیا

اسیران قفس کا دم ہوا ہوتا ہے حسرت سے
چمن سے کب کوئی جھوکا نسیم صبح کا آیا

حرف تلخ اس لب شیریں سے مزا دیتا ہے
چھیڑ کر کرتے ہیں ہم اس لیے دشنام طلب

دام بلائے زلف میں کچھ بے طرح سے دل
جا کر پھنسا ہے دیکھیں رہائی ہو کس طرح

ہمیں ہے ایک اسی گل عذار سے اخلاص
اسے ہزار سے الفت ہزار سے اخلاص

جو دیکھوں بزم میں اس شوخ جنگ جو کی طرف

چھری کو دیکھ کے دیکھے مرے گلو کی طرف

کیا ستم ہے وہ صریحاً ہم پہ کرتے ہیں ستم
اور کہتے ہیں کہ یہ لطف و کرم کرتے ہیں ہم

گو بن گیا ہوں سوکھ کے کانٹا سا میں حقیر
لیکن کھٹکتا اب بھی ہوں چشم حسود میں

کوہ کو پانی نہ کر اے نالۂ خارا گداز
مارنے سر سے ہمیں دو چار پتھر اور ہیں

اے خدنگ یار کیوں سینے سے اٹکا جائے ہے
ہم ترے رہنے کو اپنے دل میں گھر دیتے تو ہیں

جلد آ کہیں اے رشک مسیحا کہ یہ ہے حال
پانی ہیں چواتے ترے بیمار کے منہ میں

میں باغ دل کشا میں بھی تجھ بن گرفتہ دل
ہوں اس طرح کہ جیسے گنہ گار بند میں

تسلی ہم کو ہو جاتی ہے جس دم غیر کے منہ سے
شکایت ہم تری اے دل ربا طناز سنتے ہیں

دیکھ تو ہجر کی شب کیوں کر ترے سوختہ جاں
شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کرتے ہیں

یہاں تو کہتے ہیں لائیں گے ہم کچھ اس کو کہہ سن کر
وہاں جا کر مرے ہمدم نہ کہتے ہیں نہ سنتے ہیں

کہے دیتی ہیں نگاہیں ہی تمہاری سب کچھ
کیا ہوا گر نہیں تم کہتے حیا سے کچھ ہو

سینے پہ دھر کے دیکھ ذرا ایک بار ہاتھ

یہ حال ہے کہ اچھلے ہے دل چار چار ہاتھ

میرا دل رمیدہ ہوا کب کسی کا صید
قسمت سے آ گیا ہے ترے یہ شکار ہاتھ

وفور گریہ نے میرے بچا لیا ورنہ
جلا چکی تھی مری آہ شعلہ بار مجھے

بلا سے دل کو وہ لے جائے پر کچھ ایسا ہو
کہ جان ہاتھ سے اس شوخ فتنہ گر کے بچے

خانۂ دل کا مرے ہے عشق تجھ کو اختیار
رنج و غم درد و الم جو کچھ ہے تیرا اور وہ ہے

اللہ اللہ رے ان بتوں کا غرور
یہ خدائی نہیں تو پھر کیا ہے

کلام وحی نظام

قائم مقام حضرت خلافت پناہی، بانی بنائے سلطنت دست گاہی، ولی عہد داور روزگار، والی شہر و دیار، آشنائے بحر تدقیق، غواص محیط تحقیق، مستجمع عز و اجلال، مرجع دولت و اقبال، وارث تاج و نگین شہریاری، مستحق تخت و افسر کامگاری، شائستۂ تفاخر، مرزا فتح الملک بہادر دام اقبالہ و ضاعف اجلالہ کہ وجود با جود اس منبع فضل و افضال کا ازبس کہ ایک رمز ہے رموز پردۂ غیب سے اور ایک سر ہے اسرار عالم لاریب سے، بمقتضا اس کے: "الاسماء تنزل من السماء" حاملان عرش سخن نے اس عرش تا زمال کا نام نامی رمز مقرر کیا کہ اسم با مسمّیٰ کا مصداق مہیا ہو، اور دعویٰ با دلیل جلوہ نما:

ماتا کہ نہ دل لے کر تو مجھ سے وفا کرتا
پر دل کی تسلی کو وعدہ تو کیا کرتا

طرز رفتار نے تری ظالم
رفتہ رفتہ مجھے تمام کیا

دل گرفتہ ہو خوش سیر لالہ زار سے کیا
غرض ہے غنچۂ تصویر کو بہار سے کیا

وہ لے گئے ہیں خدا جانے کس طرح دل کو
دیا ہے میں نے انہیں اپنے اختیار سے کیا

انقلاب دہر سے اک ہم رہے خانہ خراب
ورنہ عالم بارہا بگڑا ہے اور بن بن گیا

تم رہو اور مجمع اغیار
میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا

پھر تمہارے ستم اٹھانے کو
رمز اچھا ہوا برا نہ ہوا

ہم کو مارا ترے تغافل نے
مفت نام اجل خراب ہوا

میں جو رسوائے زمانہ ہو گیا
اس کی شہرت کو بہانہ ہو گیا
جا پڑے ہم کوچۂ جاناں میں رمز
بارے اپنا بھی ٹھکانہ ہو گیا

دل بے تاب ہو گیا تجھ سے رفاقت کی امید
کون ہوتا ہے برے وقت میں جو تو ہو گا

اور صورت سے کیا غرض اے رمز
ہے پسند اپنے یار کی صورت

غم کے آثار خوشی میں بھی ہیں دیکھو موجود
جو کہ ہنستے ہیں بہت اشک بہاتے ہیں بہت

جل گیا پروانہ تو یہ بھی سحر تک ہے تمام
فاصلہ اک شب کی شب کا درمیاں رکھتی ہے شمع

جس میں جذب ہو نہ اثر ہو نہ درد ہو
اس دل کو رکھ کے سینے میں پھر کیا کریں گے ہم
بے تابیوں سے اس دل خانہ خراب کی
کیا کیا کیا ہے اور نہ کیا کیا کریں گے ہم
غصے کی کہاں ان کے ہمیں تاب ہے اے رمز
مر جائیں اگر دیکھیں انہیں چیں بہ جبیں ہم

اسلام و کفر دونوں سے قطع نظر کریں
تنگ آ گئے کشاکش دیر و حرم سے ہم

ہوئی صورت نہ کچھ اپنی شفا کی
دوا کی مدتوں برسوں دعا کی

دردِ فراق، فکرِ عدو، طعنِ دوستاں
اس ایک جان پر مری کیا کیا بلا نہیں

وصل کی شب حشر کا دن ہو تو شاید کچھ کہیں
اس قدر شکوے ہیں دل میں اس ستم گر سے ہمیں

اے دلِ بے تاب اتنا اضطراب!
صبر تجھ پر اور تو میں کیا کہوں

خو کردۂ رفتار ترا بعد قیامت
یہ بھی تو نہ جانے کہ قیامت ہوئی کس دن

کیوں نہ دوں زخم کو جگہ دل میں
کیا یہ قاتل کی یادگار نہیں؟

ہم کو کیا غیر کے آنے کی خبر
چغلیاں نقشِ قدم کھاتے ہیں

دل کہیں دے بیٹھو ہو اے رمز تم جس روز سے
طور ہی کچھ آپ کے اے بندہ پرور اور ہیں

یاں یہ حالت کہ دم لبوں پر ہے
واں وہ غفلت کہ کچھ خیال نہیں

تم نہ تھے غیر کے گھر میں شب کو
بس چلو یوں ہی سہی جانے دو

اس کے آنے کی اگر کوشش میں
جان جائے تو چلی جانے دو

منہ دکھانا ہے خدا کو اک دن
اے بتو اتنی خودی جانے دو

تیر مارا ہے تو ظالم تو چھر بھی پھیر دے
یہ بھی حسرت رہ نہ جائے اس ترے نخچیر کو

پیٹوں جنوں میں سر کو کہ روکوں سر شک کو
تھاموں قلق میں دل کو کہ رکھوں جگر پہ ہاتھ

معلوم ہو گی داور محشر کے سامنے
پرسش ہوئی جو مجھ سے کسی داد خواہ کی

اپنا نہ جانتے تھے جو اے رمز تم اسے
کیوں جان ایک غیر کے پیچھے تباہ کی

چھیلنے کو زخم، ناخن تو خدا نے دے دیے
پر مجھے اب پر نمک کوئی نمک داں چاہیے

الٰہی موت تو ہو گی مگر یوں ہو تو بہتر ہے
کہ سر ہو پاؤں پر قاتل کے اور سجدے میں دم نکلے

شوق کہتا ہے کہ چل اور ضعف سے
اٹھ نہیں سکتا قدم کیا کیجیے

حشر تک ہے مرا ترا جھگڑا
کیا ابھی انفصال ہوتا ہے

یاد بت میں عمر گذری یاں تو رمز
کیا کہو گے واں خدا کے سامنے

یا تو وہ رہتے تھے میرے دل میں رمز
یا کیا گھر اس میں اس کے تیر نے

کیوں نہ لب حسرت سے کاٹوں میں کہ میرے سامنے
بوسہ اس لب کا لیا جام شراب ناب نے

دل لے تو گئے ہیں وہ ہمارا
پر دیکھیے اس کو کیا کریں گے

کاٹ دے اس کو بھی تو اے قاتل
لگ رہی گردن اک ذرا سی ہے

اپنے رہنے کا ٹھکانا اس گلی میں ہو نہ ہو
رمز اس کے دل میں پر اپنا ٹھکانا چاہیے

کیا جانے آج دل کو مرے ہو گیا ہے کیا
پہلو میں یار اور اسے اضطراب ہے

رمز ہیں صورت پہ اس کی شیفتہ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

ہاتھوں سے تیرے بچا نہ وہ بھی
اک رمز تھا جاں نثار ہے ہے

-------اختتام----حصہ الف--------

آغاز تذکرہ

راقم رنگیں نگار، صابر عجز شعار جب صفحۂ اوراق کو لآلی آبدار و گرہر شاہوار یعنی اشعار درر نثار حضرت ظل سبحانی خلیفۂ ربانی۔ اور افکار جواہر نگار، قایم مقام سلطان، ولی عہد خلیفۂ دوران خلد اللہ ملکہما سے زیب و زینت دے چکا، اب اقتضائے مقام دامن گیر ہے کہ تحریر تذکرہ میں کمر ہمت کو چست اور عزم سخن سنجی کو درست کرے۔ ناگزیر شب دیز قلم کو اس میدان وسیع میں جولان دیتا ہے اور تیمناً جناب مستطاب معلی القاب ملک العلما، مرجع الفضلا، حامی شرع خاتم انبیا، ماحی آثار بدع و اہوا، عیار افزائے کمال، چاشنی گیر فضل و افضال، جامع ضدین دنیا و دین، مولانا و بالفضل اولانا مولوی محمد صدر الدین دامت برکاتہ کے کلام معجز انتظام سے آغاز کتاب کو رونق پذیر کر کے سعادت کونین حاصل کرتا ہے۔

زہے بلندیٔ نامش کہ تاج تارک نظم

چو وستک و زہے و حبذا وہاں آمد

۔۔۔۔۔۔۔۔صفحہ نمبر ۔۲۰۷ تک

باب الالف

الف ممدودہ

* * *

آزردہ

آزردہ نام بلند مقام اس مجمع مفاخر ومعانی کا ہے کہ فضل وکمال اس کے سایۂ حمایت میں اگر فرق دانش افلاطونی پر ٹھوکر مارے، تاج افتخار سے مشرف کرے، اور علم وہنر اس کی طبیعت رسا کی اعانت سے اگر ارسطو کی بلندئ کمال کو خاک مذلت پر کھینچے، فلک اعتبار پر پہنچا دے۔ اندیشہ اگر فلک تہم کے اوج تک پہنچے، اس کے ایوان جاہ کے کنگرے کو ہزار فرسخ سے مشاہدہ کرے، اور فکر اگر امکان سے سو مرحلہ آگے جائے اس کے شہ سوار کمال کا غبار کروڑ قدم اس طرف سے نظر آئے۔ یعنی افضل فضلائے روزگار، اکمل کملائے شہر و دیار زبدۂ نتائج سعود افلاک، اسوۂ شتا بندگان عرصۂ خاک، قدردان ہنر، مرتبہ شناس ہنرور، مرجع معانئ رنگین ومضامین دل نشین، مولانا و بالفضل اولانا مولوی مفتی محمد صدرالدین کہ اس جزو زمان میں عہدۂ صدرالصدوری کی مسند ان کے زیور تمکن سے ممتاز اور ان کے قصر عدل وانصاف کو ایوان نوشیرواں پر ناز ہے۔ علم اگر ان کے گوشۂ طبیعت میں معتکف نہ ہوتا، سبک تازئ جہل سے پامال ہو جاتا، اور کمال اگر ان کی ذات سے شرف نہ لیتا، سر اعتبار کو اوج فلک تک نہ پہنچاتا۔ فکر رسا ان کا اگر مجمل سے تفصیل طلب ہو قطرۂ آب کے نقطے سے سطور امواج اس قدر پیدا کرے کہ ریگ صحرا اس کے شمار میں کافی نہ ہو، اور دانۂ ریگ میں پشتۂ خاک کا اتنا ہجوم نظر آوے کہ اگر قطرات بحر اور رشتۂ موج تسبیح بنے اس کے حساب کے واسطے وافی نہ ہو۔ ھیہات یہ کیا نافہمی ہے کہ ایسے جامع معقول ومنقول اور حاوئ فروع واصول کو کہ مجلس علم وکمال اور بارگاہ تکمیل واکمال

میں علمائے تحریر اور کملائے بے مثل و نظیر امید استفادہ میں گوش بر آواز اور تحصیل کمالات، اور استیعاب فواید سے کہ کتاب افادات سے ایک حرف اور نسخۂ ارشادات سے ایک نقطۂ بیش تصور نہیں کیا جاتا ہے۔ ہنگامۂ دعویداران ہنر میں ممتاز ہیں۔ چار بالش منصب بلند یعنی تحقیق مسائل علوم اور تدقیق غوامض فہوم پر متمکن دیکھنا اور انظار فلک گزار اور افکار آسمانی سیر کی سفارت سے نامہ نگاران وحی و الہام کے بیان سے لمحہ لمحہ کامیابی کو مشاہدہ کرنا، اور ان مراتب علیا اور مدارج والا سے مطلق غافل گزرنا، یعنی نہ آسمان ہیئت و نجوم کی معراج کا وصف اور نہ زمین طبعیات کی سیر کی مدح، نہ منطق کی زبان آوری کا حال، اور نہ سر رشتۂ بلاغت کی رسائی کا کاوا گویہ، نہ شبستان حکمت اشراق کی چراغ افروزی کا مذکور، اور نہ عرصہ مشائیت کی غبار انگیزی کا ذکر، نہ حدیث کی حکایت اور نہ تفسیر کا بیان، نہ فقہ کی مہارت کے اوصاف میں اپنی طرف سے اجتہاد، نہ اوروں کی تقلید، نہ توصیف اصول میں ریشہ دوانی، اور نہ تعریف فروع کا شاخ و برگ، اور پھر اس گوہر بے بہا کو سلک شبہ میں منسلک کرنا، یعنی شعرا کی عداد میں معدود رکھنا اور یہ خیال نہ کرنا کہ شاعری کیا چیز ہے کہ ان مراتب بلند میں حساب کی جاوے۔ اگر چہ ان مدارج میں سے کمتر ہی شمار میں آوے۔ شناسائے سوانح نزدیک و دور اور دانائے حقائق امور کو خیالات محض اور وہمیات صرف سے وصف کرنا نقاشی نگارخانۂ ارژنگ کو نقش روئے آب اور مشاہدات ہنگامۂ بیداری کو تخیلات عالم خواب سمجھنا ہے۔ لیکن دانشمندان فہیم جانتے ہیں کہ جب خداوند مرتبہ شریف صنعت خسیس کو اختیار کرتا ہے، اگر چہ اس صنعت سے اس کے مدارج بلند کو گونہ تنزل حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اس کی بلندی مراتب سے اس صنعت کا سر آسمان سے ٹکر کھاتا ہے۔ ہر چند نسبت شاعری سے ان کو ننگ و عار ہے، لیکن شاعری کو ان کے ساتھ منسوب ہونا پایۂ اعتبار اور مایۂ افتخار ہے۔

او اگر نام زد ننگ شد از ذلت شعر

شعر از عزت او نیک بر آمد ز ذلل

اس محل میں ایسی بلند منقبت کا ذکر کرنا بلندئی پایۂ سخن کا اظہار اور علو مرتبۂ شاعری کا اشتہار ہے۔ نہ اظہار شاعری سے ممدوح کا پایۂ اعتبار بڑھانا، یا فن سخن کے وسیلے سے اس کے مرتبۂ امتیاز کو آسمان پر پہنچانا۔ اگر شعر اس سے بلند مرتبہ نہ ہو جاتا شعرئ نسبت شعر سے آسمان بریں تک نہ پہنچتا اور اگر نظم اس سے آرایش نہ لیتا، عقد ثریا مناسبت نظم سے نثر کواکب میں آب وتاب نہ پاتا۔ جو کہ بیان اوصاف اور تبیین مدائح خامۂ خام رقم کی مجال سے خارج ہے، ناگزیر اشعار ریختہ وفارسی سے کچھ کچھ تیمنا تختۂ کاغذ پر مرتسم کرتا ہوں، کہ اس عالی درجات کے بلندئ مراتب پر اس کے سخن کا دلالت کرنا گویا اس کے اوصاف کو اسی کی زبان معجز بیان سے سماعت کرنا ہے۔

اشعار ریختہ

جمع طوفان و چشم تر مسرف
اب مصارف کا، کچھ حساب نہیں
دھو دیا سب کو دیدۂ تر نے
وہ نہیں درس، وہ کتاب نہیں
کاش مقبول ہو دعائے عدو
کیا کروں وہ بھی مستجاب نہیں
تیری آنکھوں کے دور میں، کیا کیا
سحر رسوا نہیں، خراب نہیں
اب تو اس چشم تر کا چرچا ہے
ذکر دریا نہیں، سحاب نہیں
مختصر حال چشم و دل، یہ ہے

اس کو آرام اس کو خواب نہیں

عشق بازی کا منہ چڑانا ہے
اب وہ موسم نہیں شباب نہیں

جوں سرا پائے یار آزردہ
تیرے دیواں کا انتخاب نہیں

گھر سے گھبرا کے، کھلے بالوں ہر اک کھٹکے پر
کیوں نکل آتے ہو دھوکے میں، جو بے تاب نہیں

پہلے آثار حیا بھی، نہ گئے تھے اتنے
جیسے آنکھوں میں تری اب اثر خواب نہیں

ہزار شیوے ہیں پنہاں کہ جی ہی جانے ہے
تری نگہ کا تغافل ہے اک جواب نہیں

نکلنا ہوا دل سے دشوار کیوں
یہ ہے آہ، کچھ اس کا پیکاں نہیں

اسی کی سی کہنے لگے اہل محشر
کہیں پرسش داد خواہاں نہیں

یہ ہاتھ اس کے دامن تلک پہنچے کب
رسائی جسے، تا گریباں نہیں

فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے سے طور
کہ اپنے کیے سے پشیماں نہیں

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں

آنکھوں سے دیکھ کر تجھے سب ماننا پڑا
کہتے تھے جو ہمیشہ چنیں ہے چناں نہیں

اس بزم میں نہیں کوئی آگاہ ورنہ کب
واں خندہ زیرِ لب، ادھر اشک نہاں نہیں

افسردہ دل نہ ہو، درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں

لب بند ہوں تو روزنِ سینہ کو کیا کروں
تھمتا تو مجھ سے نالۂ آتش عناں نہیں

مانا ترا یہ غیر سے ہو بہرِ مصلحت
ہم کو تو سادگی سے تری یہ گماں نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

بے وقت آئے دیر میں کیا شورشیں1 کریں
ہم پیرو پیر2 مے کدہ بھی نوجواں نہیں

کٹتی کسی طرح سے نہیں، یہ شبِ فراق
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

شب جوش گریہ تھا مجھے یاد شراب میں
تھا غرق میں تصور آتش سے آب میں
قسمت تو دیکھ کھولی گرہ کچھ تو رہ گئے
ناخن ہمارے ٹوٹ کے بند نقاب میں

ا۔نسخہ دوم میں شوروشین (ص۱۱۴)۔
۲۔نسخہ اول میں 'ہم پر' (ص۱۱۶) نسخہ دوم میں 'ہم پیر' صحیح (ص۱۱۴)۔

یارب یہ کس نے چہرے سے الٹا نقاب جو
سو رخنے اب نکلنے لگے آفتاب میں
میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں
تحقیق ہو تو جانو کہ میں کیا ہوں قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں
یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہد شباب میں

مبتذل دوست بنایا نہ اسے کیوں اول
جس نے اس شوخ کی نظروں میں کیا خوار مجھے
نہ اٹھی بیٹھ کے خاک اپنی ترے کوچے میں
ہم نہ یاں دوش ہوا کے بھی کبھی یار ہوئے
صبح لے آئینہ اس سج کو دکھایا ہم نے

رات اغیار سے ملنے کے جو انکار ہوئے
کچھ تعجب نہیں گر اب کے فلک ٹوٹ پڑے
آج نالے جو کوئی اور بھی دوچار ہوئے
کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے
مصر میں آج تجھے دیکھ کے پچھتاتے ہیں
سادہ لوحی سے جو یوسف کے خریدار ہوئے

پروانہ وار ہے حد پرواز شعلے تک
جلنے ہی کے لئے مجھے یہ بال و پر ملے
عالم خراب ہے نہ نکلنے سے آپ کے
نکلو تو دیکھو خاک میں کیا گھر کے گھر ملے
دل نے ملا دیں خاک میں سب وضع داریاں
جوں جوں رکے وہ ملنے سے ہم پیشتر ملے
باہم ملاپ تھا پہ ترے دور حسن میں
یہ رسم اٹھ گئی کہ بشر سے بشر ملے

اشعار فارسی

ساقی بہ لعل لب مددی کن کہ مے کم است
ناخوش شوی ز بیہشی ناتمام ما
شعلہ کاں طور بسوزید و بہ موسیٰ نگرفت
جوہر قابل من بیں کہ تن و جانم سوخت
ہیچ گہ چرخ جفا پیشہ نمی ساخت بمن

شکر ایزد کہ ز آہ شرر افشانم سوخت
بزم افروز شبستاں نشدم آں شمع

بخت خوابیدہ سر خاک شہیدانم سوخت
ہر نگہ کان بت ترسا بچہ درکارم کرد

آتشے بود کزو خرمن ایمانم سوخت
کو نسیمی کہ ز یثرب وزد و سبز کند

خاست از ہند سمومے کہ گلستانم سوخت
گر ز آتش سخنی ہیچ کمالم نہ فروخت

لیک آزردہ ازو جان حسودانم سوخت

بجز وصال تو دیگر امید نتواں داشت
اگر امید بہ بخشائش خداوند است

بگوش گل کہ رساند پیام بلبل زار
در آں حدیقہ کہ در بر رخ صبا بند است

بہ گونہ گونہ نزاکت قد تو جلوہ نما است
چوں آں دقیقہ کہ در خاطر ادا بند است

حسن کے راہ زن کافر و دیں دار نبود
آفت سبحہ بلائے بت و زنار نبود

'رب ارنی' ز لب ہستی من سر می زد
'لن ترانی' ادب آموز طلب گار نبود

عشق بے پردہ تماشائے جمالش می کرد

ہمچو بے خود ز مئے وعدۂ دیدار نبود
دست تا بند نقابس برساندم مردم
سعی خوش بود مگر بخت مدد گار نبود
صحبتے بود عجب دوش میان من و یار
صد شکایت بہ لب و رخصت اظہار نبود
گرد غم جز دل ناشاد محلے نہ گزید
ورنہ آئینۂ ما مائل زنگار نبود

در باغ جور تازہ کہ از باغباں رسد
اول بہ بلبلان کہن آشیان رسد
زاہد بیا و موت شہیدان عشق بیں
کیں مرگ را نہ زندگی جاوداں رسد
طوبیٰ لک' از ملائک رحمت رسد بگوش
ہر دم ندائے 'ارجعی' از آسماں رسد
غیرت نگر کہ لذت زخم خدنگ او
دل را قبول نیست کہ از دل بہ جاں رسد
اے دل خموش باش بہجراں کہ حکم نیست
تاثیر در قلمرو آہ و فغاں رسد

خواہم دم دعا بہ دعا تا گریستن
شد بس کہ بے اثر بہ دعا ہا گریستن
دل قطرہ قطرہ خوں شد و از چشم بر چکید

تاراج دادہ مشغلۂ ما گریستن
جز چون تو سنگ دل نتواند شد از دگر
نگریستن بحال من و نا گریستن
از اشک ریزیٔ مژہ خالی نہ شد دلم
خوہم چو زخم از ہمہ اجزا گریستن
موجے بزن کہ ترکنم ابر بہار را
اے دیدہ تا کجا بہ مدارا گریستن
یا رب نگاہ بوالہوسم دہ کہ شد مرا
در بزم او حجاب تماشا گریستن
ای دل بیا کہ خاک کنیم ابر و برق را
از تو بہ خوں طپیدن و از ما گریستن

آباد

آباد تخلص نوجوان یوسف جمال محمد یعقوب علی خلف محمد اسحاق خاں ساکن قدیم شاہجہان آباد کہ مصر حسن میں زلیخا منشان دل سوختہ کے نزدیک کوئی اس سے زیادہ عزیز نہیں۔ ہم صحبتان آوارہ مزاج کے اختلاط سے تحصیل کمال کی طرف قاطبۃً توجہ نہیں ہے۔ لیکن موزونیٔ طبیعت سے گاہ گاہ بطریق آمد نہ آورد کے شعر یا مصرع زبان سے نکل جاتا ہے۔ اس کے دو تین شعر ایک آشنا کی زبان سے مسموع ہوئے:

اس کی قامت کی یاد میں ہم نے
مصرع سرو انتخاب کیا
تو نے دریا میں اک نگاہ کے ساتھ
قطرۂ آب کو شراب کیا
ان خراباتیوں کی صحبت نے

تجھ کو آباد ! کیا خراب کیا

آتش

آتش تخلص ہے عاشق دل سوختۂ سخن خواجہ حیدر علی لکھنوی کا، طوطی خوش لہجۂ شکر ستان سخن اور بلبل رنگیں نوائے گلشن معنی تھا۔ مضامین شوخ اس کے الفاظ پاکیزہ میں متمکن، جیسے آئینے میں سیماب۔ اور معانی رنگین اس کی عبارت میں جاگزیں، جیسے مینا میں شراب۔ نکتہ ہائے برجستہ اور اشارات دور اور زبان پاکیزہ اور عبارت شستہ اور رنگینیٔ معنی اور شوخیٔ مضمون اور غرابت تشبیہ اور تازگی طرز، ایک بزم میں ہنگامہ آرا اور ایک منظر سے چہرہ کشا ہیں۔ بہ اعتبار تخلص کے آتش تھا۔ بہ اعتبار تواضع کے خاک، بہ اعتبار تن کے ست تھا، بہ اعتبار فکر کے چالاک۔ مشق سخن کو کہنہ کر دیا تھا اور طرز سخن کو جدید، طبیعت کو گنجینہ کیا تھا اور قلم کو کلید۔ دیوان فصاحت بنیان اس کا انواع سخن سے مملو ہے اور ہر سخن جان نوازی میں باد مسیحا اور آب حیات سے ہم پہلو۔ نقل ان اشعار کے اہل مذاق کی ضیافت طبع کے واسطے مایدۂ اوراق پر چنے جاتے:

بل نہ نکلا تری زلفوں کا صنم شانے سے
واقعی زور نہیں پنجۂ شل میں ہوتا

چھوڑتا میرے گریباں کو نہیں دست جنوں
کیا یہ اس کو کسی محبوب کا دامن سمجھا

خانۂ زنجیر سے مثل صدا اڑتا ہوں اب
یاد آتا ہے کف پا میں کھٹکنا خار کا

خم ندامت سے کیا محراب میں کعبے کی سر
گردن زاہد سے بوجھ اٹھا نہ جب زنار کا

آہ و نالے سے سوا چرچا خموشی کا ہوا

پاس رسوائی نے ہم کو اور رسوا کر دیا
سمجھتے تھے نہ ہم اتنا در انداز اے جنوں تجھ کو
گریباں سے تعلق ہو گیا موقوف دامن کا
سبک وضعوں کا احساں کھینچنا ہے داغ پیشانی
نشاں مٹتا ہی روئے زخم سے کب تار سوزن کا
مفسدے جو کہ ہوں اس چشم سیہ سے کم ہوں
فتنہ پردازی جسے کہتے ہیں فن ہے کس کا
درماں سے اور درد ہمارا ہوا دو چند
مرہم سے داغ سینے میں ناسور پڑ گیا
بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا
نہ جانتا تھا غضب ہے نگہ کا تیر اے دل
تجھی کو سامنے آفت رسیدہ ہونا تھا
آ کے سینے سے لبوں پر دم اٹکتا ہے عبث
ٹھیرنا اچھا نہیں جب ہو ارادہ دور کا
کیا اثر ہو مری آہوں سے بتوں کے دل میں
صدمہ کھینچے نہ رگ سنگ کبھی نشتر کا
غرور عشق زیادہ غرور حسن سے ہے
ادھر تو آنکھ پھری دم ادھر روانہ ہوا
سامنے ہوتی نہیں اس شمع رو کے اپنی آنکھ

اے صبا محفل سے پروانے کی خاکستر اٹھا
تشنۂ دیدار مجھ سا دوسرا کوئی نہیں
سب سے پہلے مجھ کو اے ہنگامہ شر اٹھا

حلاوت کچھ تو ہے جو دے کے اپنی جان شیریں کو
مزا چکھتے ہیں مردم جاں کنی کی تلخ کامی کا

بے حجابوں کا مگر شہر ہے اقلیم عدم
دیکھتا ہوں جسے ہوتا ہے وہ عریاں پیدا

فاتحہ پڑھنے کو آئے قبر آتش پر نہ یار
دو ہی دن میں پاس الفت اس قدر جاتا رہا

رواں رکھتا ہے خوں آنکھوں سے ہجر اک مہر تاباں کا
شفق آلودہ رہتا ہے ہلال اپنے گریباں کا

کون ہے جو تری دوری میں نہیں مرتا ہے
ایک گھر رہنے دے نہ گی شب ہجراں آباد

اے کماں کش! ہے کشش سے دل کی امید قوی
تیر پہلو سے مرے نکلے تو پیکاں چھوڑ کر

کوچے سے یار کے نہ صبا دور پھینک اسے
مدت کے بعد آئی ہے خاک اپنی راہ پر

مشتاق اہل مے کدہ ہیں یاں کرم کرے
ابر سیہ کا لطف نہیں خانقاہ پر

کوچۂ یار میں سائے کی طرح رہتا ہوں
در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

بہت خراب رہا مے کدے میں اے آتش

خدا پرست ہے چل خانۂ خدا کی طرف

سپرد کس کے مرے بعد ہو امانت عشق

اٹھائے کون یہ بار گراں نہیں معلوم

پسے دل اس کی چتون پر ہزاروں

موئے بے ساختہ پن پر ہزاروں

آشنا معنی سے صورت آشنا ہوتا نہیں

آئینہ دل کی طرح سے حق نما ہوتا نہیں

زہر کھاتے ہیں طلب گار شہادت قاتل

ہاتھ سے تیرے ترے بے سروپا جاتے ہیں

تھی آرزو کہ تجھے گل کے روبرو کرتے

ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا

زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

آذر

آذر تخلص، ذوالفقار علی خاں ابن حیات علی خاں ابن معتمد الدولہ احمد علی خاں ابن نواب یعقوب علی خاں جو شاہ ولی خاں وزیر احمد شاہ بادشاہ کے بھائی اور بادشاہ کی طرف سے شاہ جہاں آباد کے قلعہ دار تھے۔ ذوالفقار علی خاں موصوف شعر کی اصلاح مرزا اسد اللہ خاں غالب سے لیتا ہے جو کہ نوجوان وشوخ طبع ہے، بہ مقتضائے "الاسماء تنزل من السماء"، تخلص بھی مناسب مزاج کے واقع ہوا ہے۔ یہ چند شعر اس کے لکھے جاتے ہیں:

مرے ستانے نے کام اس سے اک جہاں کے لیے

جو میں نہ ہوں تو نہ ہو گردش آسماں کے لیے
شکر پہ واں زباں کٹتی ہے
شکوہ کرنے کی کیا مجال ہمیں
ہوئے ناخوش بتاں، دیکھا جو مجھ کو
خدنگ غمزہ نے گویا خطا کی

آرزو

آرزو تخلص، میرزا علاؤالدین عرف میرزا کالے خلف میرزا منور بخت ولد میرزا فیروز بخت ابن حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی نوراللہ مرقدہ، اگرچہ نومشق و کم گو ہیں، لیکن خوش فکر و تیز افہم ہیں۔ فن سخن میں استفادہ راقم ہیچمدان سے ہے۔ یہ چند شعر ان کے انتخاب ہو کر لکھے گئے:

چھلکے ہے آگ سے ہر دم یہ آسماں کیسا
چڑھا ہے زور پہ اب نالۂ و فغاں کیسا
صبا تو کیا، نفس صبح دے ہے مجھ کو اڑا
ہوا ہوں روز کے صدموں سے ناتواں کیسا
لگائیں ہاتھ بھی جھوٹوں تو یوں کہے بلبل
کہ آج لوٹے ہے گل چیں یہ گلستاں کیسا
نہ ان کو سننے کی طاقت نہ مجھ کو کہنے کی
سنے ہے کون، کہے کون اور بیاں کیسا
کسی کے حال کی مجھ کو خبر نہیں مطلق
تڑپ رہا ہے پڑا ایک نیم جاں کیسا
کرے ہے پند ہمیں پند گو خدا کی شان
کہاں کا آج ہمارا یہ غم گسار آیا

رو رو کے خون اس نے بھی حسرت نکال لی
عاشق کا تو نے خوں نہ بہایا تو کیا ہوا

۱۔نسخۂ اول 'تیر'، نسخۂ دوم 'تیز'۔

یہاں بے خودی ہے مانع نظارہ ہم نفسی
اس نے جمال اپنا دکھایا تو کیا ہوا
آزادگاں کو مانع وحشت نہیں ہے قید
زلفوں میں تم نے دل کو پھنسایا تو کیا
ہوا
ہے وہی غفلت اور وہی بے نیازیاں
احوال دل گر اس کو سنایا تو کیا ہوا
تری حاجت نہیں کچھ جانے نہ جانے کی کہ اب
تجھ سے آگے میں وہاں آپ صبا جاتا ہوں
آرزوے کی مجھے کیا ہے کہ ساقی ہر دم
ان نگاہوں سے ہی سرشار ہوا جاتا ہوں
نگاہوں کے ملاتے ہی نہ تھا گویا کہ سینے میں
عجب ہے دل کے لینے کا ہی ڈھب اس شوخ پرفن کو
آخر اس آہوئے رم خوردہ کو لایا ہی نہ کھینچ
میرے اس جذبۂ الفت کے اثر کو دیکھو
رہتا ہے غم سدا ترے اس مبتلا کے ساتھ
گویا کہ آشنا کو ہے ربط آشنا کے ساتھ

زاہد نہ توڑ بت کو کہ اس کا ہی ہے ظہور
کرتا ہے کیا معاملہ ناداں خدا کے ساتھ

اس پر بھی بد دماغ وہ ہوتے ہیں یا نصیب
ہر چند بات کہتے ہیں ہم التجا کے ساتھ

واں بے نیازیوں سے نہیں کچھ خیال بھی
ہم لب کو کس امید پہ کھولیں دعا کے ساتھ

اس کو لڑائیوں کا کہاں ضعف سے دماغ
کیجے نہ جنگ آرزوئے مبتلا کے ساتھ

محفل میں تو اعدا کو بلایا مرے آگے
اور باتیں بنانے لگے کیا کیا مرے آگے

آئینہ ہی لے بیٹھے ہے یہ چھیڑ تو دیکھو
محفل میں جب آتا ہے خود آرا مرے آگے

احباب جو کچھ حال مرا کہویں تو کہوے
لے بیٹھو ہو تم ذکر کہاں کا مرے آگے

ہے ایک بوسے پہ سودا ہمارے دل کا کہ ہم
لحاظ نفع و خیال ضرر نہیں رکھتے

روز یوں ہی وصل میں لازم ہے تم کو گفتگو
شوق بڑھتا ہے زیادہ آپ کی تکرار سے

بعد مرنے کے بھی اس کی ہے تمنا باقی
سر تو باقی نہیں اور ہے وہی سودا باقی

فارغ البال ہوئے تم مجھے دے کر بوسہ
ابھی سو طرح کا ہے آپ سے دعویٰ باقی

آرزو کو بھی نہ افسوس قضا نے چھوڑا
عاشقوں میں ترے اک یہ ہی رہا تھا باقی

آزاد

آزاد تخلص، مرزا اعظم شاہ پسر مرزا عادل ابن مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم، خوش فکر و ذکی الطبع شوق عمل تصوف نے ضمیر حقیقت تخمیر پر استیلا پایا ہے۔ جوان خوب صورت، وجیہ، رند مشرب، بے باک مزاج، آزاد وضع، گویا کہ اسم با مسمیٰ ہیں۔ یہ چند شعر ثمرۂ طبیعت معرفت کوش اس کے معرض بیان میں آئے:

گھبرائے گا کیا جی مرا تنگیٔ قفس سے
سو بار بھی کیا ہو کے گرفتار نہ آیا

وہ اور ہیں جن کی شب ہجراں کو سحر ہے
یاں شام ہوئی حشر کی، اور یار نہ آیا

ہم یہ سمجھے تھے چھپائے گا گنہ گاروں کو
پر بہت تنگ ہی محشر ترا داماں نکلا

آزاد کو مت پوچھو کیا اس کا ٹھکانا ہے
جس کوچے میں دن گذرا واں شب بھی رہا ہو گا

آزاد چپکا رہنا آٹھوں پہر برا ہے
پھٹ جائے گا کلیجا کچھ بات بھی کیا کر

عجب اعجاز ان آنکھوں نے دیکھا چشم قاتل میں
کہ اک تیر نگہ اور آ کے بیٹھے لاکھ کے دل میں

تمہارا جذبۂ الفت جو لے جائے تو لے جائے
وگرنہ کام کیا ہم بے خودوں کا روز محشر میں

وہ بن سنور کے ترا بیٹھنا وہ شرمانا
وہ دیکھ آئینہ کہنا کہ دیکھنا مجھ کو

۱۔ "سمجھتے" نسخہ اول (ص ۱۲۲) میں ہے جو غلط ہے "سمجھے" نسخہ دوم (ص ۱۲۰)

یہ تو کہیے کہ ملے گا مجھے مرقد میں تو چین
یا وہاں بھی ہے کوئی فتنہ اٹھانا باقی
یہاں آہ بھی لب تک آ نہ پہنچے
کیوں کر کرتے ہیں لوگ نالے
آزاد تیرے پاس نہ زر ہے نہ زور ہے
تجھ سے کوئی ملے تو کس امید پر ملے

آشفتہ

آشفتہ تخلص، گلاب سنگھ متوطن شاہ جہان آباد، قوم کھتری، عین آغاز شباب و عالم نو خاستگی میں شہید خنجر مژگان یار اور زخمی تیغ ابروے دل دار تھا۔ سینۂ سوزاں داغ عشق سے لبریز اور دل صد چاک زخم محبت سے گل خیز۔ وہ رخسار کہ موج نسیم کے لطمے سے ارغوان سے زعفران ہو جاتا تھا، یاسمن زرد ہو کر زخم ناخن کی سعی سے چاہتا تھا کہ عندلیب مزاجوں کی نظر میں پھر گل احمر اکے لباس میں جلوہ نما ہو۔ اور وہ آنکھ کہ خواب مستی میں طلب گاران سینۂ چاک کے حال سے غافل ہے، معشوق سست پیاں کے انتظار میں دیدۂ عشاق سے بے خواب تر ہو کر شکوہ گزاران تغافل کے سامنے حجاب سے نہ ہوتی کہ شاید طرز نیم خوابی اسی حیلے سے پیدا ہو۔ خار مژہ آب گریہ سے ایسا تر کہ نہ کسی سینے کے پار گذرتا اور نہ کسی دل میں خلش پیدا کرتا۔ نہ

شانے کو جبین زلف تک رسائی اور

ا۔ نسخہ اول (ص ۱۲۳) 'پھر گلی جمر'، نسخہ دوم میں 'ہر گل احمر'

نہ سرمے کو منظر چشم سے خود نمائی۔ ہر دم کے زلف سلجھانے میں کاہل کوشی اور ہر وقت کے سرمہ لگانے میں اغماض اور چشم پوشی۔ خرام ناز صحرا نوردیٔ وحشت سے بدل گیا اور رنگ عشرت دل میں خون ہو کر یک بار چشمۂ چشم سے ابل گیا۔ خم ابرو ہم وضع تسلیم شوخی رفتار، نقش قدم سے ہم صحبت و نعیم طبیعت یا د معشوق میں اشعار عاشقانہ سے لگنے لگی، اور آنکھ تصور جمال میں ہر بہانے سے لگنے لگی۔ زلف وبال ہو گئی اور خواب خیال۔ بعد اس ستم گاری و خنجر گذاری کے تطاول چرخ نے ایسا بے بس کر دیا کہ جب اور پر بس نہ چلا خنجر آبدار سے آپ اپنا سر کاٹ کر راہ دلدار میں نثار کر دیا۔ یہ ایک سانحۂ غریب ہے کہ قلم کی زبان اس کے بیان سے چاک ہوتی ہے ور طبیعت ناقل کی اس حکایت سے دردناک۔ ہر چند اس واقعے کو پچیس برس کے قریب گذرے لیکن دل ہائے اندوہ گین پر وہ غم آج تک تازہ ہے اور طبائع دردمند میں وہ الم بے اندازہ۔ شعر ریختہ میں گو کسی ماہر فن سے مشورہ نہ تھا، لیکن جودت فکر اور سلامت طبع سے چاشنی کلام راست مزہ تھی اور وضع معاملہ کی ایسی دل چسپ تھی کہ اگر اس کے اشعار کی بیاض عاشق مزاجوں کے سینے سے الگ نہ ہو تو کچھ عجب نہیں۔ جن دنوں میں غازی الدین خاں کے مدرسے میں کہ شہر کے دروازۂ اجمیری سے باہر واقع ہے، طالب علمان مدرسہ بزم مشاعرہ ترتیب دیتے تھے، راقم تذکرہ نے اس گل رخسار کو اسی مشاعرے میں دیکھا، اور اس عندلیب گفتار کو ان ہم نفسوں میں بولتے سنا۔ ان چند اشعار کی تحریر میں خامہ ہم نوائے نوحہ ماتم اور ہم آواز نالۂ غم ہے:

پوچھتے کیا ہو کہ شب آشفتہ کیوں کر مر گیا

اس میں کیا باقی رہا تھا بندہ پرور مر گیا

جان دی عاشق نے تیرے شب کو اک نالے کے ساتھ

آدمی تھا آخرش صدمے اٹھا کر مر گیا

ہے جدائی میں زبس آشفتہ جینے سے بہ تنگ

سن ہی لو گے اک نہ اک دن چھوڑ کر سر مر گیا

بچتا نہیں ہے جو کہ ہے بیمار عشق کا

یا رب نہ ہو کسی کو یہ آزار عشق کا

ترا شکوہ کبھو لب پر نہ آیا

پہ تجھ کو رحم اے کافر نہ آیا

نہ سوئے ہم شب وعدہ سحر تک

نہ آیا تو ہی ظالم پر نہ آیا

اسی غم نے رلایا ہم کو بھر عمر

کہ تجھ کو بولنا ہنس کر نہ آیا

نہ کر آشفتہ اتنا شکوہ ہر دم

نہ آئے وہ جفا جو گر نہ آیا

گو دعا کے ہی لیے ہو، ہےا خدا کا تو خیال

کیا بنے گی گر کبھی وہ بدگماں پا جائے گا

ا۔نسخہ ۲ (ص ۱۲۲)ہوئے۔

ہائے یہ غیروں سے کہنا اس کا رک رک کر کہ اب

مجھ کو مت چھیڑو کہیں آشفتہ یاں آ جائے گا

بالکل ہی اس نے کھول دیا سب پہ رازِ عشق
کم ظرف اپنے دیدۂ گریاں کو کیا کہوں

زلفوں سے بھی زیادہ کیا رخ نے دل پہ جور
کافر جو تھے سو تھے پہ مسلمان کو کیا کہوں

درد دکھ جو جہاں پڑا آتے ہیں
وہ مری ایک جاں پر آتے ہیں

اک نہ آنے سے تیرے اے ظالم
شکوے سو سو زباں پر آتے ہیں

ایک اس کے دیکھنے نے کر دیا عالم کو قتل
یہ تری ابرو ہے یا عید الضحیٰ کا چاند ہے

رکھا سر پاؤں پر اس کے تو بولا
کہ تو بھی بے سرو پا کس قدر ہے

دم کا مہماں ہے اور آشفتہ
بے خبر تجھ کو کچھ خبر بھی ہے

آشفتہ

آشفتہ تخلص، حکیم منور علی متوطن شاہجہان آباد۔ فن طب میں حکیم غلام حیدر خاں اور فن سخن میں مومن خاں مومن تخلص سے تلمذ رکھتے ہیں۔ طبیعت کی

۱۔ نسخہ ۲ (ص ۱۲۳) پہ

رسائی اور فکر کی استقامت اور ذہن کی تیزی احاطۂ بیان سے خارج ہے۔ یہ چند شعر

ان کے نتائج افکار ہیں:

اجل تو نے کی اکیا مجھے شرمندہ قاتل سے
تماشا تھا اسے میرے تڑپنے کی اذیت کا

ہم وحشیوں کا گھر ہے کہ لڑکوں کا کھیل ہے
دن میں ہزار بار بنا اور بگڑ گیا

کانٹا سا ہو گیا تھا مرا سوکھ کر بدن
لاشہ الجھ کے دامن قاتل میں رہ گیا

بہت روئے تو اپنی جان کھوئی
کسی کا ہم نے بتلاؤ لیا کیا

ایک بھی اس نے نہ لکھا مرے نامے کا جواب
آخر کار وہ مکتوب بنا کر بھیجا

غیر اچھا ہے یا برے ہیں ہم
اپنے دل ہی سے پوچھیے صاحب

سر پہ اور آنکھوں پہ ہے ناصح نصیحت آپ کی
پر کروں کیا دل پہ میرا کچھ نہیں ہے اختیار

نے قتل کا خیال انہیں اور نہ موت کو
قسمت میں کیا خدا مری مرنا لکھا نہیں

آبلہ پائی سے یہ رتبہ ہوا حاصل کہ بس
ہم زمیں کیا آسماں پر بھی قدم رکھتے نہیں

اللہ رے یاوریٔ طالع
ٹھکرا کے چلے وہ مرے سر کو

غش ہوں گے ہم آشفتہ تاب رخ جاناں سے

پوچھے گا قیامت میں بے ہوشوں سے کیا کوئی
ابھی دل ربائی کو کیا جانتا ہے
ستم کو وہ بد خو ادا جانتا ہے

سنا تھا ہم نے آشفتہ کو کوئی دم کا مہماں ہے
کئی دن ہو گئے اس کو نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے

....

آشفتہ

آشفتہ تخلص، امرناتھ پنڈت نوجوان وجیہ، خوش اخلاق، خوش فکر، اصلاح شعر کی تنویر سے لیتا ہے۔ بیشتر مشاعرے میں وارد ہو کر اپنے کلام سے مشتاقان سخن کو مسرور کیا ہے۔ یہ چند اشعار بطریق یادگار لکھے جاتے ہیں:

غیر ممکن ہے کہ چھوٹے اس سے اے آشفتہ دل
حلقۂ دام بلا حلقہ ہے زلف یار کا

نزع میں دیدار جاناں کا میسر ہو گیا
اپنا مرنا مجھ کو جینے کے برابر ہو گیا

کون سے روز رلایا نہ گم یار نے ہائے
کون سے روز مری چشم پہ داماں نہ ہوا

تن پہ جب پنجۂ وحشت نے نہ چھوڑا اک تار
تو دیا دشت جنوں نے مجھے داماں اپنا

ان دنوں تم جو ہر آشفتہ پریشاں خاطر
کس پہ ہوش آپ نے کھوئے ہیں کہاں دل آیا؟

بجلی میں بھری اس کی ہنسی کی ہے شرارت
اور ابر نمونہ ہے مرے دیدۂ تر کا

آشفتہ بزم یار میں ساقی بنا ہے غیر
کیوں کر پیوں کہ کرتی ہے ٹکڑے جگر شراب

کی ہو گی اس نے بادہ کشی بزم گیر میں
تلخی رہی جو میری زباں پر تمام رات

یاد آ گئی وہ جنبش ابرو تو کیا کہوں
رکھ لی گلے پہ رات کو بے اختیار تیغ

بھیج دو خاک پر شہیدوں کی
چھینکتے کیوں ہو فرش خواب کے پھول

درماں نہیں مریض محبت کا اے طبیب
اچھے نہ حشر تک کبھی ہوں گے دوا سے ہم

میرا بھی دل ہے زلف کو آہستہ کھولیے
زلفوں کی طرح دل بھی نہ جائے بکھر کہیں

جن کے باعث سب کی نظروں سے گرے
ان کے کچھ بھی ہم نے آئے دھیان میں

دیکھ کر ہوئے گا اس آفت جاں کو کیا حال
جس کے بد دیکھے ہی بے تاب ہوا جاتا ہوں

اگا بیٹھا حنا وعدے کی شب جاناں کف پا کو
جلاتی آتش غم ہے مرے دل کی تمنا کو

دل میں آشفتہ ہے بتوں کا خیال
لب پہ باتیں ہیں پارسائی کی

میں تو شکوہ نہیں کرتا ہوں غم فرقت کا
تم ہی کرتے ہو گلے مجھ سے مری جاں الٹے

کوئے جاناں دو قدم ہے ناتوانی دل نہ چھوڑ
گو قدم اٹھتا نہیں پر کچھ تو ہمت چاہیے

....

آشوب

آشوب تخلص، میر امداد علی خاندان سیادت سے تھا۔ لیکن عنایت سلطانی سے لقب خانی کا ان کے آباو اجداد میں اب تک چلا آتا ہے۔ خوش اخلاق، نیک طینت، دوست و دشمن کے ساتھ ایک وضع سے بسر کرنا ہم نے سوائے اس صاف ضمیر کے اور میں نہیں دیکھا۔ ابتدا سے انتہا تک اپنے سخن کو میر نظام الدین ممنون کی نظر اصلاح سے گذارنا اور استاد کی طرز پر اس طرح سے چلا کہ ان کے شعر پر استاد کے سخن کا اشتباہ ہوتا تھا۔ گویا دو منہ میں ایک زبان تھی۔ واقعے میں یہ ہے کہ مدد فکر بلند اور اعانت طبع رسا اور کمال استعداد علمی فراہم ہو کر اس سخن سنج کے کلام کو آسمان تک لے گئیں۔ یہ چند شعر اس کے مرقوم ہوتے ہیں:

گنہ کے بوجھ سے محشر تلک پہنچ نہ سکے
اسی میں پردہ رہا ہے گناہ گاروں کا

دل کو سمجھے تھے کہ اس بزم سے لے آئیں گے
ہائے اپنا بھی ہوا واں سے پھر آنا مشکل

عذر جفا کے کب تلک تم کرو ہم گلہ کریں
وصل کی رات کم رہی آؤ معاملہ کریں

پاس آلودگی دامن قاتل نہ گیا
کس قدر ذوق تپیدن سے پشیمان ہوں میں

دل کہیں، دیدہ کہیں، صبر کہیں، تاب کہیں
ہائے کتنا شب ہجراں میں پریشان ہوں میں

....

آصف

آصف تخلص، میرزا محمد باقر، شیرازی مولد۔ تجارت کے وسیلے سے ہندوستان کی آمد و رفت کا ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ جیسے کوئی گھر سے بازار جاتا ہو۔ مرد صاحب اخلاق و رنگین صحبت۔ اتفاق ورود بیشتر دارالخلافہ اکبرآباد میں ہوتا ہے۔ فارسی میں فکر شعر کرتا ہے۔ یہ دو شعر اس کے مسموع ہوئے:

صبح وصل ترا شب آمد و نیست
شام ہجر ترا سحر چہ علاج
با ہر کہ دل کشید ترا جام مے بکش
من می کشم زجام دل خویشتن صبوح

....

آغا

آغا تخلص، آغا مرزا، خلف مرزا ابراہیم شوکت، چالیس پینتالیس کا سن و سال اور مرد با اقبال ہے۔ سنا گیا کہ اصل میں باشندۂ شاہجہان آباد ہے لیکن بالفعل سواد کانپور اس کی

۱۔ نسخہ ۱ و ۲ میں 'گیا' ہے 'کیا' چاہئے؟

اقامت سے بہشت بریں پر نازاں ہے۔ یہ شعر اس کا مسموع ہوا:

کل اس تلک پہنچ تو گیا تھا پہ ہم دمو
کچھ مجھ کو چپ سی لگ گئی ایسی کہ کیا کہوں

....

آفی

آفی تخلص، نواب احمد یار خاں خلف الصدق نواب فلک جناب، زبدۂ روسائے عالی تبار، سلالۂ خاندان عز و وقار نواب محمد امیر خاں مرحوم والیٔ ٹونک، کہ یہ ملک بالفعل نواب مستطاب وزیر الدولہ بہادر مہین فرزند نواب مرحوم و برادر حقیقی اس بلند مرتبت کے زیر نگیں ہے۔ بس کہ جذبۂ الٰہی عناں گیر اور لطف رؤف مطلق دستگیر ہوا، محبت دنیائے دوں سے کنارہ کر کے خاطر کو یادِ حق میں مشغول اور طبیعت کو مرضیات ایزدی میں مصروف کیا۔ آزادانہ بسر کرتے ہیں اور بیشتر اوقات سیاحت و سفر، خصوصاً زیارت اولیا میں گزارتے ہیں۔ گاہ گاہ موزونیٔ طبیعت کے اقتضا سے شعر فارسی ان کے چشمۂ طبع سے تراوش کرتا ہے۔ یہ دو چار شعر ان کی زبان فصاحت بیان سے مسموع ہوئے:

بہ عشق روئے تو درباختم دل و جاں را
بکار زلف تو کردم متاع ایماں را

حیات کشتۂ تیغ تو گر دہند بخضر
خو روز چشمۂ فولاد آب حیواں را

گدائے کوچۂ جاں بخش گل رخاں آفی
بہ نیم جو نخرد قصر باغ رضواں را

بسے گذشت کہ از گل خبر نمی شنوم
دلے نماند مگر بلبل خوش الحاں را

....

آگاہ

آگاہ تخلص، سید محمد رضا معروف بہ احمد مرزا، مرد خوش مزاج، نیک نہاد۔ فن ریختہ گوئی کو مرزا اسد اللہ خاں غالب تخلص سے کسب کیا ہے۔ یہ چند شعر اس کے نتائج

افکار سے ہیں۔

ہجر کے ہاتھوں کچھ ایسا زیست سے بیزار تھا
غیر کے بدلے بھی کل مرنے پہ میں طیار تھا

کیوں نہ چلنے میں قیامت ہو ترے اے فتنہ جو
شور محشر سے زیادہ ہے تری رفتار کا

اسی کی یاد میں سب عمر ہم نے کاٹی ہائے
جسے خیال ہمارا نہ ایک بار آیا

گھر غیر کا ہو راہ میں یہ بھی مری قسمت
لایا تو اسے جذبہ محبت کا یہیں تھا

اس کے دامن کو نہ دے جنبش تو اے باد صبا
مجھ غبار ناتواں کی مفت بربادی نہ کر

کھینچ لا یار کو مرے گھر تک
کچھ اگر جذبہ اے محبت ہے

....

آہی

آہی تخلص، اشرف خاندان سیادت، امجد دودمان شرافت، کوکب سعد آمان علا، سرو بستان مجد و بہا، روشن ضمیر، صافی نہاد، صادق الوعد، راسخ الاتھاد، از ہمہ بر کنارہ باہمہ درمیان، جواد الدولہ سید احمد خاں کہ اول تو اپنی استعداد و استحقاق اور خلق کی دعائے نیم شبی و نالہ ہائے سحری کے ذریعے سے مسند فصل خصومات مردم شاہجہاں آباد یعنی عہدۂ منصفی پر حکام روزگار کی طرف سے متمکن ہو کر متظلمان عالم اور ستم رسیدگان جہاں کی دادوہی میں مصروف، اور تحصیل مثوبات اخروی میں مشغوف تھے، اور اب آنجور کے جذبے اور ضعفائے دور دست کی دعائے تہ دلی کی کشش سے

منصب صدر امینی سے ممتاز ہو کر شہر بجنور میں کہ حضرت شاہجہان آباد سے چار روزہ مسافت رکھتا ہے، آوازۂ عدل و داد کو گوش ملائک تک پہنچایا ہے۔ خامۂ دوزبان متحیر ہے کہ اوصاف متعددہ اور حماید بے شمار کس طرح ظرف کوچک الفاظ میں گنجائش پائے اور وہ گنج ثنا گاں کیوں کر کتاب کے حوصلۂ تنگ میں سمائے۔ ایک طرف بزرگی نسب اور شرافت حسب دامن گیر خیال ہے کہ اس گفتگو کے وسیلے سے فرق سخن کو آسمان تک پہنچائے، اور ایک جانب اصابت تدبیر اور رزانت رائے اور طینت نیک اور خیر خواہی خلق اور رضا جوئی خالق تقاضا کرتی ہے کہ ان سخنان راستی بیان کو زبان گفتگو سے آشنا کر کے غافلان دور دست کو محکمۂ انصاف اور دیوان احقاق حق کی راہ پر ڈال دے۔ کبھی تہذیب نفس اور حسن اخلاق اور خلوص محبت اور رسوک صداقت، چشمۂ وداد کی صفائی، مراسم اتحاد کی بے ریائی کہتی ہے کہ سوا اس حرف کے کچھ زبان پر نہ لائے، تا نومشقان مکتب محبت کو رہنمائی اور نو نیازان درس خانۂ عشق کو ہدایت ہو جائے، اور کبھی بے تکلفی کی طرز اور بے ساختگی کی وضع متقاضی ہے کہ اگر اس طرز و طور کو طراز بیان نہ بخشیے، آئینۂ اوصاف نگاری بے تمثال اور جلوۂ یار فروشی بے دیدار رہے گا۔ ارباب تکلف کو لباس نفاق سے معرا اور اہل انصاف کو عطر وفاق سے نافہ کشا کرنا اس تدبیر کے سوا ممکن نہیں۔ اور خامۂ بے چارہ کس کس کا بار اپنی گردن پہ لے اور اس زبان بریدہ سے کیا کہے؟ ان اوصاف سے قطع نظر جو کہ کمال مجسم اور فضل مشکل ہو، کیوں کر کوئی اس کے بیان محاسن سے عہدہ برا ہو؟ میں اس مجمع مفاخر کے ذکر نسب اور بیان حسب پر قناعت کرتا ہوں تا کہ بہ مقتضائے ماقل و دل اصل کا حسن خوبی فرع پر دلالت کرے۔ ہوشیار خرامان عرصۂ روزگار پر ظاہر ہے کہ آباؤ اجداد اس جلیل الشان کے عہد دولت مہد اکبری میں ہرات سے وارد ہندوستان ہوئے، اور اس اقلیم کے ملوک داد پیشہ اور خسروان انصاف اندیشہ کی قدر دانی اور آدم شناسی سے مناصب جلیلہ سے سرفراز رہے۔ بعض کو انتظام صوبۂ

کشمیراور بعض کو کار سیاسات صوبۂ بذر 1 کا مفوض ہوا۔ عالم گیر ثانی کی پیش گاہ سلطنت سے منصب ہزاری ذات و پانسو سوار اور خطاب جواد الدولہ جواد علی خاں ان کے جد امجد میر ہادی کو مرحمت ہوا۔ پھر ان کے والد ماجد سید محمد تقی خاں بہادر پر یہی منصب اور یہی خطاب مسلم رہا۔ جب اس سید عالی نسب نے

ا۔ نسخہ ا، اور ۲، میں 'سیاسات صوبۂ بذر' ہے شاید صوبۂ ہذا یا صوبۂ بیدر ہو؟ (فائق)

اس دار فانی سے رحلت کی تو خطاب موروثی نے اس مجمع محاسن کی طرف باز گشت کی۔ ان کے جد مادری نواب دبیر الدولہ، امین الملک، خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ پہلے سرکار انگریز سے توسل شائستہ رکھتے تھے، اور پیش گاہ گورنمنٹ ہند سے سفارت شاہ ایران پر معمور ہوئے، اور اپنے حسن تدبیر سے انگریز اور بادشاہ ایران میں عہود اور مواثیق کو دل خواہ استحکام دیا۔ انگریز کی طرف سے اس امر خطیر کے صلے میں ایک عہدۂ جلیلہ کے ساتھ نامزد ہوئے، یعنی مملکت 'اوا' میں پولیٹیکل اجنٹ ہو گئے۔ بعد مدت حضرت شاہ جہان آباد میں آئے اور بادشاہ جم جاہ اکبر شاہ ثانی کی نظر عنایت سے سرفراز ہو کر عہدۂ وزارت سے مشرف ہوئے۔ اس رفعت مکان علی الشان کے حق میں حکام زمانہ کی قدر شناسی اس پہلے اعتبار کے علاوہ اور راس افتخار پر مزید ہے۔ بعد اس کے خامۂ مقطوع اللسان لکھتا ہے کہ بعد سر انجام مہام خلایق کے اگر اوقات فرصت میں کچھ شغل ہے تو علوم شریفہ اور فنون لطیفہ کی طرف میل کرنا، اور غوامض و دقایق کی طرف توجہ فرمائی۔ ایک رسالہ ابطال حرکت زمین میں ایسا خوب لکھا ہے کہ اگر زمین موافق زعم اہل فرہنگ کے متحرک بھی ہو تو اس کی متانت براہین اور استحکام دلائل سے متحیر ہو کر نقش پا کی طرح حرکت سے باز رہے

گی۔ اور زمانہ سابق میں ایک کتاب زبان اردو میں شاہ جہان آباد اور یہاں کے نواحی کی عمارتوں کے حال میں لکھی ہے، مسمّی بہ "آثار الصنادید" اور مکانات عجیبہ اور عمارات غریبہ کے نقش مصور مانی کار کے قلم سے اس کے ہر صفحے پر منقوش ہیں۔ اب پھر ہمت عالی کی تحریک سے اطراف سواد شاہجہاں آباد کو از سر نو پے سپر کیا اور تحقیقات سابقہ پر ایسا کچھ زیادہ کر دیا کہ غالباً اب اس پر زیادتی متصور نہیں۔ یہ سبب ان اشغال جلیلہ اور امور نبیلہ کے مضامین خیالی اور وہمی کی طرف کم ملتفت ہوتے ہیں۔ لیکن جو کہ موزونی طبع ذاتی ہے، گاہ گاہ کسی تقریب حسن سے شعر گوئی کا اتفاق ہوتا ہے۔ یہ چند شعر زیب ترقیم کر کے گوش سامعین کو ممنون کرتا ہے:

شاہد رعنائے دہر زینت دیگر گرفت
دلبر زیبائے باغ چہرہ بزیور گرفت
تاک ز بالیدگی مے کدہ بنیاد کرد
ساقی ما از نشاط جام بکف در گرفت
ہم ز پے شاہداں حجلہ بر آراست باغ
ہم پئے سودائے مے غنچہ بکف زر گرفت
شب بہ فروزندگی طعنہ بہ نوروز زد
شام بہ تابندگی خردہ بہ خاور گرفت
آھی خستہ جگر گشت چو مداح شاہ
جایزہ را خامہ اش تاج ز عبہر گرفت
اختر نحسم نگر چو ز نحوست رہد
گر ز یکے عقدہ رست عقدۂ دیگر گرفت
جود تو وقف سخن، بذل تو صرف ہنر
ہر چہ کفت بر فشاند جملہ سخن ور گرفت

....

دل در خم گیسوئے پریشان تو پابند
جاں ہائے دو عالم ہمہ خواہان تو پابند
گر راز بجویند ز سر رشتۂ جاں ہا
موئے ز سر طرۂ پیچان تو پابند
طومار شفاعت چو دم حشر کشایند
حرفیست کہ از دفتر دیوان تو پابند
باشد بہ جمعیت خاطر بہ دم حشر
آناں کہ سر زلف پریشان تو پابند
خاکم چو بجویند بہ میدان قیامت
افتادہ بہر گوشۂ دامان تو پابند
سحرے کہ بود غیرت اعجاز مسیحا
رمزیست کہ در نرگس فتان تو پابند

....

آہی

آہی تخلص، میر عبدالرحمٰن پسر میر حسین تسکین، جوان متین، صاحب اخلاق حمیدہ واطوار پسندیدہ، وجاہت ظاہری کا بیان کروں یا خوبی ہائے معنوی کا ذکر زبان پر لاؤں۔ کمال ذہانت سے ہر فن کے ساتھ ایک مناسبت تام ہے۔ کتب درسیہ جناب استادی مولانا ومخدومنا مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ سے تمام وکمال پڑھیں ہیں اور فن معما کو نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جناب موصوف سے حاصل کیا۔ فہم اس فن کا جیسا اس صاحب ذکا کو دیکھا گیا، کم کسی کو ہوگا۔ گاہ گاہ فکر شعر بھی کرتا ہے۔ یہ شعر اس کے نتائج افکار سے ہیں:

ہے غلط دھوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر
شہر میں چاک کسی کا تو گریباں ہوتا

دیکھا تھا اگر اس کو ہم بزم رقیبوں سے
تو چاہیے تھا قاصد جیتا نہ پھرا ہوتا

تمہارے حسن میں گرمی نہیں ہے
اگر ہوئے تو وا بند قبا ہو

دل لیے جاتی ہیں حوریں نزع میں اے ہمدمو
سامنے رکھی مرے تصویر جاناں چاہیے

کھل گیا دروازۂ جنت بھی اپنی گور میں
پر دل وحشی یہ کہتا ہے بیاباں چاہیے

مژدہ اے شوق طپیدن خلق میں ہے آج دھوم
زہر میں خنجر کو وہ اپنے بجھا کر لے گئے

اٹھ کہیں ہے آمد آمد اس ستمگر کی وہاں
اہل محشر مجھ کو یہ مژدہ سنا کر لے گئے

واعظا خلد سے لا خانہ خمار میں رکھ
قدر واں مے کی ہے جس جا کوئی مے خوار ہے

کچھ تمہیں بھی خبر ہے آہی کی
لوگ کہتے ہیں مر گئے کب کے

سب کو خبر ہوئی مرے حال تباہ کی
اٹھ جائے گی جہان سے اب رسم چاہ کی

شکوہ کہاں کا کیسا گلہ جی نکل گیا
شرما کے یار نے جونہی نیچی نگاہ کی

....

الف مقصورہ

اثر

اثر تخلص، عبدالرزاق فرزند عبدالرحمان تمنا تخلص، نوجوان ذہین، خوش اخلاق۔ شاہجہان آباد میں بہت مدت تک استادی مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر رہ کر فن فارسی اور مدرسۂ سرکار انگریزی میں علام ریاضی کو تحصیل کیا۔ جو کہ نہایت موزوں طبع ہے، شعر اردو بہت لطف و پاکیزگی کے ساتھ کہتا ہے۔ یہ شعر اس کے اشعار سے انتخاب ہوئے:

پہلو میں درد، سینے میں چاک، اشک آنکھ میں
مجھ سے تو کہہ اثر کہ ترا دل لگا کہیں

ترا ہر ایک سے ملنا بت وفا دشمن
کرے گا دیکھیے کس کس سے آشنا مجھ کو

مجھے تو جلنے پہ بھی زندگی غنیمت ہے
فلک نے مثل چراغ اب بجھا دیا مجھ کو

ہوئی بدولت ضعف آہ سے بھی خاطر جمع
اثر پہ جس کے کچھ ایک اعتبار تھا مجھ کو

گر چال کا نام آتے ہی آتی ہے قیامت
مضموں تری رفتار کا باندھا نہ کریں گے

خواہش ہے میرے دست جنوں کو بہار کی
اور آرزو ہے آبلۂ پا کو خار کی

کیا جانتا تھا وہ کہ ستم کیا ہے جور کیا
باتیں یہ سب ہیں اس دل الفت شعار کی

وحشت تو دیکھیو کہ پس مرگ بھی مرے
جنگل میں اڑتی پھرتی ہے مٹی مزار کی

ہوں کامیاب لعل لب یار سے عدو
حسرت نہ نکلی آہ دل سوگوار کی

تم اور عیش و بادہ و اغیار ہم نشیں
ہم اور مصیبت آہ یہ شب ہائے تار کی

اے حضرت اثر کہیں عاشق ہیں آپ جو
یوں خاک اڑاتے پھرتے ہیں ہر کوہسار کی

میں اور یار، اور شب ماہتاب ہے
یا رب مجھے خیال ہے یہ، یا کہ خواب ہے

اے چشم اس کے سامنے رو کر نہ ہو سبک
انساں کی آبرو جو ہے موتی کی آب ہے

پامال غیر ہے مری نعش اس گلی میں آج
مر کر بھی خاک پر مری کیا کیا عذاب ہے

سوزش سے حشر تک وہ زمیں ہو کبھی نہ سبز
جس جا ہمارے آبلۂ پاء کا آب ہے

عشق بتاں میں خاک بسر ہے تو اب اثر
دنیا خراب اور ترا دیں بھی خراب ہے

ایک دن فاتحہ پڑھتا تھا کسی قبر پہ وہ
حیلہ ایک اور بھی باقی ہے سو مر دیکھیں گے

....

احسان

احسان تخلص، زبدۂ کملائے روزگار، اسوۂ نتائج قرون و ادوار، بانی بنائے سخن وری، گلشن پیرائے حدیقۂ معنی پروری، طرازو سادۂ کمال، زیب مسند جلال و جمال، مسند الیہ فضل و افضال، جامع مراتب تکمیل و اکمال، مصدر علم و معدن حلم، حامی افاضل زماں، معاذ پناہندگان جہاں مرجع مآرب طلاب ہر فن، مآب کشور خدایان سخن عیار افزائے نقد ہنر، عیار گیر معنی پروران سخن گستر، استاد سلاطین زمان، شاگرد حضرت رحمان حافظ عبدالرحمن خان خلف مقبول انام، قدوۂ عظام، استاد و مختار سرکار مرشد زادۂ آفاق، صاحب عالم مرزا فرخندہ بخت بہادر مرحوم ابن حضرت شاہ عالم بادشاہ مہرور حافظ غلام رسول مغفور۔ اس جناب فیض مآب کے اخلاق پسندیدہ احاطۂ تقریر سے بیروں اور اوصاف حمیدہ حوصلۂ تحریر سے افزوں ہیں۔ اگر علم و فضل کی توصیف زبان پر آئے، اس آفتاب سے ایک ذرہ اور اس کتاب سے ایک حرف حوصلۂ گفتگو میں نہ سمائے۔ ہر چند کلام قدما کی مزاولت سے صنایع لفظی کی طرف اکثر عنان توجہ اور طبیعت فیض طویت ایسے امور غرابت دستور کی جانب نہایت مالوف تھی، اور ارباب ذوق جانتے ہیں کہ اس طرح کی قیود صفائی کلام اور آمد سخن سے مانع اور ایائی سیاق اور روانی عبارت سے عائق ہوتی ہیں، لیکن اہل انصاف کہ طبیعت کو جوں آئینہ صاف اور ضمیر آفتاب تنویر کو بے انکساف رکھتے ہیں، بے شائبہ تکلف فرمائیں گے کہ اتنی تکلیف پر سخن کتنا بے تکلف تھا۔ اور با ہمہ پابندئ الفاظ معنی کی تلاش ایسی تھی کہ گلشن قدس کا چمن ان کے فکر کی دست درازی سے گل و بار سے ایسا خالی ہو گیا تھا کہ عالم کے گل چینان سخن کو سوائے چند برگ سبز کے کہ اس سیار چمن زار معنی کے قابل التفات نہ تھے، کچھ ہاتھ نہ لگتا تھا۔ اور بلندئ کلام کا یہ حال تھا کہ اگر سقف آسمان اسی قدر اور مرتفع ہوتی، اس والئ اقلیم ہنر کی بام سخن کا طرہ خوف مزاحمت سے خاطر خواہ بلند نہ ہو سکتا۔ انواع سخن میں ایسی قدرت کہ جس صنف کلام پر نظر پڑتی ہے، یہ ہی خیال میں آتا ہے کہ یہ صاحب کمال اپنے فن میں یگانہ اور اسی

طرز میں یکتائے زمانہ تھا۔ غزل میں اگر اشعار عاشقانہ ہیں، گویا عشاق جگر فگار کی آہ کا دخان ہیں کہ بے اختیار دیدۂ بے درد کو بھی نم ناک کر دیتے ہیں، اور اگر ابیات عارفانہ ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ روشن ضمیر ان صاف طینت کے دل کا سویدا ہیں کہ اسرار خفی اور انوار جلی رازدانان معنی کی نگاہ میں ان سے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ قصیدے میں اگر تشبیب ہے، طرز توطیہ اور انداز تخلیص اعجاز گوینده پر دلالت کرتی ہے، اور اگر مدح ہے، شوکت الفاظ اور طمطراق معنی سے رتبۂ ممدوح کو آسمان سے ہم رفعت کرتی ہے۔ طرز سخن بے نظیر اور انداز کلام دل پزیر۔ بیت بیت ابرو سے جانفزا تر، مصرع مصرع زلف سے دل ربا تر۔ کمال مہارت عروض سے دریافت کیا کہ مصرع زلف خوباں بحر طویل میں موزوں ہے، اور نہایت روشن سوادی سے معلوم فرمایا کہ بیاض گردن محبوباں اشعار باریک سے مشحون ہے۔ تعمق فکر سے صفحۂ سادۂ رخسار پر خط نانوشتہ کا مضمون ظاہر اور طبعی ذہن سے لوح پیشانی پر بیت ابرو کے معنی باہر۔ مذاق سخن فہمی لذائذ معنوی سے محظوظ اور صندوق سینہ جامعیت علوم سے لوح محفوظ۔ اجتماع بلندی مدارج معنوی اور ارتفاع معارج صوری، یعنی والائے تبار اور علو مراتب کمال اور فخر استادی سلاطین صاحب اقبال اس سرگروہ ارباب ہنر کی ذات میں منحصر ہے۔ حضرت شاہ عالم بادشاہ اور حضرت معین الدین اکبر شاہ بادشاہ نور اللہ مضجعہما سے لے کر حضرت خلافت پناہ سلطنت دست گاہ محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ تک ادب استادی سے روز و شب ان کی تعظیم و توقیر کے سر رشتہ کو ہاتھ سے نہ دیتے تھے، اور مراعات حفظ مراتب میں فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ شاہ زادگان والا تبار اگر مرتبۂ ظاہری اپنے آبا کی بدولت پاتے تھے، مرتبۂ معنوی ان کے طفیل سے بہم پہنچاتے تھے۔ اور اگر ربع مسکون میں ناموری اپنے اجداد کی اعانت سے پیدا کرتے تھے، زمین سخن میں کوس نیک نامی ان کی امداد سے بلند صدا کرتے تھے۔ ہر چند بہ مقتضائے شاگرد پروری اور تلمیذ نوازی کے نگاہ

تربیت کسی سے دریغ نہ فرماتے، لیکن اس فحوا کے موافق "القلب یہدی الی القلب" از بس کہ آئینۂ عقیدت گرد کدورت سے پاک تھا، جس قدر نظر الطاف صابر سینہ صاف پر مصروف اور جتنی عنان اشفاق راقم اوراق کی طرف معطوف تھی، کم کسی کی جانب گمان میں آسکتی ہے۔ اور لطف اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ذرے کو آفتاب بنا دیا اور سر خاک کو آسمان پر پہنچا دیا۔ کور سواد کو روشن سواد کیا اور مغموم یاس کو حصول مقاصد سے شاد۔ جو اس کم بضاعت کا سرمایۂ استعداد ہے، اسی صاحب نصاب تونگر دل کی دولت سے ہے، اور جو ذرۂ بےتاب کو موجب نازش اور منشاء افتخار ہے، اسی آفتاب ضمیر کی وساطت سے ہے۔ سرو ہر چند موزونی ذاتی رکھتا ہو، باغبان کی شکر تربیت سے کیوں کر بجا لا سکتا ہے۔ ہر چند عرصہ کئی سال کا ہوا کہ وجود فیض آمود اس سرگروہ اہل سخن کا صفحۂ روزگار سے معنی نایاب ہو گیا، لیکن اس حلال مشکلات کا سخن اس ہیچ مدان کی طبیعت سے ویسا ہی عقدہ کشا ہے۔ جب وہ واقعۂ جان گزا اور نایبہ حسرت فزا یعنی سفر ناگزیر اس سیاح قیافی تقدس کا طالبان صداقت منش کی محرومی کا سبب اور مستفیدان عقیدت نہاد کی ناکامی کا باعث ہوا، توجہ باطنی کہ کم ترین تلامذہ کے باب میں اختصاص رکھتی تھی، پردۂ غیب میں جوش زن، اور وفور افاضات اور کثرت افادات کا بدرقہ لے کر اس ننگ دودمان کمال کی اعانت کی طرف متوجہ ہوئی۔ یعنی وہ فیض حسب اقتضائے مقام اس طرح سے گنجینہ کشا ہوا کہ نقد ہنر سکہ خانۂ استعداد میں تاریخ وفات حضرت افادت مرتبت مرحوم کے نقوش سے چہرہ آرا ہوا۔ اس تاریخ کی نقاب سے بارہ سو ستسٹھ سال ہجرت جلوہ گر اور بصیرت افزائے اہل ہنر ہے:

تنگنائے دہر جانی سے ہوں دل برداشتہ
ہے جنوں انگیز و حسرت خیز یہ وحشت سرا
رفتہ رفتہ ساکنان خاک ہیں گرم سفر

راہ چلنے میں نہ دن کا فکر نے ڈر رات کا

دانہ ہائے سبحہ کی مانند اجل کے ہاتھ سے

متصل ہے ایک کے پیچھے روانہ دوسرا

حضرت انساں کہ وہ تھے گلستان دہر میں

طوطی شکر مقال و عندلیب خوش نوا

قدوۂ ارباب فضل و اسوۂ اہل کمال

قبلۂ اصحاب علم و کعبۂ اہل صفا

معدن فرزانگی استاد شاہنشاہ عصر

عمدۂ ارکان دولت پیشوائے اصفیا

نسخۂ ارشاد و عرفان آیت لطف و کرم

معنی تلمیذ رحماں صورت جود و سخا

ہائے اس مصباح ظلمت سوز بزم دہر کو

صرصر جور اجل نے کس طرح گل کر دیا

اس کے مرنے سے جدھر دیکھو ادھر کس کس طرح

حسرت و اندوہ کا ہنگامہ برپا ہو گیا

عین ہنگا الم میں صابر دل گیر نے

اپنے دل کو تھام کر با صد غم و با صد بکا

کی رقم اس معدن احساں کی تاریخ وفات

دل 1 گیا بیٹھ آہ جب عالم سے احساں اوٹھ گیا

۱۲۶۷ھ

جو کہ استفادۂ صحبت اس زبدۂ اہل سخن کا چور فلک سے مفقود ہوا، ناچار اس قرطاس فیض اقتباس کو اس کے کلام تقدس انجام سے مزین کرتا ہے، تا کہ اہل خرد

اسی موائد فوائد اور فرائد عوائد سے کام ستان اور زینت پذیر ہوویں، اور انصاف پیشگان راستی گزین او رارباب بصیرت پر ہویدا ہو جائے کہ پاکی زبان اور تلاش معنی اور رشاقت اسلوب اور بلندیٔ کلام اور غرابت تشبیہ اور خوبی استعارہ اور دل چسپی عبارات اور دل ربائی اشارات یہی ہے، جو اس سخن سے جلوہ گر اور اس نظم میں پیش نظر ہے:

دل میں تیرا تھا تصور کہ وہیں آئے رقیب
لٹ گیا ہاتھ سے دیووں کے پرستاں میرا
موئے پہ کون ہے اپنا، مگر یہ سنگ مزار
برائے نام فقط اب سر مزار رہا
میں اپنے شیشۂ دل پر ہوں غش کہ جس میں مدام
ترے خیال سے پریوں کا ہے مدار رہا

۱۔ نسخہ دوم (ص ۱۳۲ مطبع نول کشور ۱۸۸۲ء) میں اعداد تاریخ ۱۲۶۸ھ لکھے ہیں، نسخہ اول میں نہیں لکھے ہیں۔ صابر نے لفظوں میں ۱۲۶۷ لکھے ہیں، غالباً آ ہ کے دو الف مان کر ۱۲۶۸ھ لکھے ہیں جو صحیح نہیں۔ ایک الف شمار ہوگا اور اوٹھ میں واؤ شمار کیا گیا ہے۔ (فائق)

کبھی شادی کبھی غم ہے یہی عالم ہے عالم کا
مہ عیدالضحیٰ گذرا تو چاند آیا محرم کا
کلیجا مجھ سے کانپے ہے سدا نار جہنم کا
کہ طوفان نیم قطرہ ہے سرشک چشم پرنم کا
اگر ہو اتفاق آپس میں، تنگی بھی گذر جائے

گذارا ایک پیرہن میں ہے بادام توام کا
ہم کو کفن اسی کا لازم ہے ماہ رویاں

الفت کا پر تو اسا، ہم نے کتاں میں دیکھا
تمہارے قد سے ہیں قائم قیامتیں کیا کیا

اٹھیں ہیں بیٹھے بٹھائے یہ آفتیں کیا کیا
پھرا عدم سے کوئی اب تلک نہ اکتا کر

خدا ہی جانے وہاں ہیں فراغتیں کیا کیا
گلے سے لگتے ہی جتنے گلے تھے بھول گئے

وگرنہ یاد تھیں ہم کو شکایتیں کیا کیا
جو ذکر کل کا کیا میں نے منہ چھپا کے کہا

تجھے بھی یاد ہیں احساں حکایتیں کیا کیا
بجھی جو شمع تو پروانوں پر ہوا روشن

کہ بعد مرگ کوئی آشنا نہیں رہتا
مجھ کو کہیے میں آنکھوں سے ضبط گریہ کروں

مرا قصور نہیں دل مرا نہیں رہتا
ہماری جان پہ گرتی ہے برق غم ظالم

تجھے تو سہل سا ہے شغل مسکرانے کا
ہماری چھاتی پہ پھرتا ہے سانپ سا احساں

وہاں ہے شغل اسے زلف کے بنانے کا
نام تیرا ہے ورنہ اے عنقا

ہے نشاں ہم سے بے نشانی کا
کل تک تو ترے کوچے میں احساں تھا مری جاں

پر آج جو ڈھونڈھا تو وہ بیمار نہ پایا
سخت نادانی کی احساں جو کہا عاشق ہوں
بھید کہتا ہے کسو سے کوئی دانا دل کا
آثار گر یہی ہیں ترے ظلم کے تو میں
سر کو پٹک پٹک پس دیوار جی چکا
احساں وہی نہ ہوئے کہ تیری گلی سے آہ
اک شخص خاک و خون میں لپٹا ابھی گیا
مرتے مرتے بھی نہ اک بار تجھے دیکھ لیا
اس قدر بھی نہ مری جان قضا نے چاہا
ہم کو نہ مدرسے ہی میں تجھ بن ضلال تھا
جب مے کدے میں آئے تو واں بھی کلال تھا
کل اپنے دوست دار سے تم تھے رکے ہوئے
کیا دل پہ دشمنوں کے تمہارے ملال تھا
مری برباد احساں آبرو کی
لگے آگ اس کو دل ہے خاک اپنا
پہنچ اے اجل کہ لب پر اٹکا ہے کام جاں کا
حامی ہے کون تجھ بن آفت رسیدگاں کا
یہ شام ہجر آئی، شامت زدہ کہاں سے
ہو روسیاہ ایسے ناخواندہ میہماں کا
پیک اجل ٹھہر جا چلتا ہوں میں بھی یعنی
پیغام خود سنوں گا یاران رفتگاں کا
دل بھر کے کبھو ہم کو مکھڑا نہ دکھا جانا

گر خواب میں بھی آنا ٹھوکر سے جگا جانا

سرو سے قمری پھرے ہے بگڑی بگڑی باغ میں

کیا شگوفہ تو گیا سروخراماں چھوڑ کر

نہ چھوڑ زوجۂ شیخ اب تو شیخ کا اخلاص

اگرچہ پیر ہے پر ہے مرید با اخلاص

گو مر چکا ہوں پر دل مضطر کے ہاتھ سے

میرے نصیب میں نہیں آرام اب تلک

احساں میں جس کے نام پہ دیتا ہوں اپنی جاں

وہ جانتا نہیں ہے مرا نام اب تلک

میں تڑپتا ہوں غم عشق بتاں میں احساں

حکما فضل الٰہی خفقاں کہتے ہیں

دو ہی دن کے عشق میں احساں یہ صورت بن گئی

منہ پہ وہ رونق نہیں چہرے پہ وہ لالی نہیں

کہیے کیا، کیوں طفل اشک اپنے گلے کے ہار ہیں

اس زمانے کے تو کچھ لڑکے بھی ناہموار ہیں

یہ شیشہ اور یہ گولی ہے آج اے ساقی

لڑھا دے تو بھی انہیں خم کو جو لڑھاتے ہیں

خفا مت ہو مجھ کو ٹھکانے بہت ہیں

مرا سر رہے آستانے بہت ہیں

بہت دور ہے اپنے نزدیک تو بھی

تجھے یاد کافر بہانے بہت ہیں

کشش دل کی ہی کام آتی ہے ورنہ

فسوں سیکڑوں ہیں فسانے بہت ہیں

پلائی مے رمضاں میں نہ مجھ کو اے ساقی
بڑے عذاب سے کٹتے ہیں یہ ثواب کے دن

کہتے ہیں پلٹ گیا وہ رہ سے
تقدیر الٹ گئی ہماری

کیا کام کسی سے ہم کو احساں
ہم اور یہ بے کسی ہماری

بیٹھ اے آہ! بس خدا نہ کرے
تجھ کو فرصت ہو سر اٹھانے کی

....

احمد

احمد تخلص، مولوی احمد علی نام، مدرس مدرسۂ فارسی شاہجہان آباد۔ ہر چند جمیع علوم میں دست گاہ تم ہے، لیکن فن طبابت میں ید طولی اور تشخیص امراض میں حدس صائب ایسی کہ بیمارئ نرگس کی علت اور سوسن کی گنگی، زبان کا سبب دریافت کرنا ایک کار سہل ہے۔ سوائے تکمیل مدارج علمی کے اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ اس طرح اس مجمع کمالات کی ذات میں فراہم ہیں کہ کتب اخلاق اگر تمام عالم سے محو ہو جاویں، اس کی گفتار و کردار سے ہر کتاب کے بدلے ایک اور کتب خانہ متن و شرح کا بہم ہوسکتا ہے۔ گاہ گاہ فکر شعر بھی دامن گیر ہے، یہ چند شعر لکھ کر نظر احباب سے گذرانتا ہے:

ساقی بیا با جام مے ایں لطف در جنت کجا
آں جا بہار دیگر و ایں جا بہار دیگر است

اختر امید از برج جلال آمد پدید

نیر اقبال بر اوج کمال آمد پدید
شکر ایزد را کہ نخل آرزو شد پر ثمر
کوکب تابندہ با جاہ و جلال آمد پدید

....

احمد

احمد تخلص، مرزا احمد بیگ عم زادۂ مرزا فاضل بیگ۔ مرد خوش خلق، نیک اطوار، عزایم خوانی و تسخیر اجنہ 1 میں مشہور اور زود اثری اعمال مین السنۂ خلایق پر مذکور ہے۔ اشعار ریختہ بھی کہتا ہے۔ یہ چند شعر اس کی بیاض سے مرقوم ہوئے:

اپنی اپنی گور سے سب دیکھتے ہیں سر اٹھا
اس خرام ناز سے کیا فتنۂ محشر اٹھا
پاؤں پھیلاتا ہے ہر محفل میں کیسا بے دھڑک
طفل اشک اے اہل الفت بے طرح ابتر اٹھا

1۔ جن۔ نسخہ۲ نول کشور (ص ۱۳۵)

کس کی مژگان کا الٰہی ہے مرے دل میں خیال
کہ کھٹکتا ہے مرے سینے میں اک خار نیا
ہوئے جو خاک اس کوچے میں تو یہ آبرو پائی
لگے سو بار قدموں سے لگے سو بار دامن سے
ہنگام نزع میں بھی ہمیں انتظار تھا
آتا ہے یا نہیں وہ ستم گار دیکھیے

....

احمد

احمد تخلص، مرزا احمد شاہ کہین برادر مرزا جمعیت شاہ ماہر۔ سعادت و اہلیت میں یگانہ اور مروت و دوست نوازی میں یکتائے زمانہ۔ یہ دو تین شعر اس نیک نہاد کے نتائج افکار سے ہیں:

بہائے بلبل بے دل کا جب لو صیاد
تو کیوں نہ سامنے گل کے ہو سرخ رو صیاد
کہو کہ کیوں کہ ہو اس سے نباہ کی صورت
کہ بد مزاج ہیں ہم اور تند خو صیاد
بچائے جان کدھر عندلیب زار اے گل
پھریں تلاش میں جب اس کی چار سو صیاد

....

احقر

احقر تخلص، قدوۂ ارباب سخن، زبدۂ کملائے فن، قادر الکلام، بلند مقام، ممدوح جوان وصبی، سید غلام نبی والد ماجد سید آل نبی اغر تخلص، علوم متداولہ میں مہارت تام اور دست گاہ تمام حاصل ہے۔ تحقیق فن فارسی اس صاحب کمال سے سر بہ آسماں ہے اور کمالات کسبی و وہبی میں زبان زد اہل جہاں۔ ہر چند قصداً اور بالذات شعر فارسی کی طرف توجہ اور التفات ہے، لیکن گاہ گاہ احباب صداقت کیش کی تکلیف اور تلامذۂ عقیدت اندیش کے اصرار سے اشعار ریختہ بھی کمال دل فریبی کے ساتھ اس کی طبع سے جلوہ گر اور ارباب مذاق سے ضیافت طبع کے واسطے مائدہ گستر ہوتے ہیں۔ یہ دو تین شعر یاد تھے:

نقاش نے قاتل کی جو تصویر کو کھینچا
ابرو کی جگہ پہ دم شمشیر کو کھینچا

جس وقت فاتحہ کو اٹھے دل ربا کے ہاتھ
ماتم سے شل ہوئے مرے اہل عزا کے ہاتھ

روز بازار جنوں ہے پوچھتے ہو حال کیا
کر دیا شہری غزالوں نے بیابانی مجھے

....

اختر

اختر تخلص، زبدۂ روسائے جہاں محمد صادق خاں، وطن آبائی اس بلند مرتبت کا خاک نزھت سرشت ھوگلی ہے، اور چندے حسن اتفاق سے سواد مینو بنیاد لکھنؤ میں تشریف رکھی۔ اب کہ عرصۂ دراز سے حکام وقت کی طرف سے عہدۂ تحصیل داری پر مامور ہیں، کسی نواح میں فراغ دل اور طیب عیش کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔ زبان قلم دشواریٔ اوصاف سے شق، اور رنگ کاغذ بے شماریٔ مدائح سے فق ہے۔ نہ ارتفاع مدارج کا بیان صورت پذیر ہے اور نہ گزیدگی اطوار اور پسندیدگی کردار کا حال قابل تحریر۔ "تخلقوا باخلاق اللہ" ان کے مصحف حال سے ایک آیت اور اہلیت ذاتی اور مروت جبلی ان کی کتاب اخلاق سے ایک حکایت۔ ہر چند علوم درسی سے دل خواہ بہرہ مند اور کامیاب ہیں لیکن فن سخن اور دقایق شعر سے ایسے ماہر ہیں، گویا کہ شخصی کمال کی تشریح میں جالینوس روزگار اور رمز شناسی و نکتہ دانی ہنر میں افلاطون وقت۔ زبان کس کس چیز کا بیان کرے؟ نہ برجستگی نکات اور شوخی اشارات اور خوبی عبارات اور حسن تشبیہ و استعارات کا حال بیان میں آ سکتا ہے اور نہ متانت تراکیب اور رشاقت اسالیب اور سلاست الفاظ اور رایانی سیاق اور ندرت معنی کا وصف تقریر میں سما سکتا ہے۔ راقم تذکرہ کو تالیف کے وقت یہی چند شعر دستیاب ہوئے ورنہ دفتر دفتر درج کتاب کرکے ارباب شوق و احباب صاحب ذوق کی ضیافت طبع اور مہمانی خاطر سے دست کش نہ ہوتا۔ جو کہ "مشتی نمونہ از خر منے" قبول اور دقیقہ سنجان روزگار کی

زبان پر مذکور ہے، ارباب فہم کے نزدیک ایک ذرہ دلیل آفتاب اور ایک نکتہ حجت کتاب ہوسکتا ہے:

کل بن کے شیخ مجتہد عصر ساقیا
دکھلا کے ایک باغ عذاب و ثواب کا
کہنے لگا ز راہ تبختر مجھے بہ طنز
معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کہیں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
کیجے نہ آپ مجھ کو جو مورد عتاب کا
تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا
مے ہو، کنج باغ ہو، ساقی ہو ماہ وش
اور واں کوئی مخل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حیا
دے ذائقہ زبان سے دہن کے لعاب کا
کھینچے ہنسی سے اپنا وہ منہ سے ملا کے منہ
یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیے
گر پی نہ جائے جلد پیالہ شراب کا
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر آپ خوف کیجیے روز حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شباب کا

....

نظر میں جلوہ گر عارض ہے کس خورشید تاباں کا
کہ ہے تار شعاع مہر ہر مو اپنی مژگاں کا
اگر ہے نام کی خواہش تو عنقا کی طرح رہیے
کہ ڈھونڈھے لاکھ کوئی پر نہ ظاہر ہو نشاں اپنا
سبک سار اس قدر رہیے جہاں میں بار ہستی سے
کہ دوش بوئے گل پر بھی نہ ہوئے تن گراں اپنا

....

خمیازہ کش نہ ہو لب جاناں شراب کا
محتاج کب ہے آب بقا آفتاب کا
دھیان ہے دل کی طرف اس کی نگاہ ناز کا
شور ہے صید حرم تک جس شکار انداز کا
دل مجھ کو ہائے بے کس و بے چارہ کر گیا
اپنی تلاش میں مجھے آوارہ کر گیا
بن تیرے مرا لب کبھی گویا نہیں ہوتا
بے موسم گل غنچہ کبھی وا نہیں ہوتا
مر کر فراق یار میں دل نام کر گیا
نا کام گو جہاں سے گیا کام کر گیا
کہیں اس عربدہ جو سے تو نہ بگڑی اختر
سر جھکائے ہوئے کیوں بیٹھے ہو مغموم سے آج

حباب آب جو میں عکس گل ہے یا مجھے ساقی
بلوریں جام میں دی ہے شراب ارغوانی بھر

نہ کیا دل کو ترے ناوک مژگاں سے عزیز
آگے ہمت کے مری کچھ نہیں مہماں سے عزیز

ہماری خاک کو پہنچائے یار کے در تک
اجل کیبعد ہے اتنی ہمیں صبا سے غرض

کبھی بھولے سے ادھر اس نے نہ کی راہ غلط
جذبۂ دل ہے دروغ اور اثر آہ غلط

جس گل کو آب چشم سے پالا سو اس کی اب
آنکھوں میں ہم کھٹکنے لگے مثل خار حیف

نمود شام خط روئے یار ہے نزدیک
طلوع صبح و وداع بہار ہے نزدیک

جام و صہبا کے تکلف سے مجھے رکھیے معاف
میں ازل سے کیفی چشم بتان سادہ ہوں

سبزۂ بے گانہ ہوں میں گرچہ طرف باغ میں
لیکن اے باد صبا تیرا ہی میں آوردہ ہون

مانا تو ایک بار نہ موقوف ہم سے کر
تا رفتہ رفتہ ہم تری ہجراں سے خو کریں

کشورِ عشق میں بے کار ہے اعجاز مسیح
لوگ یاں مرگ سے امید شفا رکھتے ہیں

جان دی ہم نے ہوئی تب غم ہجراں سے نجات
عقلا اس لیے کچھ چیز لگا رکھتے ہیں

لوگ جب سنتے ہیں قصے ترے دیوانوں کے
قیس و فرہاد کے افسانے اٹھا رکھتے ہیں

دیا بوسہ دہن کا اس نے ہمت اس کو کہتے ہیں
یہ تنگی اور یہ بخشش سخاوت اس کو کہتے ہیں

خرام ناز سے آسودگان خاک اٹھ بیٹھے
یہ چلنا کیا ہے آشوب قیامت اس کو کہتے ہیں

جگر سینہ و دل ٹھکانے بہت ہیں
ترے تیر کے یاں نشانے بہت ہیں

پس از قتل باقی ہے تشہیر ہونا
رہے جور ہم کو اٹھانے بہت ہیں

کسی نے کہا تم پہ مرتا ہے اختر
کہا اس نے ایسے دوانے بہت ہیں

سیر کیا یاں خاک ہے گل کی پریشانی کو دیکھ
بیٹھ کر ہم بھی کوئی دم مثل شبنم رو گئے

کیا تاسف سے تڑپتے ہیں اسیران چمن
کچھ جو اڑتی سی سنی ہے کہ بہار آئی ہے

....

اختر

اختر تخلص، مرزا وجیہ الدین بنایر مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم سے ہے۔ آٹھ نو برس کی عمر میں جدت ذہن اور تیزیٔ طبع کے آثار ناصیۂ حال سے عیاں ہیں۔ حداثت سن اور کمی عمر کے سبب حرکات اس کی دل ربا اور طرز گفتگو شیریں۔ سامعین اس کی طوطی کلامی اور بلبل گفتاری سے نہیں چاہتے کہ وہ نونہال ایک دم سخن سے

خاموش رہے۔ یک چند مرزا پیارے نام رفعت تخلص اور مرزا بلاقی بدر تخلص اس نو باوۂ گلشن عمر کے عم حقیقی کے اہتمام سے اسی نیک اختر کے والد ماجد کے دیوان خانے میں بزم مشاعرہ مرتب ہوتی تھی۔ کمال ذہانت اور تیزیٔ طبع اور رسائی فکر سے اکثر اوقات دو چار شعر موزوں کر کے حاضران بزم کے سامنے اس لطافت سے پڑھتے تھے کہ اس لطف نے ہر وضیع و شریف کو محو کر دیا تھا۔ یہ دو شعر مجھ کو یاد رہ گئے تھے، ناظرین کتاب کی ضیافت طبع کے واسطے مرقوم ہوتے ہیں:

یہ عمر اور عشق کا آزار دیکھنا
اور دل پہ پھر یہ صدمہ شب انتظار کا

واں اس نے بلایا ہے کہ تو رات کو آنا
یاں دن کو نکلنا بھی میسر نہیں ہوتا

....

ارشاد

ارشاد تخلص۔ درویش صاف طینت، پاک نہاد مولوی۔ محمد ارشاد حضرت شاہ سلیمان علیہ الرحمۃ و الرضوان کے مریدان با اخلاص اور طالبان با اختصاص سے تھے۔ اوائل حال میں بعد شرف بیعت کے ایسا جذبہ الٰہی دامن گیر ہوا کہ بیش تر اپنی زبان کرامت تبیان سے بیان کیا کہ میں دیکھتا ہوں کہ دل کاغذ باد کی طرح سے اڑا جاتا ہے، اور یہ تو اکثر معتبرین کی زبانی مسموع ہوا کہ جو لوگ روز و شب خدمت میں حاضر رہتے تھے، بعض وقت ان کو ہرگز نہیں پہچانا۔ اور مدت تک یہ حال رہا کہ اصطلاحات علوم سے اگر کوئی لفظ کسی کی زبان پر آ جاتا، وہ صاحب معنی مطلقاً نہ سمجھتا۔ باوجود اس کے کہ کتب درسی کے مطالب بہت تدقیق کے ساتھ حاضر تھے، اسی حال میں حضرت مغفرت مآب سے اجازت لے کر مکہ معظمہ کو تشریف لے گئے اور حج کرنے کے بعد مصداق لولاک، علت غائی ایجاد افلاک، سرور عالم صلی اللہ

علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ کے روز و شب ملازم رہے۔ اسی اثنا میں ایک روز ہوش رفتہ پھر آ گیا اور علم سب حاضر ہو گیا۔ اکثروں نے علم حدیث ان کی خدمت میں پڑھا اور اسی خاک پاک میں بعد وفات کے مدفون ہوئے۔ مرزا کریم اللہ نے کہ مرد باخدا تھے، جب سفر حجاز سے معاودت کر کے وارد شاہجہان آباد ہوئے، راقم سے یہ قصہ مفصل بیان کیا۔ اشعار فارسی و عربی و ریختہ اس قابل نہ تھا کہ درج تذکرہ کیا جائے۔ ایک دو شعر فارسی مرقوم ہوتے ہیں کہ ان بزرگوں کا کلام اگرچہ لفظ پرستان معنی ناشناس کی نظر میں قابل التفات نہ ہوگا، لیکن ارباب معنی کے واسطے ایک تحفہ ہے عجیب اور رامغانی ہے غریب۔

دامن آلودہ میروی زنہار
پاک کن دل زگرد ہستی ہا
مگذر از راہ ایں جہاں غافل
ہوشیار یست بہ ز مستی ہا

....

اسرار

اسرار تخلص، حقیقت اندیش، معرفت کیش مرزا سپہر شکوہ، ابن مرزا طہماسپ ابن مرزا سلیمان شکوہ مرحوم۔ ساری عمر تلاش فقرائے باب اللہ میں صرف کی اور زندگی اپنی اولیائے کبار کی صحبت میں بسر کی۔ راقم آثم کے خسر تھے۔ اب چند روز ہوئے کہ پردہ دوئی کا اٹھا کر شاہد وحدت سے ہم آغوش ہوئے۔ مزار پر انوار اس حق پژوہ کا آں سوئے دریائے جمن شاہ بڑے کے تکیے میں واقع ہے۔ یہ دو شعر اس کاشف استاد کے زیب تذکرہ ہوتے ہیں:

وہ جب ہنستے ہیں میں کہتا ہوں یارب
یہ بجلی دیکھیے گرتی کہاں ہے

پھر محو خیال رخ جانانہ ہوا ہے
پھر شیشۂ دل اب تو پری خانہ ہوا ہے

....

اسیر

اسیر تخلص، سر کردۂ 1 نوجوانان یوسف لقا، میر مکرم علی ابن میر کرم علی ساکن بریلی۔ عرصہ دراز ہوا کہ خاک شاہجہان آباد اس کے پدر بزرگ وار کے یمن قدم سے وادیٔ قدس کا حکم رکھتی ہے۔ گاہ گاہ شعر کوش ترکیب اس کی طبع موزوں سے سرمایۂ نشاط سامعین ہوتا ہے۔ یہ شعر اتفاقاً اس کی زبان سے مسموع ہوا:

یہ بھی کوئی ادا ہے کہ سو شوخیوں کے ساتھ
باتیں ہیں ہم سے اور نظر اغیار کی طرف

....

اسیر

اسیر تخلص، سید نہال نبی برادر خرد سید آل نبی لاغر، تحصیل فن فارسی اور مشق سخن اپنے برادر حقیقی سے کی ہے۔ طبیعت شوخ اور ذہن رسا اور سخن متانت آگیں ہے۔ کئی

۱۔ نسخہ دوم (نول کشور ۱۸۸۲ء، ص ۱۳۹) سر گروہ۔

بار مشاعرے میں آ کر سخن سرا ہوا ہے۔ یہ چند شعر اس کے نتائج افکار سے مرقوم ہوئے:

نہ ملے گا جو کوئی ڈھونڈے گا
بے وفا تم سا، باوفا ہم سا

گر مرے خوں کا پیاسا وہ نہ تھا اے مجنوں
خار صحرا مرے دامن سے الجھتا کیوں تھا

ہچکیاں بے وقت آتی ہیں اسیر
وقت مردن میں کسے یاد آ گیا

گو بہار آئی چمن میں پر مجھے کیا اے اسیر
میں ہوں اور نظارہ اس کی روزن دیوار کا

جواب نامہ نہ لکھنے سے یہ ہوا ثابت
ارادہ رکھتے ہیں شاید وہ آپ آنے کا

خوں انہیں ہاتھوں سے کتنوں کا ہوا میرے بعد
رنگ لائی ترے ہاتھوں کی حنا میرے بعد

روز کے وعدوں میں مر جائیں گے ہم
یوں ہی گذری تو گذر جائیں گے ہم

آج جامے سے جو باہر ہے اسیر
اس کے ملنے کی سنائی کس نے

خط غیر کا اس شوخ کو آیا مرے آگے
آیا مری تقدیر کا لکھا مرے آگے

بہتر نہیں کسی سے یہ ہر دم کی چھیڑ چھاڑ
کہتے نہ تھے اسیر وہ آخر بگڑ گئے

قاصد ڈرتا ہے، مانگتے خط
ایسا نہ ہو وہ جواب دے دے

....

اسیر

اسیر تخلص، گلزار علی پسر نظیر اکبر آبادی۔ موزونی کو موروثی جان کر فکر سخن کی طرف بہت متوجہ ہے لیکن باپ کے مرتبے کو اب تک نہیں پہنچا۔ یہ چند شعر اس کے مرقوم ہوتے ہیں:

بزم میں سوز و گداز اپنے سے فرصت نہ ملی
شمع کو روتے نہ پروانے کو جلتے دیکھا

خط کبوتر کو دیا لاکھ طرح کے ہیں خیال
خاطر وسوسہ پرواز کا دیوانہ ہوں

طائر رنگ حنا ہاتھ سے اڑ جاتا ہے
مرغ بے پر کی بھی پرواز کا دیوانہ ہوں

ایک میں ہی نہیں زخمی ابروئے ستم گار
خورشید بھی تر خون میں نکلا ہے سحر کو

بے دل کہ جلے سوز سخن میں نہیں ہوتا
خوش بو کے لیے آگ پہ رکھتے ہیں اگر کو

ہو تن سے جدا منزل مقصود کو پہنچے
بے منت پا منزل مقصود کو پہنچے

خدا کو یاد کر اور جام بھر کے لا ساقی
غم زمانہ فراموش ہو تو اچھا ہے

کیوں قناعت نہ کروں چشم گہر بار پہ میں
کشتی در مجھے لب ریز خدا نے دی ہے

کڑوے ہونے میں بھی شیریں دہنوں کے ہے مزا
ان کو تلخی شکر آمیز خدا نے دی ہے

کیا رکھ کے اپنی آنکھوں پہ روؤں میں اے جنوں

دامن میں اپنے دھجی، نہ تار آستیں میں ہے
لاکھوں ہیں زخم پر لب ہر زخم ہے خموش
اتنی دھن پہ بے سخنی ہو تو سیر ہے

....

اشکی

اشکی تخلص، جگت نرائن کشمیری، ثروت ظاہری اور دست گاہ معنوی سے کامیاب تھا۔ تیس برس تک حکام وقت کی قدر دانی سے عہدۂ تحصیل داری پر مامور اور ہوشیاری اور کارگذاری میں مشہور رہا۔ امانت کے ساتھ موصوف اور دیانت میں معروف تھا۔ اشعار فارسی متانت اور فصاحت کے ساتھ کہتا تھا۔ قریب پانچ سال کے ہوئے کہ جہان فانی سے رحلت کی۔ یہ چند شعر بہ طریق یادگار مرقوم ہوئے:

بلبل نہ کند میل بہ گل گر بدن این است
خون در جگر غنچہ فتد گر دہن این است
آمد بسر نعشم و از روئے تجاہل
پرسیدز کس اشکی خونیں کفن این است؟
روز محشر ہمہ نالند بہ پیش حق و من
دامنت گیرم وہم پیش تو فریاد کنم
وعدہ کردی و زرفتی سوئے اشکی اکنوں
باز فرما چہ بگویم کہ دلش شاد کنم
دلم برد از کف بت کج ادائے
بیک گردش نرگس سرمہ سائے

....

اشکی

اشکی تخلص، مرزا غلام محی الدین نام عرف مرزا ممن خلف مرزا غلام حیدر مغفور نواسۂ شاہ عالم بادشاہ، اوایل میں فخر الشعرا میر نظام الدین ممنون غفر اللہ لہ سے مشورہ کرتے تھے اور اب مفتی محمد صدر الدین خان بہادر صدر الصدور دار الخلافہ شاہجہان آباد سے استفادہ کرتے ہیں۔ فکر خوش، طبع رسا، ذہن سلیم، اطوار حمیدہ، عادات پسندیدہ ایک ذات میں جمع ہیں۔ یہ اشعار اتفاقاً دست یاب ہوئے تھے کہ مرقوم ہوتے ہیں:

کب دل سے چھٹے عشق تری زلف دوتا کا
دام ازلی وہ، یہ گرفتار سدا کا

کیا پاس کسی کا ہے کہ مرتا ہوں و لیکن
شکوہ نہیں کرتا شب ہجراں کی جفا کا

قسمت کو تو دیکھو کہ پھرا نامہ بر اس دم
جس وقت مرے سر پہ تقاضا ہے قضا کا

آئے تو نہ دشمن کے خطر سے مرے آگے
اور مفت میں بدنام کیا نام حنا کا

کچھ وجد نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف
کافی ہے یہاں نالۂ بے ربط درا کا

سجدے میں گرے دیکھ کے تصویر بت اشکی
معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

....

اشرف

اشرف تخلص، نواب اشرف حسین خان نواب زادۂ شہر الہ آباد، بالفعل انقلاب روزگار سے محکمۂ عدالت دیوانی بنارس میں عہدۂ نظارت پر مامور ہے۔ عزّ و توقیر اس

والا تبار کی ابنائے دہر میں ایسی ہے جیسے آفتاب کی شان خیل کواکب میں۔ مشورہ سخن کا مہدی حسین خاں تصدیق تخلص سے کرتا ہے، لیکن طرز سخن سے ہنوز نومشقی نمایاں ہے۔ یہ دو شعر ریختہ اور تین فارسی کے اس کے سخن سے منتخب ہوئے:

تھمتا نہیں ہے اشک مری چشم زار کا
مشکل ہے ٹوٹنا مرے اشکوں کے تار کا

ہے چرخ پر کبھی تو کبھی کوہ و دشت میں
اک جا نہیں مقام ہمارے غبار کا

....

بر امید وصل مہ رویان عالم تا سحر
داغ دل شمعیت اشرف در شب ہجران ما

تا دست من بدامن جاناں نمی رسد
درد شب فراق بہ درماں نمی رسد

پاسخ نمی رسد چوں ز یاران رفتہ باز
افغان ما بشہر خموشاں نمی رسد

....

افضل

افضل تخلص، بخشی فیض علی خاں پدر عالی مقام اس کا حکیم وارث علی خاں روسائے شہر اکبر آباد سے تھا، اور اخلاق اس ستودہ کردار کے حد بیان سے خارج ہیں۔ اوائل حال میں کسی سرکار میں عہدۂ بخشی گری پر مامور تھا، مگر اب عدالت دیوانی حکام آگرہ میں عہدۂ وکالت رکھتا ہے۔ یہ شعر اس کا مسموع ہوا:

تا نرگس جادوے تو دنبالہ کشید است
در دیدۂ آہوے حرم تیر خلید است

....

اکرام

اکرام تخلص، حکیم اکرام اللہ خان خلف الصدق حکیم ھدایت اللہ خاں۔ قدیم سے شاہجہان آباد میں متوطن اور مسجد جامع کے جوار میں ساکن ہے۔ تحصیل علم طب وغیرہ مولوی سعادت اللہ اپنے عم حقیقی سے کی ہے۔ یہ دو شعر اس صاحب طبع کے درج تذکرہ ہوئے:

میرے رنج دل کو تم ہر گز نہ پوچھو، دیکھ لو
جائے آنسوں کی رواں خون جگر ہونے لگا
آرزو وصل کی مٹانی تھی
کیا ہوا گر مٹا دیا دل کو

....

امانت

امانت تخلص، میر امانت علی خلف میر کرامت علی ناگوری۔ اوائل میں سواران رسالہ سکندر صاحب میں منسلک تھا۔ جب اس انگریز نے وفات پائی وہ بھی ترک روزگار کر کے خانہ نشین ہوا۔ بعد چند روز کے کسی اور نا گریز کی رفاقت میں اجمیر کی طرف راہی ہوا اور پھر کسی تقریب سے راجا جے پور کی سرکار میں روزگار معقول کے حصول سے کامیاب ہوا، اور وہیں نقد زندگانی کو محصلان قجا و قدر کے سپرد کیا۔ یہ چند شعر اس کے سنے گئے تھے کہ مرقوم ہوئے:

دیکھا نہ حور کو بھی امانت نے آنکھ اٹھا
مارا ہوا تھا کس کی خدنگ نگاہ کا
بہار بھی نہیں آئی کہ جوش وحشت سے
ہمارے پاؤں کو ہے ربط خار صحرا سے

اللہ ری رسائی دست جنوں کہ اب
دامن کی راہ لی ہے گریباں کے چاک نے
ہم مرتے ہیں تشنگی سے ساقی کب سے
ظالم لب جام کو بھڑا دے لب سے

....

امانت

امانت تخلص، آغا حسین امرائے نامی لکھنو سے ہے۔ ہر چند سخن اس سخن سنج کا دفتر دفتر میں پہنچا لیکن ناخن بدل زن کم مشاہدہ ہوا۔ یہ ایک شعر پسند آیا تھا تو لکھا گیا:

نے کرم، نے مہر، نے دیں، نے مروت، نے وفا
اے امانت دل دیا تم نے اسے کیا دیکھ کر

....

امین

امین تخلص، مولوی امین الدین شاگرد جناب جنت مآب کمالات انتساب، مولانا مغفرت نشان، مولوی عبداللہ خان علوی تخلص، فنون متداولہ اور علوم متعارفہ کو نہایت تدقیق کے ساتھ خدمت فیض درجت حضرت مرحوم میں تحصیل کیا اور پایۂ تحقیق کو عرش افتخار تک پہنچایا۔ فن فارسی کو بالفعل ان کی استعداد کامل سے قیام ہے۔ اشعار فارسی نہایت متانت اور کمال رزانت کے ساتھ کہتے ہیں، اور اصناف سخن پر قادر ہیں۔ باوجود ان کمالات کے حلم مجسم اور ہمہ تن اخلاق، ان کے لب کو برگ گل کی طرح سے کبھی تبسم سے، اور ان کی پیشانی کو شگوفے کی مانند شگفتگی سے خالی نہیں پایا۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار گوہر نثار سے ہیں:

بدست غیر دیدم شب بہ خواب آں زلف پیچاں را
نمی دانم چہ تعبیر است، ایں خواب پریشاں را

غیر در بزمت مے و جام و رباب و چنگ داشت
دل تپیدن ہائے ما ہم جوش صد آہنگ داشت

در شکستن ہا نشد، منت کش سنگیں دلاں
شیشۂ ما در بغل نے جنبش خود، سنگ داشت

راہ آمد شد فرو بست است بر تار نفس
کثرت داغ تو جا در سینہ ما تنگ داشت

ہر چہ می خواہی، بکن ہشیار، یا دیوانہ باش
لیک باحق آشنا، با خویشتن، بیگانہ باش

از خودیٔ خود گذر، محو رخ یار باش
صورت تصویر شو، پشت بہ دیوار باش

خرقۂ سالوس را، ترک بگو زاہدا
بیعت خمار کن، رند قدح خوار باش

نقد صد داغ جگر سوز مہیا کردیم
با سر زلف تو امروز چہ سودا کردیم

مورد خشم و عتابیم، صد افسوس امیں
عقدۂ راز دل خویش، چرا وا کردیم

تو بر جوان خود اے پیر گردوں نازشے داری
نہ دیدتی مگر جوان طفل نے سوار من

....

امراوعلی

امراوعلی تخلص، امراوعلی خاں ساکن کول۔ اکثر اکبرآباد میں بود و باش رکھتا اور آزادنہ بسر کرتا۔ قوت حافظہ میں کسی کو اس کے ساتھ مساہمت نہ تھی۔ باوصفے کہ

ناخواندہ محض تھا، چرب زبانی اور قوت لسانی سے حریفان زبردست کا سخن اس کے سامنے سبز نہ ہوتا تھا۔ کمال چالاکی طبع سے صدہا لغت وضع کرتا اور ترکی و انگریزی و پرتگالی و فرانسیسی کے نام سے ظاہر کرکے یاران ہم نشین میں علم ہمہ دانی بلند کرتا۔ طرفہ تر یہ ہے کہ اگر کوئی ان لغات کو ایک عمر کے بعد اس سے پوچھتا، اسی طرح بیان کردیتا۔ ستر برس کی عمر میں عالم فانی سے سفر کیا۔ یہ دو شعر اس کے نتائج طبع سے ہیں:

نزع میں دیکھا تو بولے ضعف آیا ہے اسے
مرگ تک ہم سے رہیں کافر کی ٹھٹھے بازیاں
دو پھول اگر کسی نے چڑھائے اڑا دے
باد صبا کو گور غریباں سے لاگ ہے

....

امی

امی تخلص، روشن بیگ، خاندان شرافت سے تھا۔ نفس اس کا نہایت مہذب اور طبع اس کی حلیۂ آزادی سے آراستہ تھی۔ ہرچند بہ سبب اس کے کہ نگاہ اس کی حرف سے آشنا نہ تھی، اسم بامسمی تھا، لیکن طبع روشن اور دل بینا ہاتھ لگا تھا۔ شعر عاشقانہ کہتا اور گاہ گاہ تلاش معنی کی طرف بھی متوجہ ہوتا۔ اپنے اشعار شاہ نصیر کی نظر سے گذرانتا تھا۔ یہ شعر اس کا یاد تھا سو مرقوم ہوا:

گرمی مے سے زباں پر آبلے پڑتے ہیں کیا
اے مغاں اس میں مغیلاں کی بھی پڑتی چھال ہے

....

امیر

امیر تخلص، مرزا امیر بیگ، ساکن قدیم شاہجہان آباد۔ صاحب طبع سلیم اور

بالفعل گوالیار میں مقیم ہے۔ یہ دو شعر اس کے نتائج افکار سے سامعہ افروز ہوئے:

آنکھ وہ کافر کہ قتل عام جس کی اک ادا

لب وہ روح افزا جسے مردے جلانا بات ہے

کب تلک رو کے کہو کوئی کہ تم کو تو امیر

مار مرنا سہل ہے اور زہر کھانا بات ہے

....

امیر

امیر تخلص، میر امیر علی، خلف میر مومن علی، متوطن قدیم شاہجہان آباد، شاگرد حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ اگرچہ استعداد علمی کچھ نہ رکھتا تھا لیکن فیض صحبت اہل علم سے تقریر شستہ اور گفتگوئے شائستہ اور روزمرۂ صاف پر قادر تھا۔ یہ ایک شعر اس کے فرزند ارجمند محمد علی کی زبان سے مسموع ہوا:

ہم کو حاصل کیوں کہ ہو تیرے قد بالا کی سیر

کب میسر ہو سکے ہے عالم بالا کی سیر

....

انداز

انداز تخلص، شاہزادۂ بلند اقبال، مرزا غلام حسین پسر مرزا ھدایت علی مغفور۔ علم موسیقی اور مرثیہ خوانی کی مشق کمال کو پہنچائی ہے۔ گاہ گاہ فکر ریختہ کرتے ہیں اور شیخ ابراہیم ذوق تخلص علیہ الرحمہ سے اصلاح کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ چند شعر ان کے نتائج طبع سے مرقوم ہوئے:

حاصل محنت نہ پایا کوہ کن نے عشق میں

قطرہ قطرہ بن گیا زہراب جوئے شیر کا

دیکھیے آگے کیا ہوئے

دل لگی میں تو ہے ابھی سے رنج
بے تکلف کسی سے مت ہنسیے
اکثر آ جائے ہے ہنسی سے رنج

جور و جفا کی اس کے شکایت کریں تو کیا
سو شوخیاں نکلتی ہوں جس کے حجاب میں
انداز یاد عارض جانان میں روز و شب
سلگی ہے آگ سی دل خانہ خراب میں

نیم بسمل مجھے رکھنے سے تمھیں کیا حاصل
ایک ہاتھ اور بھی خنجر کا لگاتے جاتے

تیور آج اور نظر آتے ہیں ان کے ہم دم
غیر کچھ چپکے ہی چپکے ہیں پڑھاتے جاتے

نہ بہکاتے اگر اغیار ان کو
تو کیا کیا عیش پھر مل جل کے ہوتے

خزاں ہوتی نہ دامن گیر گل کی
نہ دن برگشتہ گر بلبل کے ہوتے

....

انصاف

انصاف تخلص، عبدالرحمان خاں ساکن اکبر آباد۔ راجا بنارس کی سرکار میں جو بالفعل اکبر آباد میں قیام پذیر ہے، نوکر اور اوصاف حمیدہ اس کے وضیع و شریف کی زباں پر ہیں۔ یہ شعر اس کا مسموع ہوا:

حسک کی آگ سے غیروں کا دل کباب ہوا
ہمارے ساتھ جو کی اس نے بادہ خواری رات

....

انیس

انیس تخلص، میر ببر 1 علی پسر میر مستحسن، پسر میر حسن، صاحب مثنوی 'بدر منیر' ساکن لکھنؤ۔ خوش فکر و تیز طبع ہے۔ ہر چند غزل گوئی میں دست گاہ تمام اور قدرت مالا کلام ہے، لیکن گلو اعتقاد آئمۂ عظام سے اوقات عمر کو مرثیہ گوئی میں صرف کیا اور حق یہ ہے کہ اس نظم میں فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے۔ تحت لفظ یعنی مرثیہ بغیر آہنگ موسیقی کے ایسی طرز سے پڑھتا ہے گویا عنان اثر اس کی صدائے دل سوز کے ہاتھ میں ہے۔ یہ شعر اس کے افکار سے مرقوم ہوا:

ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے
پر اک تو ہی نہیں، افسوس ہے ہے

....

اوج

اوج تخلص، عبداللہ خاں ساکن سردھنا۔ نوشت و خواند سے اس قدر بہرہ رکھتا تھا کہ اپنے اشعار کو لکھ لیتا اور

ا۔ نسخہ اول (ص ۱۴۸) اور نسخہ دوم طبع نول کشور ۱۸۸۲ء (ص ۱۴۵) میں 'پیر علی' چھپا ہے جو غلط ہے۔ صحیح 'ببر علی' ہے۔ (فائق)

اپنے لکھے کو پڑھ لیتا، لیکن جو کہ اصل طینت میں فکر بلند اور طبیعت رسا واقع ہوئی تھی، سید مضامین کے واسطے دشت ناپیدا کنار خیال میں جاتا اور تیزی پائے سعی سے اس کا سراغ پاتا، لیکن اس کی شوخی اور اپنی ناتوانی سے باندھ نہ سکتا۔ رفتہ رفتہ طبیعت کو کجی کی طرف مائل کیا بلکہ اپنی اعوجاج پر راسخ ہوگئی اور یکتائی کا مضمون ذہن میں جم

گیا۔ اکثر اوقات کملائے فن سخن کی خدمت میں جاتا اور ان مضامین دور دست کو جو اس بے درد کی تعدی سے شکنجۂ الفاظ میں مغرب ہوتے تھے، ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ اگر مخاطب اتم 1 مجلس تک لب تحسین کو وا اور فغان آفرین کو بلند نہ رکھتا، وہ دم اخیر تک شاکی رہتا۔ مرزا منگو محزون تخلص نے کہ شاہ زادہ صاحب اعتبار ہیں، اس کو نوکر رکھا اور اپنے کلام کو اس کی نظر اصلاح میں پہنچایا۔ سبحان اللہ۔ ع

وزیرے چنیں شہر یارے چناں

مشاعرے میں شعر کو ایسے لہجے سے پڑھتا کہ اس کے خلل دماغ پر دلالت کرتا۔ بیشتر کاملان سخن بہ طریق ظرافت کے اس کو استاد کہتے اور وہ اس سخن کو واقعی جان کر علم مباہات بلند کرتا۔ ہمیشہ زمین ہائے سنگلاخ کی تلاش میں رہتا اور مضامین بلند کی فکر میں آسمان پر چڑھتا۔ لیکن اس بلندی سے ایسا پستی پر گرتا کہ اس کا نالۂ بے طاقتی غالباً گوش قارون سے ہم راز ہوتا۔ اگر ایسا ذہین استعداد علمی کا بدرقہ رکھتا یا کسی خضر راہ سے ملتا، البتہ شاعری کے راہ و رسم سے آگاہ ہو کر منزل مقصود کو پہنچ جاتا۔

ا۔ نسخہ دوم، طبع نول کشور ۱۸۸۲ء (۱۴۶) میں 'اتمام' ہے۔

عرصہ ایک سال کا ہوا کہ خلوت خاک کو اپنا گوشۂ عافیت بنایا۔ بہر کیف یہ دو تین شعر اس کے مرقوم ہوتے ہیں:

بھاتا ہے جوش عشق شیریں و شوں میں رانا

ہے آب شور گریہ، آب زلال اپنا

غیر جنس ایک جگہ رہ کے جو ہوتا ہم جنس

شعلہ آتش کا پر و بال سمندر ہوتا

سخن اپنا نہیں یہ اوج کچھ الہام غیبی ہے

لکھی ہے کاتب قدرت نے موزونی مقدر میں

....

اوج

اوج تخلص، لالہ جگل کشور، قوم کایت سری باستب 1 ساکن شاہجہان آباد، شاگرد جناب استادی مولوی امام بخش صہبائی۔ مرد نیک نہاد، صاف طینت، سینہ محبت کا گنجینہ دل وفاق کے واسطے منزل۔ شعر فارسی کا فکر کرتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے افکار سے انتخاب ہوئے:

بباز ارش نبردم زاں شتاع طاعت خود را
کہ می بینم گراں آں جا بہائے جنس عصیاں را

بخونم پنجہ زد رعنا سوارے کز جفا ہر دم
حنائے پائے گلگوں میکند خون شہیداں را

گل زخمی بفرق اوج زد شمشیر گل روئے
کہ پر گل میکند رنگ رخش جیب گلستاں را

آں کیست کہ بازت کشد از راحت عاشق
تو خود نہ پسندیدۂ آرام دل ما

ا۔ نسخہ دوم (ص ۱۴۶) میں 'باستپ' ہے۔

شد عمر و ہماں تیرگی بخت فزون است
با زلف تو ہم دوش بود شام دل ما

یک آہ تواند ز فلک دود بر آرد
ایمن مشو از تیزیٔ صمصام دل ما

در سزائے خم شکستن محتسب را سر شکن
گر بپاداش گناہے[1] دست رس باشد ترا

....

ایجاد

ایجاد تخلص، شاہ زادہ بلند مرتبہ، عالی درجہ، صاحب ذہن متین مرزا رحیم الدین پسر مرزا حسین بخش سلمہ اللہ۔ طبیعت مضموں خیز، چاشنی سخن انگیں ریز، بنائے کلام استوار، گوہر الفاظ آب دار، خاطر ظرافت پسند، زبان بزلہ گو، دل الفت پیوند، قدم راہ صدق وصفا میں سرگرم تگاپو۔ راقم کے ساتھ باوجود قرابت کے محبت صمیمی واتحاد قلبی ہے۔ فن سخن میں مجھی سے استفادہ ہے اور جو کہ استادی حضرت صہبائی کی التفات ان کی طرف بہت ہے، اکثر اوقات ان کی غزل اس حضرت کی نظر سے بھی مزین ہوتی ہے۔ یہ چند شعر اس و داد کیش کے تحریر ہوتے ہیں:

بت خانے میں تھا یا کہ میں کعبے کے قریں تھا
اے زاہد ناداں تجھے کیا میں کہیں تھا

ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا
پر دل وہ بلا ہے کہ جہاں تھا یہ وہیں تھا

---

[1] نسخہ اول میں 'گناہ سترس' ہے۔

ہے ہے غلط اندازیٔ عیار ستم گر
جس جا پہ مرا دھیان گیا واں وہ نہیں تھا

اللہ رے تری شرم کہ آیا نہ نظر اور
مدت سے مرے پاس تو اے پردہ نشیں تھا

توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں
ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

دیکھو تو مری ضد کہ کسی شب وہ ستم گر
آیا بھی تصور میں تو دشمن کے قریں تھا

اب آئے وہ اب جاں کو ہوئی میرے تسلی
تھا وصیان یہ اور لب پہ دم باز پسیں تھا

دو دن میں ہوا حال یہ اس کا کہ مری جان
دیکھا تو وہ ایجاد ہی گویا کہ نہیں تھا

شب جا کے وہاں اپنا تو کچھ دل سا بھر آیا
سب تھے تری محفل میں پہ ایجاد نہیں تھا

ملے دلے ہوئے آئے تھے اس طرف کہ نہ تھی
تمہارے اگلی سی زیور میں آب داری رات

یہ کس خلش کا تقاضا رہا کہ تا دم صبح
کچھ آپ ہی آپ رہی دل کو بے قراری رات

لب اس کے زخموں پہ چھڑکا کیے نمک جوں جوں
نگاہ دل پہ کیا کی سناں گزاری رات

لے اب جنازے پہ ایجاد کے تو چل ظالم
تری ہی یاد میں تھا وقت دم شماری رات

تیرے خنجر کے شکر نے قاتل
کی ہے زخموں سے سو زباں ایجاد

اس فصل میں کھولیں گے جو زنداں کے نہ در کو

مر جائیں گے دیوانے ترے چھوڑ کے سر کو
یہ باتوں میں بہلائے وہ دل چھین کے لے جائے

کیا یاد ہیں ڈھب لب کو ترے اور نظر کو
کیا کیا نمکین لب کا تبسم ہے نمک ریز

ہنس ہنس کے جو وہ دیکھتے ہیں زخم جگر کو
ہم کو نہ اٹھا بزم سے اپنی کہ مری جاں

ہم آپ ہی بجھ جائیں گے جوں شمع، سحر کو
سب یار ہوئے منزل مقصود کو راہی

اب ہم بھی کچھ آمادہ کریں ساز سفر کو
لخت دل سوزاں بھی ہیں کچھ آنسوؤں کے ساتھ

دامن سے نہ تو پونچھیو، اس دیدۂ تر کو
ظالم ہیں سزا وار تو کچھ لطف کے ہم بھی

دیکھو کبھی تم ایک نگہ سے ہی ادھر کو
لگے ہم سے نظر اپنی چرانے

وہ سمجھے جس گھڑی لطف نظر کو
سبب سمجھا جو بیماری کا وہ شوخ

نہ آیا پھر کبھی میری خبر کو
نظر کی برق مجھ پر ہی گرے گی

وہ دیکھے گو ادھر کو یا ادھر کو
سکھایا دخت رز کو منہ چھپانا

کوئی کیا روئے جان شیشہ گر کو
جتنی ہو پلا دے کہ پیاسا ہوں میں ساقی

ظالم میں سمجھتا نہیں کم اور زیادہ

جتنے ترے پیش آتے ہیں ہم عجز سے اتنی
بڑھتی ہے تری مشق ستم اور زیادہ

اتنے سے ترے تھمنے میں نکلے ہے یہ حسرت
اے اشک ذرا لطف سے تھم اور زیادہ

کتنا ہی کروں خشک پہ یہ دامن تر ہائے
خجلت سے ہوا جائے ہے نم اور زیادہ

کرتے ہیں مرا چارۂ غم جس قدر ایجاد
اتنا ہی یہ ہوتا ہے الم اور زیادہ

باب الباء الموحّدہ

باقر

باقر تخلص، میر باقر علی ابن میر علی حسن ساکن نواح جون پور۔ مدت مدید سے لاہور اور اطراف پنجاب میں تلاش معاش کی تقریب سے ساکن ہے۔ طرز سخن سے معلوم ہوتا ہے کہ موزونی اشعار صرف حدت ذہن اور تیزیٔ طبع کا نتیجہ ہے۔ جو کہ وہ کلام فی الجملہ راہ پر ہے، اگر حیلۂ اصلاح سے آراستہ ہوتا تو تہذیب معقول پا جاتا۔ یہ دو چار شعر اس کے نتائج طبع سے ہیں:

اگر وہ شب کو نہ آئے تو کیا کیا ہم نے
یہی نہ، ان کے نہ وعدہ کا اعتبار رہا

چکھائیں گے تجھے نازک مزاجیوں کا مزا
اگر ذرا ہمیں دل پر کچھ اختیار رہا

تلاش میں ترے دامن کی اے رمیدہ مزاج
صبا کے ساتھ ہی پھرتا مرا غبار رہا

تجھے تو مشغلہ آغیار سے رہا تا صبح
تری بلا سے کسی کو گر انتظار رہا

بحر

بحر تخلص، میر امداد علی نام۔ صاحب استعداد ہے اور ایجاد معانی اور ابداع مضامین میں قدرت ذاتی رکھتا ہے۔ وضع کلام سے دریافت ہوتا ہے کہ فکر تیز گرد اس کا جادۂ طرز شو کنائے بخاری میں گام زن ہے۔ شاگردان ناسخ سے گوئے سبقت اور خوش فکران لکھنؤ سے قصب السبق لے گیا ہے۔ یہ شعر اس کا یاد تھا، سو لکھا گیا:

بعد مدت مقرر وعدہ خلافی وہ ہوا
کھل گیا قفل دہن یار کا جھوٹا ہو کر

بدر

بدر تخلص، میر بدر الدین، ساکن قدیم کرنال۔ سنا گیا کہ پدر بزرگوار اس نیک نہاد کا ایام شباب میں نہایت زور آور و رستم تواں تھا۔ بمقتضائے ''الولد سر لابیہ'' یہ مرد میدان شجاعت بھی توانائی جسمانی میں یگانہ عصر تھا۔ بہت مدت ہوئی کہ زور آزمائی اجل نے اس کی پشت کو خاک گور سے آشنا کیا۔ باوجودے کہ اقتضائے سپاہ گری طبیعت پر غالب تھا، لیکن جو کہ موزونی طبع خدا داد تھی، گاہ گاہ فکر سخن بھی دامن گیر ہوتا تھا۔ ایک دو شعر جو مسموع ہوئے، شاہد عادل ہیں کہ اس کی زبان فصاحت سے خالی نہ تھی:

کس مژہ کی یاد تھی ہمدم کہ شب تا صبح یاں
ہر نفس کے ساتھ دل میں خار سا کھٹکا کیا
کس کا خواہاں ہے کہ دل قافلۂ اشک کے ساتھ
دم بدم سینے سے آنکھوں میں چلا آتا ہے

بدر

بدر تخلص، مرزا بلاقی ابن شاہ زادۂ کام گار میرزا نصیر الدین بہادر۔ جوان وجیہ، خوش اخلاق، شعر گوئی میں مشورہ مرزا پیارے رفعت تخلص سے ہے۔ یہ چند شعر اس کے تحریر ہوئے:

سن لینا ایک دن کہ اسے غم نے کھا لیا
غم کھائے گا یونہی جو یہ غم خوار آپ کا

لب تک بھی میرے وا نہیں ہوتے کہ کچھ کہوں
منہ دیکھتا ہوں میں دم گفتار آپ کا

اے بدر گاہ گاہ ہے اب تک تو درد دل
پکڑے کہیں نہ طول یہ آزار آپ کا

اپنی ہی پرسش میں ہو گا ختم وہ ہنگامہ سب
گر قیامت میں ہمارے حال کا دفتر کھلا

اک کشتی طوفاں زدہ گردوں کو بنایا
اللہ رے گریہ مرے اس دیدۂ تر کا

تو نہ آتا، تری آواز تو آیا کرتی
گھر بھی قسمت سے ترے گھر کے برابر نہ ہوا

گھٹتا نہ خاک ہوئے پر بھی کچھ وقار اپنا
ہمیشہ دوش صبا پر رہا غبار اپنا

کہتا وہی ہے اور محبت بتوں سے کر
کہتا ہوں جس سے حال دل بیقرار کا

در بدر مجھ کو لیے پھرتی ہے دل کی وحشت
گاہے گاہے ترے کوچے میں بھی آ جاتا ہوں

وہ لب اور ان سے مجھ کو جلانے کی آرزو
جن کو دعا بھی دوں تو کہیں یوں کہ مر کہیں

میں اگر جاؤں تو نکلے مطلب دل کچھ نہ کچھ
میرا جانا اور ہے، قاصد کا جانا اور ہے

کیا ڈر ہے جو چرخ ستم ایجاد غضب ہے
اپنی بھی یہ آہ دل ناشاد غضب ہے

جادو ہے نگہ، غمزہ ستم، چال قیامت
انداز ترا قہر ہے، بیداد غضب ہے

چارہ گر کھینچ لے اس دل کو بھی پیکان کے ساتھ
گر یہی دل ہے تو دل بھی نہیں درکار مجھے

برق

برق تخلص، نجم الدین، قاضی زادہ۔ ساکن سکندر آباد کہ شاہجہان آباد سے پچیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ نوجوان خوش مزاج، شوخ طبع۔ سخن کے ساتھ اس کو مناسبت تام اور شعر کی طرف توجہ مالا کلام۔ شعر ریختہ گاہ گاہ کہتا ہے اور اچھا کہتا ہے۔ اب صدر دیوانی آگرہ میں عہدۂ جلیل پر مامور ہے۔ یہ اشعار اس کے مرقوم ہوئے:

کیا کیا اڑی ہیں جیب و گریباں کی دھجیاں
ہاتھوں سے جب کہ یار کا داماں نکل گیا

آج ارمان مرے دیدۂ تر کا نکلا
کہ ہر اک اشک لیے لخت جگر کا نکلا

ہم سمجھتے تھے کہ جنت میں لگے گا کیا جی
بارے کچھ اس میں تو نقشہ ترے گھر کا نکلا

گر کوئی محشر میں پرساں ہو تو فریادی ترے
ہر دھان زخم سے لیں کام نفخ صور کا

گر یہی ہے شوق پابوسی تو بعد مرگ بھی
ٹھوکریں کھاتا پھرے گا لاشہ اس رنجور کا

میری خاطر پھر دکھا عالم رخ پر نور کا

غش سے موسیٰ نے نہیں دیکھا ہے جلوہ طور کا

کیا لگی پھرتی ہے اس پائے نگاریں سے بہار
جس جگہ اس نے قدم رکھا گلستاں ہو گیا

صورت گل چاک چاک اپنا جگر ہے برق یاں
چارہ گر کو فکر ہے ٹکڑے گریباں ہو گیا

وہ اشک کیا ہے جس میں کہ لخت جگر نہیں
کیا ہے وہ آستین کہ لوہو میں تر نہیں

رشک عدو و حسرت وصل، آرزوے مرگ
صدمہ ہے کون سا جو مری جان پر نہیں

بسمل

بسمل تخلص، گوہر تاج ارجمندی، طرازو سادۂ بخت مندی، محمد عبدالحکیم، فرزند دل بند جالینوس الزماں، بقراط دوراں حکیم پیر بخش سلمہ اللہ تعالی اور برادرزادۂ حقیقی استادی حضرت صہبائی مدظلہ العالی۔ فن فارسی میں سلیقۂ معقول حاصل اور تحصیل علم طب میں بہ جان و جنان مایل۔ جوان وجیہ، خوش قیافہ، فصیح زبان، صاف دل، پاک طینت، ثمرۂ جوانی سے متمتع اور حلاوت کامرانی سے لذت چش۔ آئینۂ خاطر کی صفائی سے پرو گیان ضماپر بے نقابی میں ناچار ہیں اور فکر رسا کی دورگردی سے وحشی نژادان اسرار صید ہونے میں بے اختیار۔ اہلیت اور صلاحیت اس قدر کہ گویا مجموعۂ اخلاق اور فرق تا قدم نسخۂ وفاق ہے، اور استعداد خدا داد کا یہ حال کہ اس کے کلام جواہر نظام میں خوبی معنی اور خوش اسلوبی تراکیب اور تنگ درزیٔ 1 کلمات اور رشاقت تشبیہ اور حسن استعارہ حد طاقت بشری سے باہر ہے۔ اللہ تعالی یوماً فیوماً جودت ذہن اور قوت طبع میں افزایش کرے۔ یہ اشعار اس مجمع محاسن کے نتایج افکار

سے لکھے جاتے ہیں:

نوائے بلبل و بوئے چمن تو آ جاتی
قفس کے گر مرے نزدیک گلستاں ہوتا

ا۔نسخہ اول میں 'تنگ درزی' غلط ہے۔

اگر نہ تیغ نگہ سے اسے بچاتا میں
تو ہر حدف کے لیے آج دل کہاں ہوتا

نہ اتنا بدگماں ہو تو نہ تڑپیں گے نہ تڑپیں گے
خدا کے واسطے منہ کھول زخموں پر نمک داں کا

مری بالیں پہ وقت نزع لاؤ ایک دم اس کو
رہے گا حشر تک سینے میں ورنہ داغ ارماں کا

تعجب ہے تمھاری شان سے کچھ حال تو کہیے
کہاں تم حضرت بسمل کہاں رستہ بیاباں کا

قصہ سنے ہے کون عذاب و ثواب کا
ساقی شتاب دے مجھے ساغر شراب کا

میں اور روز و شب کی اٹھائی مذلتیں
یارب برا ہو اس دل خانہ خراب کا

لائے گا سر پہ دیکھیے کیا کیا قیامتیں
رخ سے یکایک اس کا الٹنا نقاب کا

ہے آج کون بام پہ جلوہ نما جو یوں
اڑتا ہے رنگ میری طرح ماہتاب کا

دیر و حرم میں جا کے جو دیکھا بہ چشم غور
پایا کچھ ایک رنگ عذاب و ثواب کا

کر دیں گے ہم زمانۂ پیری کو صرف زہد
اب کیوں نہ مے پییں کہ ہے عالم شباب کا

ساقی ہے اور شراب ہے اور یار ماہ وش
اور اس پہ لطف دے ہے ترشح سحاب کا

انداز گر یہی رہے ظالم ترے، تو گھر
اجڑے گا آج کل کسی خانہ خراب کا

کعبہ اگر بنا ہے اسی سنگ سے تو کیا
زاہد کو بت کدے سے سبب اجتناب کا

عہد شباب حضرت بسملؔ ہے مے پیو
جھگڑا سنا کرو نہ کسی شیخ و شباب کا

چین دیتا ہی نہیں آٹھ پہر میں اک دم
آفت جان ہوا، یہ دل مضطر نہ ہوا

دیکھ دینا نہ بتوں کو تو دل اپنا بسملؔ
یہ وہ ہیں جن کے کوئی ہاتھ سے جاں بر نہ ہوا

ہزار حیف کہ سمجھے نہ تم ہمیں اور ہم
ہمیشہ کرتے رہے دل تلک نثار اپنا

شب فراق میں آئے اجل شتاب کہیں
کہ کر رہے ہیں عدم والے انتظار اپنا

ہم ایسے کیا تھے کہ یوں سہتے طعنۂ اغیار
پہ کیا کریں کہ نہیں اس میں اختیار اپنا

بتوں سے دل کے لگانے کا ہے ثمر بسمل
کہ ہاتھ سے ہے دیا مفت اعتبار اپنا

کس شوق سے پہنچے ہم اے پیر مغاں تجھ تک
پر خوبی طالع سے ماہ رمضاں آیا

میں کیا کہ خبر اس کو اپنی بھی نہیں ہم دم
کم بخت یہ دل اپنا آیا تو کہاں آیا

کیا بنتی ہے اب دیکھیں بلبل کے دل و جاں پر
پھر خار نظر آئے پھر وقت خزاں آیا

وحشت سی برتی ہے آوارہ سے پھرتے ہو
دل آپ کا اے بسمل سچ کہیے کہاں آیا

دیر و مسجد میں خرابی پڑ گئی دل کی طرح
جس طرف سے او بت کافر نذر تیرا ہوا

حضرت بسمل کی حالت دیکھ کر بولا یہ قیس
پیر و مرشد خیر تو ہے آپ کو یہ کیا ہوا

ستم کے کرنے سے تم کو نہ کچھ حیا آئی
ستم اٹھانے سے ہم کو نہ ننگ و عار آیا

یقیں نہ تھا مجھے کچھ فتنۂ قیامت کا
پہ تیرے قد کو جو دیکھا تو اعتبار آیا

عاشقوں پر ترے کب حشر سا برپا نہ ہوا
اک قیامت ہوئی ظالم ترا چلنا نہ ہوا

ساقی ہے آرزو کہ ترے لطف سے کبھی
بیٹھیں جو شام سے تو پییں تا سحر شراب

صبر و قرار و تاب و تواں سب چھٹے رفیق
اک دل یہ رہ گیا ہے سو کیا کیا اٹھائے دل

دزدیدہ ان نگاہوں نے شاید چرا لیا
آتی نہیں ہے پہلو سے میرے صدائے دل

دل نام کو تھا اپنے سو وہ بھی نہیں ہے اب
مدت ہوئی کہ داغ ہے بر میں بجائے دل

شیخ! مے کو برا بتاتے ہو
اس کا تم کو مزہ چکھائیں گے ہم

ناصحا! توبہ، لے خدا کا نام
دل لگانے سے باز آئیں گے ہم؟

جنوں نے کچھ نہیں باقی رکھا اب جیب و داماں میں
کہ میں کچھ ان دنوں اس طرح سے بیکار پھرتا ہوں

مرے شوق شہادت کو تو دیکھو اس کے کوچے میں
خود اپنے قتل کی خاطر لیے تلوار پھرتا ہوں

مجھے ڈر ہے کہیں عالم نہ ڈوبے جوش طوفاں سے
لیے جوں ابر ساتھ اب دیدۂ خونبار پھرتا ہوں

نہ جی چاہے ہے کعبے کو نہ بتخانے کو اے بسمل
کروں کیا اضطراب دل سے میں ناچار پھرتا ہوں

اس بے کسی میں آبلۂ پا تھا اک رفیق
دولت سے خار راہ کی وہ بھی رہا نہیں

بلبل کی طرح سے ہے مرا برق خانماں
وہ گل عذار جس میں کہ بوئے وفا نہیں

سو بار آسماں کو جلایا پہ ہم نشیں
کچھ ان دنوں میں ضعف سے نالہ رسا نہیں

بسمل تم اس پہ دل دیے بیٹھے ہو کس لیے
وہ بت کبھی کسی کا ہوا آشنا نہیں

کیا عشق کا بھی حوصلہ اب ہو چلا ہے تنگ
کچھ ان دنوں وہ سوز نہیں، چشم تر نہیں

ہر ہر نگہ میں ناز فروشی ہے کس لیے
اپنا تو اب وہ دل ہی نہیں وہ جگر نہیں

قاصد پھرا ہے یوں کہ خدا خیر ہی کرے
میری طرح سے کچھ اسے اپنی خبر نہیں

تاثیر شوق کی مرے حق میں ہوئی ہے زہر
ٹکتا زمیں پہ قدم نامہ بر نہیں

سن کر مرے فسانۂ ہجراں کو دیر تک
چپ تھا وہ اس طرح سے کہ گویا خبر نہیں

تیرے خدنگ کو نہیں پرواز ہم تلک
گویا کہ اس عقاب کے بازو پہ پر نہیں

ہر ہر جگہ ہے بسمل شوریدہ سر کی دھوم
تیرے جگر فگار کے چرچے کدھر نہیں

گریہ سے میرے کچھ تو بجھی آتش جگر
جاری رکھے خدا مری چشم پر آب کو

اللہ ری غفلتیں کہ ہوئے ہم تو مر کے خاک
اور تم نے اب تلک نہیں الٹا نقاب کو

بہائے خون عاشق کیا اور اس کا خون کیا صاحب
مجھے تم قتل کر کے کس لیے ہو اب پشیماں سے
کسی دن حضرت دل تیرہ بختی گل کھلائے گی
الجھنا روز کا اچھا نہیں ہے زلف پیچاں سے
کھلے گا جس جگہ حق ہم وہیں سر کو جھکائیں گے
نہ ہم کو ربط کچھ کافر سے نے نفرت مسلماں سے
بتوں کا گھر ہے کعبہ سبحہ سے زنار کو رشتہ
کھلا یہ ماجرا زاہد ہمیں تحصیل ایماں سے
گلی کوچے میں پھرنا روز کا اچھا نہیں حضرت
ہوا کیا تم کو اے بسمل جو ہو ایسے پریشاں سے
اے بلبلان باغ! رہائی سے فائدہ
سر پر خزاں ہی آ گئی جب ہم رہا ہوئے
اس کی گرہ بھی کیا مرے دل کی ہے اک گرہ
بند قبا جو ہم سے نہ اک روز وا ہوئے
بسمل انہیں کی یاد میں سب کچھ بھلا دیا
نادان یہ صنم نہ ہوئے کچھ خدا ہوئے

بسمل

بسمل تخلص، حافظ محمد حسین نام، ولد حافظ محمد بخش عرف حافظ مِمّو، ساکن حویلی خان دوران خان مرحوم، صاحب طبع سلیم و ذہن قویم ہے۔ وجاہت صوری اور حسن معنوی سے بہرہ ور، جمال ظاہری اور کمال باطنی سے کامیاب، علوم رسمی سے بہ قدر ضرورت متمتع، دل نشینی سخن سے گوش شوق کی سیری محال، اور دل چسپی کلام سے بے

التفاتی مخاطب کی وہم وخیال۔ اصلاح شعر راقم کے مشورے سے صورت پذیر ہے۔ یہ چند شعر بطور انتخاب کے قالب تحریر میں آئے:

نہ آئے گا یہاں تک اور نہ مطلب دل کے ہوئیں گے
نہ سمٹے گا قیامت تک کبھی دامن تمنا کا

دل تو نے ہم سے او بت کافر اٹھا لیا
اس ناز کی میں بوجھ یہ کیوں کر اٹھا لیا

بار گران عشق فلک سے نہ اٹھ سکا
کیا جانے میرے دل نے یہ کیوں کر اٹھا لیا

کیا کام ہے، بلا سے جو تو ہو اسیر زلف
جب تجھ سے ہاتھ اے دل مضطر اٹھا لیا

پیر مغاں نے لبِ مے کش کو دیکھ کر
شیشہ بغل میں، ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

نیم بسمل کیوں نہ مجھ کو چھوڑتا ہنگام ذبح
یار کو میرے تڑپنے کا تماشا ہو گیا

شکوہ مت کر حال جو بسمل ترے دل کا ہوا
شکر ہے ہر حال میں جو کچھ ہوا اچھا ہوا

گر پڑے گا تو زمیں پر کانپ کر، اے چرخ پیر
نیم نالہ بھی کوئی ہم سے اگر برپا ہوا

میں نہ کہتا تھا نہ ہو رو کش تو اس کی زلف سے
اس خطا سے منہ ترا مشک ختن کالا ہوا

ہم گئے تھے دل کو لینے وہ طلب کرتے ہیں جاں
دل کو کیا روتے تھے ہم، اب جان کا رانا ہوا

تم سے دل کی ناز برداری نہ ہو گی، دل نہ لو
جان من یہ دل بڑے نازوں کا ہے پالا ہوا
دلبری کی بات گو ان میں نہیں، اے دل مگر
عمر بھر ان سا نہ ظالم بھی مجھے پیدا ہو
یہ کس سیاہ بخت کے گوندھی ہے خون میں
کالا جو تیرے ہاتھ میں رنگ حنا ہوا

بسمل

بسمل تخلص، نواب امیر حسن خاں، ساکن دارالامارۃ کلکتہ۔ ہر چند دولت دنیا سے اس قدر بہرہ حاصل تھا کہ گدائے محلّہ اس کی زکوۃ سے صاحب نصاب ہو کر اپنی بضاعت سے اتنی زکوۃ نکالتا کہ اگر اس کا عشر عشیر خسرو پرویز کو ہاتھ لگتا، آٹھواں خزانہ اور معمور ہو جاتا، لیکن مزاج میں مسکینی و تواضع اس درجے پر تھی کہ مثل خم ابرو تسلیم اور مثل سایہ افتادگی گویا ایک امر سرشتی تھا۔ دقایق سخن سے کماہی آگاہ اور صنایع و بدایع میں کامل دست گاہ۔ نظم و نثر میں باوجود صفائی الفاظ اور شستگی عبارت کے تلاش معنی کا مرتبہ نہایت کو پہنچ گیا تھا۔ جناب استادی حضرت صہبائی سلمہ اللہ تعالی کی حمائد اوصاف سن کر اخلاص غائبانہ بہم پہنچایا اور خط و کتابت کے وسیلے سے رابطہ خلت کو بڑھایا۔ ایک رقعہ الفاظ بے نقط میں ان کی خدمت میں بھیجا تھا۔ باوجود اس قید کے بے تکلف و آمدنی تھا، نہ ساختہ و برداختہ۔ چند سال ہوئے ہیں کہ دنیائے دوں سے دل اٹھا کر عالم آخرت کو راہی ہوا۔ یہ چند شعر بطریق یادگار مرقوم ہوئے:

سرمۂ خود بچشم کم منگر
دیدہا زیں غبار روشن گشت
شہد ریز و کلام شیرینم

بر لب او مگر لب من گشت
نہ شود اگر بسینہ رہ قاصد نفس گم

دوسہ حرف خوں چکانے، بلب ارمغاں فرستم
آں قدر از دل صد پارہ نماند است بجائے

کہ باحباب تواں رقعۂ انشا کردن

خال عارض کہ تہ کاکل یار افتادہ
مہرۂ زہر بود از لب مار، افتادہ

وہ! چہ تیر مژۂ تیز تو صید انداز است
ہم چناں بود بہ ترکش کہ شکار افتادہ

لالۂ را خلعت گلگوں، صلۂ یک داغ است
بہر من چیست کہ داغم ز شمار افتادہ

بسمل

بسمل تخلص، رام کشن پنڈت، مدرس زبان انگریزی، دقایق فارسی سے بخوبی واقف اور غوامض سخن سے دل خواہ آگاہ۔ مقامات کتابی کو کمال تدقیق کے ساتھ حل کیا ہے۔ تہذیب اخلاق میں بے مثل اور ستودگی کردار اور درستی گفتار میں بے نظیر۔ شعر فارسی خمخانۂ شیراز کا جوش، اور سواد رقم سرمۂ اصفہانی سے ہم دوش۔ یہ چند شعر اس کے نتائج طبع سے ہیں:

سر شک دیدۂ غماز کشف رازم کرد
فغاں کہ پردہ ز روئے غم نہاں برداشت

سنبل مشکیں بود یا زلف عنبر بوئے دوست
نافۂ چین است یا خال رخ نیکوئے دوست

ماہ نو، یا سجدہ گاہ عاشقاں، یا تیغ تیز
یا کماں، یا نون قوسی، یا بود ابروئے دوست

لالۂ گلزار خوبی یا مہ اوج کمال
یا بود مہر سپہر دلبری، یا روئے دوست

ایں کہ لبّ‌ِ مردگاں را میدھد جانے دگر
یا بود باد مسیحا، یا نسیم کوئے دوست

اگر نہ بادہ ز انگور باغ بخت من است
ہمیشہ چشم تو زیں گو نہ مست خواب از چیست

دل را ز چشم آں بت پر فن نگاہ دار
جنس گراں بہا ست، ز رہ زن نگاہ دار

چوں غنچہ خون دل خورو در حفظ راز کوش
ہر دم زباں بکام، چو سوسن نگاہ دار

از لطف چرخ دم نور از دوقت دھد
خود را ز روبہ بازئ دشمن نگاہ دار

بر چاک ہائے سینۂ سوزاں رفو مزن
از بہر آہ ایں دو سہ روزن نگاہ دار

سر رشتۂ خرد مدہ از دست و گم مشو
خود را طفیل رشتہ چو سوزن نگاہ دار

نگاہ بر رخ جاناں نمی تواں کردن
نظر بہ مہر درخشاں نمی تواں کردن

بشیر

بشیر تخلص، میر بشارت علی شاگرد میر نظام الدین ممنون۔ یہ شعر اس کے افکار سے ہے۔

شاید دل بے تاب کو تسکین ہو اپنے
کھچوا کے رکھوں سینے پہ تصویر کسی کی

بلند

بلند تخلص، صفدر علی بیگ نام، ابن مرزا فضل علی بیگ، قوم مغل، ساکن محلّہ کھاری باولی۔ مرد قابل، خوش اخلاق، پسندیدہ اطوار، نیک نہادی و صاف دلی میں یگانہ۔ طرز وفاق اور سیاق آشنا پرستی میں یکۂ زمانہ، حلم و وقار کو اس کے گوشۂ طبیعت میں منزل آسائش اور نجابت و شرافت کو اس کی نسبت سے زیب و آرائش، علم حساب میں مہارت تام اور انشا نگاری میں دست گاہ تمام، خط نستعلیق کی شان خط گل رخاں سے جاں فزا تر اور خط شکستہ کی طرز زلف خوباں سے دل رباتر۔ والد اس نیک نہاد کا راجا الور کی سرکار میں علاقہ مدرسی مدرسہ سے ممتاز ہے اور یہ ہوشیار خرام گاہ گاہ قدر دانی حکام وقت سے علاقہ تھانہ داری سے سرفراز رہتا ہے۔ شعر گوئی کی طرف توجہ تمام مصروف اور طبع اس کی اس فن سے کمال مالوف ہے۔ اصلاح شعر راقم آثم سے لیتا ہے، چند شعر اس کے نتائج طبع سے منتخب ہوئے:

یہی مبدا ہے رنج و محنت کا
ذکر مت کیجیے محبت کا

تم سے مل کر بنا نشانہ بلند
درد کا، رنج کا، مصیبت کا

تیرے ہرجائی پن نے اے بے مہر
مجھ کو عالم سے شرم سار کیا

وہ ہی بیگانہ وش رہا ہم سے
ہم نے اک عمر جس کو پیار کیا

بے وفا، پیاں گسل، دیر آشنا و زود رنج
جو تجھے ہم نے کہا اے یار زیبا ہو گیا

کچھ وصل کا سا حسرت پنہاں میں ملا لطف
شب میرے تصور میں جو اک پردہ نشیں تھا

روز ہے اس کو میرے قتل 1 کا فکر
غیر سے دھیان ہے سوا اپنا

کچھ نہ کچھ ایذا رہی ہے سوز غم کے ہاتھ سے
مٹ گیا گر آبلہ اک داغ پیدا ہو گیا

رنج و راحت ہے انتہا میں ایک
ہجر میں ہو گیا وصال اپنا

جان و غم میں ہے اک کشاکش سی
آج جھگڑا ہے، انفصال اپنا

جس قدر ہم کو تجھ سے تھی امید
اس قدر ہی تیرا عتاب رہا

قیس و فرہاد و وامق اور بلند
عشق میں جو رہا خراب رہا

سنیے کیا ناصحوں کی باتوں کو
اب وہ اپنا نہیں دماغ رہا

1۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں 'کی' ہے۔

جاں ہے یہ کچھ کشاکش آزار میں کہ آج
رویا کیا سرہانے مسیحا تما شب
توبہ تو مدت سے کی تھی ہم نے پرائے محتسب
ہو گئی مے کی ہوس کچھ ابرو باراں دیکھکر
اشارے ہیں ان سے جو ہیں کور چشم
ہیں آنکھیں تو اچھی نظر کچھ نہیں
تمھارا جو بیمار تھا مر گیا
تمھیں اے ستم گر خبر کچھ نہیں
جو ہم دل کہیں دیں نہ روکو بلند
تمھارا تو اس میں ضرر کچھ نہیں
ایک بوسے پہ یہ لڑائی حیف
دس نہیں، سو نہیں، ہزار نہیں
میرے پہلو میں دل ہے یا بجلی
کہ کسی دم اسے قرار نہیں
سیکڑوں بندۂ خدا مارے
کیا بتوں کے ہی گھر خدائی ہے
اکھڑا اکھڑا ہے مجھ سے دل شاید
اس نے اپنی وہاں جمائی ہے
اڑے پھرتے ہیں اپنے سانس کے ساتھ
ہمارا ضعف سے لاغر یہ تن ہے
کہاں وہ اور کہاں دشمن مگر یہ

ہمارا ہی فقط دیوانہ پن ہے
بے مرضی اس کے ہاتھ لگاؤں اسے بلند
یہ تاب، یہ مجال، یہ قدرت کہاں مجھے

بلبل

بلبل تخلص، پنڈت گوری شنکر، متوطن دار السلطنت لاہور، نوجوان خوش مزاج، پسندیدہ اخلاق، زبان دانی میں اقران و امثال سے ممتاز ہے۔ صفائی سینہ اور پاکی کلام میں متاخرین سے سرفراز۔ اتفاقاً وارد شاہجہان آباد ہو کر استادی مخدومی مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت سے مستفید اور اسی جگہ راقم آثم سے ملاقی ہوا۔ یہ چند شعر اس کی زبان سے مسموع ہوئے:

اگر بہ چشم جہاں نیست عزتے غم را
چرا کنند سر سال ہا محرم را
باوصل خود ز اشک چہ پرسی سبب مرا
چون شیشہ، گریہ رسم بود در طرب مرا
محو صفائے سینۂ او بود دوش دل
گویا گذر فتاد بہ شہر حباب مرا
از آمدن خطت ز سبزہ
مو بر تن نوبہار برخاست
ما را تپ استخوانی عشق
اے وائے کہ در شباب دادند
گشت ویراں خانۂ دیوانہ
ہر کجا ویرانہ آباد شد

به پیری است مرا زینت دگر حاصل

که جامۂ تن من از شکن اتو دارد

زاہد از محفل صہبا بگریز

ساحل خشک ز دریا بگریز

مردم و باقی ست شوق آں میاں

استخوانم وستہ شد بر خنجرش

من ز شعر کس نہ وزدم معنی

لیک از گفتن نفس وزدیدہ ام

ندیدہ کسے غیر خال لب او

ز نیلم نگین و ز یاقوت خاتم

گردش چشم ترا دیدم و از کار شدم

بے خود از گردش ایں ساغر سرشار شدم

دود شمع پۓ پروانہ نگردد زنجیر

من چناں در خم آں زلف گرفتار شدم

خامشی ماتم طبع است زباں آور را

کند ایں نکتہ سیاہ پوشی سوسن روشن

سرم گردد، اگر اشکے ز چشم تر فرو ریزم

شود در گردش از یک قطرہ آبے آسیاب من

بلبل بفکر جمع زر و مال دل مدہ

باید کہ از جہاں، دل جمعی بہم کنی

بنو

بنّو (اول مفتوح دوم مشدد مضموم اور آخر مجہول) تخلص اور نام ایک زن خانگی کا ہے کہ خطہ حسن خیز شاہجہان آباد میں اس جمال کے ساتھ خوبان دل ربا سے کم کسی کو نشان دیتے ہیں۔ حسن کی صباحت اور کلام کی ملاحت ایک خرمن جان پر برق افگن، دوسری زخم جگر پر نمک زن۔ غمزۂ زاویۂ چشم میں دل ہائے آشفتہ کی تاراج کے واسطے کمین ساز اور اشارۂ گوشۂ ابرو میں جان ہائے مجروح غارت گری کے لیے خدنگ انداز۔ کوچۂ زلف میں دل عشاق کی کثرت سے شانے کی راہ آمد و شد گم، اور مستی چشم کے دور میں زاہد کو محراب نماز پائے خم۔ نشۂ حسن میں اٹکھیلیوں سے رستہ چلنا اور ہر ہر قدم میں دل خلق کو پاؤں کے نیچے مسلنا ایک عالم رکھتا تھا۔ اللہ اللہ! کمند ناز کا جذبہ کہ گھر سے ایک قدم باہر نہ جانا اور صید دل کو کوسوں سے کھینچ لانا۔ اس خاک لطافت بنیاد میں ایک جوان خوبرو، سنبل مو، سرو قامت، قد قیامت، گلاب سنگھ نام آشفتہ تخلص تھا کہ طرفین کی کشش سے وہ اس کے دم زلف میں گرفتار اور یہ اس کے شوق لب میں جگر خوار۔ بس کہ طبیعت خداداد اور فکر رسا رکھتی تھی، اس جوان شغول کے اثر صحبت سے فکر شعر دامن گیر ہوا۔ چند روز میں موزونی طبع کو ایک حسن اور پیدا ہوا اور حسن صورت جمال معنی سے دوبالا۔ جو کہ یہ بات مسلم ہے کہ معشوق اگر سراپا شوق ہو کر عاشق سے ملے، عاشق کی ناشکیبائی اس التفات کو تغافل ہی جانتی ہے۔ نیرنگی عشق سے ایک روز آشفتۂ آشفتہ خرد نے عالم بے اختیاری میں ایک خنجر سے مژۂ دشنہ گذار کی تشبیہ کے خیال میں اپنا گلا کاٹ لیا۔ چنانچہ یہ حال اس کے ترجمے میں مفصل مرقوم ہو چکا ہے۔ جب یہ خبر معشوق وفادار نے سنی، رخسار کو طپانچے سے نیلا کیا اور بہ آواز بلند یہ شعر آشفتۂ جاں باز کا پڑھا:

بچتا نہیں ہے جو کہ ہے بیمار عشق کا
یا رب نہ ہو کسی کو یہ آزار عشق کا

اور پھر دیر تک افراط غشی سے سکتے کا عالم ہو گیا۔ بارے جب ہوش آیا ارادہ کیا

کہ عاشق کی لاش پر حاضر ہو لیکن بعض اقارب مانع ہوئے۔ اس سانحے کے بعد نہ کسی سے آشنا ہوئی اور نہ کسی کے سامنے نقاب کشا۔ اسد اللہ خاں غالب کا شعر کیا مناسب حال ہے:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

تپ غم کا اثر تھا یا کیا تھا، چھ سات مہینے کے بعد اس سوختہ جاں کو تپ دق عارض ہو گئی اور کچھ علاج سودمند نہ ہوا۔ ایک روز شدت مرض میں یہ شعر کہا:

میں تپ غم سے جلوں اور یہ کریں دق کا علاج
ہو سمجھ الٹی طبیبوں کی تو اس کا کیا علاج

کہتے ہیں کہ بعد چند روز کے عالم فانی سے ملک باقی کی طرف راہی ہوئی۔ درد مفارقت سے اکثر اشعار شوقیہ اور مضامین ہجر کے ایسے کہے ہیں کہ ان کے سننے سے دردمندان محبت کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ جو جو راقم تذکرہ کے ہاتھ آئے مرقوم ہوئے:

چھوڑ کر مجھ کو کہاں اے بت گم راہ چلا
تو چلا کیا کہ یہ دل بھی ترے ہمراہ چلا
چھٹ گیا غم سے مرا کشتۂ ابرو مر کر
اک چھری میرے گلے پر بھی مری آہ چلا
نہ تو موت آتی ہے نے زیست کا یارا مجھ کو
ہائے آشفتہ ترے مرنے نے مارا مجھ کو
موت پر بس نہیں چلتا ہے کروں کیا ورنہ
تو نہیں ہے تو نہیں زیست گوارا مجھ کو
اب کسے چین، کہاں عیش، کدھر بستر خواب

نہیں مخمل بھی کم از بستر خارا مجھ کو
کیا ہوئی ہائے فغاں کی تری شور انگیزی
لے چلی تجھ کو تو تو نے نہ پکارا مجھ کو
ہے غضب وہ تو مرے اور جیوں میں بنو
موت آ جائے تو ہو عمر دوبارا مجھ کو
لاش آشفتہ کو بے رحموں نے پھونکا آگ سے
آتش غم بھی جوانا مرگ کی کچھ کم نہ تھی

بیتاب

بیتاب تخلص، سرو حدیقۂ دولت و اقبال، نواب عباس علی خاں، خلف نواب مستطاب معلی القاب نواب عبدالعلی خاں، کہین برادر نواب محمد سعید خاں بہادر رئیس رام پور۔ رفعت شان کو پستی تواضع کے ساتھ جمع اور سربلندیٔ مرتبت کو افتادگی اخلاق کے ساتھ فراہم کیا ہے۔ قلم حیران ہے کہ کس کس خوبی کا بیان کرے، حسن خلق کو لکھے یا جمال صورت کا ذکر کرے۔ خلق تو محمدی ہے اور جمال یوسفی۔ رسائی فکر سے کنگرہ عرش فرسودہ اور بلندیٔ طبع سے رفعت چرخ پست۔ مضامین شوقیہ سے بلبل نالہ آموز اور کیفیت سخن سے ہوشیار مغزان پارسا طینت سرمست۔ جب تک شہر کرامت بہر شاہجہان آباد کی زمین اس بلند مرتبت کے نقش قدم سے رشک گلشن تھی، مومن خاں مرحوم مومن تخلص سے مشورے کا اتفاق ہوتا تھا۔ جب ریاست رام پور مسند نشینی نواب محمد سعید خاں بہادر سے نامی اور وہ حکومت اس سرور اقبال مند کی ذات سے گرامی ہوئی، اس نونہال گلشن اقبال نے اس گل زمین کو اپنے قدم بہار توام سے سرسبز و شاداب کیا۔ اس وقت سے اس زمانے تک سخن گوئی کی بنا کو اپنے ہی زور طبیعت کی اساس پر بلند کیا ہے۔ جو کہ اشعار اس خوش فکر کے راقم تذکرہ کو

کچھ بہم نہ پہنچے، ناچار ''گلشن بیخار'' سے کہ ایک تذکرہ ہے مصنفات نواب مصطفی خان بہادر شیفتہ تخلص سے، یہ شعر ان اوراق میں نقل کیا ہے:

آخر فریب کھا کے کیا اس نے مجھ کو قتل
میں نے کہا تھا تم سے اٹھائیں گے مر کے ہاتھ

بیتاب

بیتاب تخلص، کشن نرائن، قوم کھتری، ساکن بنارس۔ راجا شہر نیپال کے اعزاہ میں سے ایک دو شخص شہر بنارس میں بود و باش اور عزت و اعتبار کے ساتھ عمر بسر کرتے ہیں۔ یہ موزوں طبع ان دنوں اس بلند مرتبت کی سرکار میں ملازم اور صاحب اعتبار ہے۔ یہ دو شعر اس کے اشعار سے منتخب ہو کر درج تذکرہ ہوئے:

بکھرے بالوں میں ہے یوں ماتھے پہ افشاں کی چمک
جیسے بدلی میں ہو نقشہ کرمک شب تاب کا
پتلیاں آنکھوں کی کب خائف ہوں بحر اشک سے
مردم آبی کو کچھ خطرہ نہیں سیلاب کا

بیتاب

بیتاب تخلص محمد جعفر علی ساکنان قدیم اکبر آباد سے ہے۔ تحصیل علوم مدرسۂ اکبر آباد میں کی ہے اور بعد امتحان استعداد کے رجمٹ اول کنٹن جنٹ گوالیار میں عہدۂ منشی گری پر مامور ہوا۔ اس کے افکار سے یہ شعر ناخن بہ دل زن پایا گیا کہ مرقوم کیا1

:

حضرت بیتاب اور فکر سخن
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

بیخود

بیخود تخلص محمد نظام الدین خاں، خلف الصدق

1۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور میں 'ہوا' ہے۔

محمد حیات خاں کہ بالفعل حکام وقت کی طرف سے عہدۂ اسٹنٹی پر مامور اور شیوۂ راست معاملگی و نیک نہادی میں مشہور ہے۔ اصلاح شعر ریختہ اپنے والد ماجد سے لیتا ہے۔ یہ دو شعر اس کے نتائج افکار سے ہیں:

رہ گیا پیکاں جو پہلو میں ترا اچھا ہوا
دل لگی کو اور دل پیدا ہوا اچھا ہوا
تھی ہمیں مدت سے اے بیخود اسیری کی ہوس
ہو گیا دل مائل زلف دوتا اچھا ہوا

بیدل

بیدل تخلص، غلام حسین، حکیم زادہ، فن طب سے مناسبت طبعی ہے۔ شعر میں حافظ عبدالرحمان خاں احسان غفر اللہ لہ سے تلمذ رکھتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے نتائج افکار سے ہیں:

یار کو پھر دم ناوک فگنی
گاہ دل گاہ جگر یاد آیا
ماہ سے نسبت کا دنیا تجھ کو ہے نا منصفی
مہر وش تجھ میں اور اس میں فرق ہے دن رات کا

دل کر چکے پہلے ہی نیاز غم فرقت
اب کیا ہے ادھر قصد جو ہے ناز و ادا کا
پاؤں رکتا ہے کوئی کوچۂ جاناں سے مرا
دل کے ہاتھوں نہ گیا آج تو کل جاؤں گا
ہوں میں مدہوش مے عشق بتاں اے بیدل
نہیں ممکن کہ سنبھالے سے سنبھل جاؤں گا
نگہ کی چشم کی زلف دوتا کی
سہے اک دل جفا کس کس بلا کی
کب اس گل کی گلی تک جا سکے ہے
ہوا باندھی ہے یاروں نے صبا کی
بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدل
تمھیں یہ دن لگے قدرت خدا کی

بیمار

بیمار تخلص ہے شیخ علی بخش ساکن سنبھل کا۔ فارسی میں استعداد کامل ہے اور ریختہ گائی میں مہارت تام۔ الفاظ کی شستگی اور زبان کی پاکی احاطۂ بیان سے خارج ہے۔ سرکار محمد سعید خاں والی رام پور میں فی الجملہ ناخن بندی وسیلہ تحصیل معاش ہے اور رئیس مذکور کی فرمائش سے کوئی جلد بوستان خیال کی کہ افسانہ ہے عجیب اور داستان ہے غریب، اردو میں نظم کرتا تھا۔ معلوم نہیں اختتام کو پہنچایا یا نہیں۔ یہ اشعار اس کے نتائج ذہن وقاد سے ہیں:

کون پرساں ہے حال بسمل کا
خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

لب جو کون سیر کو آیا
موج منہ چومتی ہے ساحل کا
سانس آہستہ لیجیو بیمار
ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

بیمار لے چکے ہیں ابھی تو وہ امتحاں
کم بخت پھر وفا کا تجھے حوصلا ہوا

جس کسی نے دل دیا ان کو چھپے چوری دیا
ایک میں کم بخت ناداں تھا کہ رسوا ہو گیا

تیر قاتل سے سر شکوہ کہاں رکھتے ہیں
بے زباں صورت سوفار دہاں رکھتے ہیں

کیا سفر کا ارادہ جو بزم جاناں سے
کوئی گلے نہ ملا موت کے سوا مجھ سے

کہیں سنی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمار
کہ اٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے

موت سے بھاگنے لگے بیمار
کیا اسے تم شکستہ پا سمجھے

نہ رہنے دے گی وحشت بت کدے میں
اٹھو بیمار جو مرضی خدا کی

ہر روز وہ پھر جاتے ہیں در تک مرے آ کر
کچھ جذب محبت کو لگی ہے نظر ایسی

بیمار کو غفلت ہے بہت خیر نہیں آج
ہر چند کہ تھی حالت غش کل بھی پر ایسی

گیا نہ بزم بتاں میں نہ آپ میں آیا
کہیں نہ ہوں گے زمانے میں نارسا مجھ سے

اور مطلب آہ سوزاں سے نہیں
خاک ہونے کی تمنا ہے مجھے

حال دل بیمار نہیں ضبط کے قابل
لیکن وہ زباں مجھ کو ہلانے نہیں دیتے

باب الباء الفارسی

پارسا

پارسا تخلص، منشی فیض پارسا مرد خوش خلق، نیکو نہاد حافظ کلام اللہ تھا۔ سعادت ذاتی اور اہلیت صفاتی کا بیان خامۂ خام رقم کی مجال سے باہر ہے۔ کثرت زہد و تقویٰ سے اسم با مسمیٰ ہو گیا تھا۔ حضرت با برکت زبدۂ اولیاء کرام، اسوۂ کملائے عظام، مورد رحمت ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد امجاد سے تھا۔ مدرسۂ شاہجہان آباد میں جو حکام وقت کی طرف سے طالبان کمال کی تربیت کے واسطے معین ہے، تعلیم فن حساب پر مامور اور اس فن کی مہارت میں مشہور تھا۔ گاہ گاہ شعر ریختہ بھی کہتا۔ مدرسہ غازی الدین خان میں جو شہر شاہجہان آباد دروازہ اجمیری کے باہر واقع ہے، اس بزرگ نہاد کی تکلیف سے بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی اور چند مدت تک وہ ہنگامہ گرم رہا۔ مشاہیر شعرائے شیریں سخن شاہ نصیر غفر اللہ لہ اور مومن خاں مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق مغفور اور ان کملائے قادر سخن کے تلامیذ اور موزوں طبعان شہر جمع ہو کر شیرینیِ سخن سے سامعان فہیم کے کام طبیعت کو لذت ستاں اور رنگینیِ کلام سے مستمعان سخن فہم کے پردۂ گوش کو رشک گلستاں کرتے تھے۔ تقریباً ایک حکایت یاد آئی ہے، مشتاقان حقائق و سوانح کی ضیافت طبع کے واسطے مذکور ہوتی ہے۔

شاہ نصیر اسی ایام میں سفر لکھنؤ سے معاودت کر کے وارد شاہجہان آباد ہوئے تھے اور پارسائے پارسا طینت کی تکلیف سے شریک مشاعرہ ہو کر دو غزلیں تازہ زمین کہ شعرائے لکھنؤ کی تکلیف سے کہیں تھیں، اس مشاعرے میں بہ طریق تکرار کے پڑھیں۔ ایک کا مطلع اور دوسری کا ایک شعر اس مقام میں لکھتا ہوں:

ہم پھڑک کر توڑتے ساری قفس کی تیلیاں

پر نہ تھیں اے ہم صفیرو اپنے بس کی تیلیاں

برہمن اپنے بتوں کو بخدا سجدہ نہ کر
آدم مردہ ہیں بے گور و کفن پتھر کے

بعض احباب نے اس نظم کی افراط تحسین اور کثرت ستایش سے حسد کو کام فرمایا اور اپنے بعض شاگردوں کو ان دونوں زمینوں میں غزل کہنے کی تکلیف کی۔ خیر الدین یاس تخلص نے دوسری زمین میں ایک شعر خوب کہا تھا:

مرہم سنگ جراحت نے بھرے اپنے گھاؤ
کب کے مشتاق تھے زخموں کے دہن پتھر کے

یہ بات شاہ نصیر کو ناگوار ہوئی اور پہلی زمین میں قریب پچاس غزل کے کہہ کر اپنے شاگردون کے نام سے مشاعرۂ آئندہ میں پڑھوائیں۔ اس حرکت سے حسد کا بازار گرم ہوا اور اس جلسے کے بعد شعرا نے یہ التزام کیا کہ ہر مشاعرے میں اسی زمین میں غزل طرح ہوا۔ الحاصل کئی مہینے تک 'تیلیوں' کی ردیف کی غزلوں کے سوا اور کچھ نہ کہا اور ان عاشقان سخن کو ایسا سودا ہوا کہ زمین سخن میں مدت تک تنکے چننے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ اور کثرت خس و خاشاک سے کاغذ مسودہ نے کوڑے کا حکم پیدا کیا۔ غالب ہے کہ اس طرح تازہ کے طفیل سے کسی شاعر کے گھر جاروب میں بھی کوئی تیلی باقی نہ رہی ہوگی۔ اور لوگ آٹھ نو شعر کے سوا مشاعرے میں نہ پڑھتے تھے۔ شاہ نصیر کی تلاش پر ہزار آفریں ہے کہ ہر بار دو غزلہ ساٹھ ستر بیت کا پڑھتا تھا اور ہر شاگرد کی غزل انیس بیس بیت سے کم نہ ہوتی تھی۔ طرفہ یہ ہے کہ وہ سب غزلیں بھی اسی یکہ تاز عرصۂ سخن کی طبع زاد ہوتیں 1 تھیں۔ ولا ان کم استعدادوں کی مجال سے اس قدر گرم جولانی جملہ محالات سے ہے۔ آخر الامر شیخ ابراہیم ذوق نے ایک قصیدہ اسی زمین میں حضرت ظل سبحانی، سایۂ رحمت ربانی محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ کی مدح میں لکھا۔ اور وہ دن وہ تھے کہ حضرت بادشاہ ہنوز مسند ولی عہدی پر متمکن تھے۔ کہتے ہیں کہ اس قصیدے میں نہایت شوکت الفاظ اور جودت

معانی صرف کی تھی، لیکن جس وقت وہ قصیدہ پڑھا گیا تھا، بزم مشاعرہ برہم ہو گئی تھی اور سوائے شاہ نصیر اور دو چار اور سامع کے اس مجلس میں موجود نہ تھا۔ اس واسطے اس کالطف زبان زد ارباب شہر نہ ہوا اور بعد چند روز کے وہ جلسہ برہم ہو گیا۔

1۔ جدید قواعد کے مطابق 'ہوتی تھیں'۔

قصہ مختصر عرصہ چند سال کا ہوا کہ منشی فیض پارسا تخلص نے دامن روح مقدس کو آلائش خاک سے پاک کیا۔ یہ دو شعر ان کے مسموع ہوئے:

نت ہے فریاد و فغاں، گریہ و زاری ہے مدام
کاش انساں نہ ہمیں حق نے بنایا ہوتا
کوئے الفت کے خاکسار اے دل
مثل آئینہ صاف طینت ہیں

پارسا

پارسا تخلص ہے ایک مرد رند وضع، اوباش طور، بے باک طرز غلام علی نام کا۔ یہ مثل اس جگہ راست آ گئی 'برعکس نہند نام زنگی کافور' اب تک تقاضائے شباب جوش وخروش پر ہے۔ رفتہ رفتہ کچھ عجب نہیں کہ راہ مستقیم ہدایت پر گام زن ہو کر اسم بامسمیٰ ہو جائے۔ گاہ گاہ ہم صحبتان لاابالی سے فرصت پا کر راقم کے پاس آ جاتا ہے اور ایک دو غزل ریختہ کہہ کر لاتا ہے۔ طرز گفتگو اور صفائی روزمرہ سے پایا جاتا ہے کہ کسی کی اعانت کے بغیر نہ ہو گا لیکن جو کہ آدمی ذہین اور تیز فہم ہے، کیا عجب ہے کہ وہ کلام صرف اسی کا نتیجہ فکر ہو۔ ان دنوں میں ایک فقیر قلندر مشرب کے ہمراہ کسی طرف راہی ہو گیا ہے، اس واسطے صرف دو تین شعر کہ جزودان حافظہ میں محفوظ تھے،

درج اوراق ہوئے:

جو دوانے ہیں اس پری رو کے
ان کو کیا کام ہوشیاری سے
آب میں رشک سے ہے غرق لہر
اس کے دنداں کی شرم ساری سے
نام کو پارسا ہوں میں لیکن
مست ہوں نرگس خماری سے

پذیر

پذیر تخلص، خلف گلزار علی اسیر اکبر آبادی۔ اس کے نام سے اطلاع نہیں۔ سنا گیا کہ باوجود حداثت سن اور نوزادگی کے طبع رواں اور فکر رسا رکھتا ہے۔ یہ شعر اس کے نتائج افکار سے ہے:

دیوانے اپنے جامے سے باہر ہیں سب پذیر
اب فصل گل ہے چاک گریباں ضرور ہے

پریشان

پریشان تخلص، شخص فہیم، عبدالرحیم، مشہور پیرجی ازبس کہ صاف طینت ہے، حرفہ ہائے متعارفہ سے آئینہ سازی کو اختیار کیا ہے۔ شعر کی اصلاح احقر العباد سے لیتا ہے۔ دو شعر اس کے تحریر ہوتے ہیں:

کیا ہوئی ایسی خطا مجھ سے جو تو نے صیاد
کر کے آزاد کیا پھر کے گرفتار مجھے
دیتے ہو بوسہ دو، نہیں دیتے نہ دو، مگر

اتنی نہیں پسند چنیں اور چناں مجھے

پریشان

پریشان تخلص، منولال برھمن، شاگرد شاہ نصیر۔ زیادہ اس سے حال اس کا گوش زد نہیں ہوا۔ یہ دو شعر اس کے افکار سے ہیں:

خوباں کی ادا کوئی کب ناز سے خالی ہے
ہر بات پہ جھڑکی ہے ہر حرف پہ گالی ہے
ہم آئیں تو اٹھ جاؤ غیر آئے تو آ بیٹھو
یہ وضع نئی جاناں کیا تم نے نکالی ہے

پری

پری تخلص، ایک نوجوان جھمن نام کا ہے شاگردان مرزا رحیم الدین حیا سے۔ ریختی کا فکر کرتا ہے۔ سخن کا ربط وضبط مزے سے خالی نہیں۔ یہ چند شعر اس کی ریختی کے مرقوم ہوتے ہیں:

دنیا کے مردوئے مرے اوپر فدا ہوئے
مجھ آشنا مزاج کے سب آشنا ہوئے
اب کے تو مردوئے ہیں دغا باز، بے وفا
اگلے تماش بین، خدا جانے کیا ہوئے
دن کو ہی آنا تھا تجھے ماہ صیام میں
درگور مردوئے! مرے روزے قضا ہوئے

پناہ

پناہ تخلص، محمد پناہ نور باف، مرید با اخلاص شاہ آفاق غفراللہ لہما۔ معتبرین کی زبانی سنا گیا کہ بعض اوقات استقبال کی خبر ایسی درست اس کی زبان سے معلوم ہوئی کہ بعد وقوع کے سر مو تجاوز نہ ہوا۔ گاہ گاہ شعر متصوفانہ کہتا تھا۔ دس بارہ برس کا عرصہ ہوا کہ قصور فردوس میں خرامش کی۔ یہ ایک شعر اس کا مسموع ہوا:

موسیٰ کو نظر طور پر آیا تھا وگرنہ
دیکھا تو ہر اک سنگ میں وہ ایک شرر تھا

پورن

پورن تخلص، پورن سنگھ کاتیہ، ساکن قدیم شاہجہان آباد، شاگرد سعادت یار خاں رنگین۔ علم سنسکرت میں استعداد کامل اور طبابت ہندی میں مہارت تام رکھتا تھا۔ مگر بہ سبب بدمزاجی کے مردم بیمار کی طرف کم ملتفت ہوتا۔ ہدیہ و تحایف کو قبول نہ کرتا، اور باوجود اس کے کہ قوم کاتیہ سے تھا، صحبت شراب سے مجتنب رہتا۔ فارسی میں بھی بہ قدر ضرورت روشن سواد تھا۔ زبان ریختہ اگرچہ بہت شستہ نہ تھی لیکن بعض شعر سے طرز معنی بندی کی نمایاں ہے۔ آٹھ دس برس کا عرصہ ہوا کہ جہان فانی سے رحلت کی۔ راقم نے اس کی بیاض سے یہ چند شعر انتخاب کیے:

ہم نام رہائی سے بیزار ہیں اے ہمدم
دل چاہ زنخداں میں ہے جب سے اسیر اپنا

شمشیر تو وہ ابرو، اس دل پہ چلا بیٹھے
چھوڑ اے نگہ ظالم، تو بھی کبھی تیر اپنا

اس رہ میں روا رو ہی لازم ہے سدا پورن
سامان سفر رکھے طیار فقیر اپنا

پیچ و خم کاکل میں مت جائیو دل شب کو

اس راہ میں تو چل کر ہوئے نہ خجل شب کو

پیام

پیام تخلص، مولوی امین اللہ کہ سابق فرضیت جہاد میں ایک رسالہ زبان عربی میں تصنیف اور پھر زبان اردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اور مدت تک غازیان لشکر امام المسلمین، امیر المومنین، سید احمد مغفور کے ساتھ شریک حال رہے۔ اب ان کا حال دریافت نہیں کہ قید حیات میں ہیں یا انتقال کیا۔ یہ دو شعر ان کے یاد تھے مرقوم ہوئے:

جب کہ اپنی خبر نہ ہو اس کو
اس کو اوروں کی کیا خبر ہووے
پھونکتا ہے مجھی کو نالۂ دل
یار میں بھی تو کچھ اثر ہووے

پیام

پیام تخلص، مرزا حیدر بیگ، مولد و منشاء اس کا مغل پورہ ہے کہ ایک معمورہ ہے شاہجہان آباد سے ایک میل کے فاصلے پر، لیکن اب ایک مدت سے اسی خاک پاک میں ساکن اور کتخدائی کی تقریب سے یہیں متوطن ہے۔ گاہ گاہ شعر ریختہ کہتا ہے اور باوجود کم مشقی کے طبیعت خداداد کی اعانت سے، چاشنی سخن مزے سے اور بادۂ کلام لطف سے خالی نہیں۔ یہ دو چار شعر اس کے نتائج افکار سے ہیں:

مر جائے بھی کوئی تو تاسف نہ ہو اسے
پالا پڑا ہے آن کے کس سنگ دل کے ساتھ
اس آہ بے اثر نے کیا کچھ نہ کچھ اثر

کل پوچھتا تھا میری گلی کا نشاں وہ شوخ
دے گا تو کیا جواب نزاکت کہ کل پیام
بے تاب ہو گیا ترا سن کر فغاں وہ شوخ
مرے نالوں سے ہوا سینۂ گردوں افگار
کہ پڑا شام و سحر خون شفق ٹپکے ہے

پیر

پیر تخلص حال، مہاراج سنگھ برہمن، ساکن قدیم متھرا کہ اوایل میں جواں تخلص کرتا تھا۔ چوبھوں کی قوم میں اس قدر کم خوراک شگفت ہے، شبا روز میں ایک وقت تناول طعام کا اتفاق ہوتا ہے اور وہ بھی نوالۂ چند کے سواطبع کونا ساز، اور اشیاء نمکین کے سوا سب اطعمہ سے احتراز ہے۔ خط شکستہ کی 1 طرز بہت درست اور جلد نویسی میں چابک اور چست۔ اختلاط اس کا اہل اسلام سے نہایت چسپاں اور شکم بندگان حریص کی صحبت سے گریزاں ہے۔

1۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ء میں 'کا' ہے۔

وطن میں گاہ گاہ اور شاہجہان آباد میں غالب اوقات بود و باش کرتا ہے۔ احیاناً شعر بھی کہتا ہے۔ اس کے دو تین شعر ایک دوست نے میرے سامنے پڑھے تھے، تحریر تذکرہ کے وقت یاد آ گئے:

رات دن کا ہے ترا مشغلہ آرایش زلف
اس سے کیا تجھ کو کہ ہے حال پریشاں میرا
میں وہ خاکستر افسردہ ہوں جوں صبح کو پیر

داغ خورشید ہے اک اخگر سوزاں میرا
قبر پر فریادیوں کی اپنے تو ہر گز نہ جا
تیرا پیچھا کب چھٹا اس خاک دامن گیر سے

پیرا

پیرا تخلص اور نام ہے ایک سقے کا کہ اکثر بازار چاندنی چوک میں اور کبھی اور کہیں متردد ین بازار کو سہل قیمت پر پانی پلاتا ہے۔ اپنے آپ کو مجرم کا شاگرد بتاتا ہے۔ یہ شعر اس کا سنا گیا:

شوق گریہ کو کہو روئیے کس پاس کہ اب
نام کو بھی نہ رہا آنکھ میں قطرہ باقی

پیک

پیک کریم اللہ نام، پہلے زمرۂ چوب داران شاہی میں ملازم تھا، اب بسر اوقات نامہ بری اور قاصدی پر ہے۔ طبیعت فی الجملہ موزوں رکھتا ہے۔ یہ شعر اس کی زبان سے سنا گیا:

شوق سے جب کہ میں آتا ہوں ترے کوچے میں
مجھ سے لیتی ہے صبا تیزیٔ رفتار کو وام

باب التاء

تاب

تاب تخلص، نمک پاش زخم جگر میر حیدر، خلف زبدۂ خاندان سیادت میر محبت علی ساکن قدیم پانی پت۔ لیکن اب عرصۂ دراز سے یہی خاک پاک اس کا مسکن اور یہی حصار عافیت اس کے واسطے نشیمن ہے۔ علم موسیقی کو دھرم داس نام درویش دل ریش سے اکتساب کیا ہے۔ اور جو کہ ایام جوانی میں ایسے امور کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے اس کی صحبت کے اثر سے آزادی نے کچھ کچھ طبیعت بے پرواہ میں راہ پیدا کی ہے۔ اگر اسی طرح چند روز بسر ہوئے، ترک تعلق اور اختیار تجرید کچھ بعید نہیں معلوم ہوتا۔ حسن صورت اور حسن صوت دونوں اس مجمع محاسن میں جمع ہیں۔ گاہ گاہ فکر شعر بھی کرتا ہے۔ ایک روز اپنی غزل کے دو چار شعر راقم ہیچ مدان کے روبرو آہنگ موسیقی میں ایسی خوش الحانی سے گائے تھے کہ آب کی روانی اور ہوا کی وزش موقوف ہو گئی۔ مشتاقان دل فگار کے گریہ و آہ سے تعجب ہے کہ وہ اس وقت کیوں کر دریا سے زیادہ جاری تھا اور یہ کس طرح صرصر سے زیادہ رواں تھی؟ اس غزل کے دو شعر یاد آ گئے تھے، بطریق یادگاران اوراق میں مرقوم ہوئے:

میں تو تھا عاقل زمانے کا پر الفت کے طفیل
کوئی سودائی کہے ہے کوئی دیوانہ مجھے

کثرت دل ہر شکن میں دیکھ، غیرت سے موا
آفت جاں ہو گیا، زلفوں کا سلجھانا مجھے

تاب

تاب تخلص، مرزا الطاف اشرف خلف شاہ زادۂ والا تبار مرزا امداد بخت بہادر۔ یہ

شعر اس صاحب طبع کا سنا گیا:

دیا ہے ہم نے دل اے تاب کس بے مہر کو دیکھو
کہ پروا ہو نہ ہو اس کو اور اس پر اپنا دم نکلے

تابش

تابش تخلص، محمد جعفر الہ آبادی موطن، دہلی مسکن۔ حکام وقت کی قدر دانی سے بیشتر اوقات علاقہ ہائے معقول سے سرفراز رہا، اب ترک علایق اور اختیار گوشہ نشینی کی سعادت سے کامیاب ہے۔ گاہ گاہ شعر ریختہ کا فکر کرتا ہے۔ یہ دو شعر اس کے ایک دوست کی زبانی مسموع ہوئے:

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے
توبہ کچھ ہم کو سازگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو پر اے تابش
وہ ستم گر کسی کا یار نہیں

تاثیر

تاثیر تخلص، حافظ محمد حسین ساکن دہلی، تلمیذ خدا بخش خاں تنویر۔ موزوں طبع اور خوش فکر ہے۔ یہ دو تین شعر اس کے مرقوم ہوئے:

وہ ہوا پاس تو قابو میں دل اپنا نہ ہوا
ہائے مطلب تو ہوا، حسب تمنا نہ ہوا
بیمار کیا اور بھی اس کم نظری نے
ظالم ہمیں مارا تری بیداد گری نے
بت خانے کے خیال نے کعبہ جھکا دیا

الفت بتوں کی لائی کہاں سے کہاں مجھے

تارک

تارک تخلص، تارک ماسوا اللہ میر بقاء اللہ۔ تین بار سفر حجاز کی سعادت سے مستسعد ہو کر دفعۂ چہارم پھر تحصیل ثواب حج کے ارادے سے جہاز پر سوار ہوا تھا کہ ناسازیٔ آب و ہوا سے تپ ولرزہ عارض ہوا اور عین اشتداد مرض میں نماز عشاء کے تہیے 1 میں تھا کہ ندائے ''ارجعی''

1۔ نسخہ اول (ص ۱۷۱) 'تہیا'۔ نسخہ دوم (ص ۱۶۷ نول کشور ۱۸۸۲ء) 'تہیہ'۔

اس کے نفس مطمئنہ کے گوش میں پہنچی اور راضی برضا کعبۂ جان کا احرام باندھ کر کشادہ پیشانی حرم قدس کی طرف راہی ہوا 'انا للہ وانا الیہ راجعون'۔ یہ شعر اس قدسی نہاد، پاک سرشت کا ایک آشنا کی زبان سے سنا گیا:

میں وہ وحشی ہوں کہ جوں نکہت گل اے تارک
جب نکلتا ہوں تو کوسوں ہی چلا جاتا ہوں

تایب

تایب تخلص، شیخ محمد اکرم، متوطن پنجاب۔ مدت ہوئی کہ لباس درویشی بند پر راست کر کے خاک سر کوچۂ فقر کو خلعت سلطانی سے بہتر سمجھا۔ دوبار وارد شاہجہان آباد ہو کر راقم تذکرہ کے کلبۂ احزان کو اپنے قدم بہار توام سے رشک ارم کیا۔ تقدس ذات کو بیان کروں یا محاسن صفات لکھوں، مضامین عارفانہ ہر سخن کے پیرایے میں زبان سے آشنا اور معانی متصوفانہ ہر حرف کے لباس میں لب پر جلوہ فرما۔ تمنا تین

چار شعر اس کے افکار سے درج تذکرہ ہوتے ہیں:

پردہ بر خسار خویش بستہ چہ آئی، مگر
طاقت دیدار نیست تایب دل خستہ را
دیدہ میزند ابت 1 تا ز خواب بر خیزی
می کند نفس فریاد، تا شتاب بر خیزی

1۔ نسخہ اول (ص ۱۷۲) اور نسخہ دوم (ص ۶۸ نول کشور ۱۸۸۲ء) میں اسی طرح ہے؟ غالباً 'آبیت' ہے کیوں کہ سوئے ہوئے کو پانی کا چھینٹا دے کر جگایا جاتا ہے۔ (فائق)

سحر گہ چوں دل زارم شکستی
شب آں عہدے کہ با من بستہ بودی
بایں زودی چہ جستی از بر من
مگر عہدے بہ دشمن بستہ بودی

تپش

تپش تخلص ہے نوجوان خوش مزاج، پسندیدہ اطوار، یوسف علی نام کا۔ ذہن کی رسائی اور فکر کی کاوش اور معنی کی تلاش اور طبیعت کی مناسبت میں اقران و امثال سے ممتاز ہے اور ظرافت و بذلہ سنجی و خوش روی و نازک اندامی میں حریفان ہم نفس سے سرافراز۔ اصلاح شعر راقم ہیچ مدان صابر عجز طراز سے لیتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے افکار سے ہیں:

ہے رشک کی خوبی کہ ترے کوچے کی جانب

گر خضر کو بھی کہیے تو رہبر نہیں ہوتا
غصہ اٹھا اٹھا کے یونہیں بار بار کا

اے دل! مزاج تو نے بگاڑا ہے یار کا
اک روز اے تپش کوئی آفت اٹھائے گا

حسرت سے دیکھنا یہ ادھر بار بار کا
اضطراب دل سے کہتے ہیں تپش نے جان دی

روز کے جھگڑوں سے چھوٹا، مر گیا، اچھا ہوا
بے طرح پھنس گیا ہے مصیبت میں ہمدمو

آتا ہے رحم اس دل ناکردہ کار پر
دل کھینچتے ہیں اور کسی کو نہیں خبر

کرتی ہیں کام تیری نگاہیں نقاب میں
اظہار عشق، غیر کے آگے کیا تپش

رہتی نہیں تمیز تجھے اضطراب میں
کوئی مر جائے یا کوئی تڑپے 1

وہ تو خنجر کو آزما بیٹھے

تحیر

تحیر تخلص، مولوی غلام مصطفیٰ مہین خلف جناب کمالات مآب عالم تحریر، فاضل بے مثل ونظیر، جامع علم وعمل، معدوم العوض، مفقود البذل، گوہر شناس علم الیقین، مولانا مخدومنا مولوی محمد رفیع الدین غفر اللہ لہ ہر چند خلاف رسم خاندان علم رسمی سے بہرہ ور نہ تھا لیکن بہ سبب بزرگی آباؤ اجداد کے علماء روزگار اس کی خاک قدم کو سرمۂ چشم اور اس کے خاشاک رہگذار کو تاج سر کرتے تھے۔ ایک عرصہ ہوا کہ سفر آخرت

اختیار اور حوران خلد کو اپنے جمال کا محو دیدار کیا۔ کبھی کبھی اشعار اردو بھی اس کی زبان فیض ترجمان سے سامعہ نواز اہل علم و ہنر ہوتے تھے۔ از اں جملہ ایک شعر درج تذکرہ ہوتا ہے:

فکر اطفال کو ہے سنگ اٹھا لانے کی 2
آمد آمد ہوئی شاید ترے دیوانے کی

۱۔ نسخہ اول 'تڑپھے' (ص۱۷۲)
۲۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں 'اٹھالانے کی' ہے۔

تحسین

تحسین تخلص، محمد حسین خاں ساکن شاہجہان آباد جواب سعادت مند، کان حیا معدن حلم۔ چند سال سے کتابیں چھاپنے کا کارخانہ اپنے کاشانۂ دولت میں مقرر کیا اور اس مطبع کا نام مصطفائی رکھا ہے۔ ہر چند اس شہر میں کثرت مطبع اتنی ہے کہ حوصلہ شمار کا ان کی تعداد سے تنگ ہے لیکن اس ہوشیار طبع کے سلیقہ سے نسخہائے مطبوعہ کی صحت اور درستی خط مشہور آفاق ہے۔ پریس اس مطبع کا چرخ فلک ہے کہ ہر جنبش میں آثار عجیبہ اس سے صادر ہوتے ہیں اور سنگ اس پریس کا لوح محفوظ ہے کہ نظر و قایق نگر پر اسرار غریبہ اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔ گاہ گاہ شعر ریختہ اس صاحب طبع کی صافی طبع سے حکم آئینۂ مجلا کا پیدا کر کے مشتاقان معنی غریب کے سامنے چہرۂ مقصود سے نقاب کشا ہوتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے افکار گوہر نثار کا نمونہ ہیں:

آزار ہوا اس کو، مگر عشق بتاں کا
بے طور ہے نقشہ دل بیتاب و تواں کا
جب بت سے نہ راضی ہوں و بتخانہ سے کیا کام

تحسین چلو کعبے کو جھگڑا ہے کہاں کا
اے دل تو عشق کیجو مگر دیکھ بھال کر
عاقل کو چاہیے کہ کرے فکر دور کا

لب کی خوبی میں کیا سخن ہے پر
فتنۂ روزگار ہے 1 آنکھیں

کوئی کیوں کر بچائے جاں ہمدم
ایک خنجر گذار ہے آنکھیں

صیاد اس طرح جو نہ گرم عتاب ہو
کیوں آشیاں چمن میں ہمارا خراب ہو

تحسین ان کو دیکھتے جاتے تو ہو مگر
ایسا نہ ہو کہ جاں کو وہی پھر عذاب ہو

خیال بتاں دل میں رکھتے ہو تحسین
مگر تم بھی، رسوا ہوا چاہتے ہو

ہوئے ذلیل تو عزت کی جستجو کیا ہے
کیا جو عشق تو پھر پاس آبرو کیا ہے

اگر نہیں ہے تجھے ذوق مے کشی تحسین
تو تیرے ہاتھ میں یہ ساغر و سبو کیا ہے

یار کہوے کہ اٹھ مرے در سے
دل یہ کہوے یہیں رہا کیجے

تحسین

تحسین تخلص، علی مولا خاں ساکن شاہ جہان پور نوجوان ظریف مزاج، خوش طبع

ہے۔یاران جلیس سے

---

1 ۔نسخہ اول (۱۷۳) پر 'ہے' بجائے 'ہیں' پایا جاتا ہے، بعد میں بھی 'ہے آنکھیں' آتا ہے اور نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں بھی 'ہے' لکھا ہے۔

سریشم اختلاط اور دوستان موافق سے گرم ارتباط، حسن و جمال کا یہ عالم ہے کہ اگر اقتضائے جوانی سے خوبان دل ربا پر دل آ جائے، عاشقی سے معشوقی کی نوبت پہنچ جائے۔سخن کی رنگینی گل پر ناز اور کلام کی لطافت گوہر پر زبان دراز کرتی ہے۔ہر چند اشعار نازک اس نازک طبع کے بہت مسموع ہوئے لیکن بالفعل سوا اس شعر کے ذخیرۂ حافظہ میں نہ تھا، ناچار مندرج تذکرہ ہوا:

کیا لکھیں اور ذرا غور کریں آپ اے
ڈرتے ڈرتے یہ لکھا ہے کہ پڑھیں آپ اے

تدبیر

تدبیر تخلص، شیخ محب اللہ ساکن جون پور، مرد خلیق، خوش وضع تھا۔کسی تقریب سے وارد شاجہان آباد اور ایک محفل میں راقم سے ملاقی ہوا۔ہر چند دو چار شعر اس کی زبان گوہر نثار سے مسموع ہوئے تھے لیکن یہ شعر ناخن بہ دل زن تھا:

اور ہی کچھ ڈھنگ ہے اپنی گرفتاری کا ہائے
یوں تو زلفوں میں تری کس کس کا دل الجھا نہیں

تسکین

تسکین، زبدۂ خاندان سیادت، اسوۂ دودمان سعادت، میر حسین۔نسب اس

زبدۂ سادات کرام کا میر حیدر قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔ کتب فارسی کو جناب استادی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھا ہے اور جو کہ طبع نہایت موزوں تھی، شوق شعر گوئی نے غلبہ کیا۔ اول اپنے کلام کو شاہ نصیر مرحوم کی نظر اصلاح میں گذرانا۔ جب کچھ سلیقہ اس فن میں بڑھ گیا، سر رشتہ اصلاح کا چندے منقطع رکھا۔ لیکن پر اپنے سخن کی تکمیل کے واسطے مومن خاں سے اصلاح لینی شروع کی۔ رفتہ رفتہ مشق سخن کمال کو پہنچی اور طرۂ ایوان سخن کنگرۂ عرش تک۔ جو کج رفتاریٔ فلک اہل ہنر کی دشمن اور کملائے فن کی عدو ہے، تلاش معاش کے ذریعے سے سفر رام پور کا اتفاق ہوا۔ وہاں یا تو یہ آسمان نہیں یا اس وقت یہ بخل سرشت کسی اور امر خطیر کی طرف متوجہ تھا۔ رئیس رام پور کی قدر شناسی سے سلسلہ نوکری کا بہ قدر رفاہ حال منتظم ہو گیا۔ اس گل زمین کے معرا نے پا کی زبان اور خوش فکری کو قبول رکھا۔ بارہ سو اٹھ ست ہجری میں عالم شباب میں پیر زال دنیا کی صحبت سے بیزار ہو کر حوران بہشتی کی طلب میں روضۂ خلد کی طرف راہی ہوا۔ اسی سال میں چند روز پہلے مومن و عارف کے سانحۂ ناگزیر سے قدر دانان سخن کا سینہ داغ دار اور ہنر شناسوں کا دل افگار ہو چکا تھا کہ یہ واقعہ جان کاہ علاوہ رنج و ملال اور مزید اندوہ و کلال ہوا۔ قربان علی سالک نے تاریخ وفات اس طرح پائی کہ بہ طریق معما کے ان دونوں سانحۂ جاں گداز پر بھی اشتمال رکھتی ہے مصرع: ارم میں مومن و تسکین و عارف۔

ا۔ نسخہ اول (ص ۱۷۴) مصرعۂ نسخہ دوم (ص ۷۰ انول کشور ۱۸۸۲ء) مصرع۔

یعنی ان تینوں نام کے اعداد ارم کے اعداد میں شامل ہیں۔ یہ چند شعر اس صاحب طبع کے کلام سے انتخاب ہو کر مرقوم کیے گئے۔

دیکھیں کیا میری طرف یاد ہیں ان کو اپنی

چشمکیں غیر سے کرنی مجھے دکھلا دکھلا

بات کرنے میں جو ہر دم ہے حجاب آئینہ
دیکھتا کیا ہے مجھے بھی تو خود آرا دکھلا

جان دیتا ہے ہر اک بات کو تسکین کر یاد
تم نے کیا اس کو دیا اپنا سراپا دکھلا

رہنے والوں کو ترے کوچے کے یہ کیا ہو گیا
میرے آتے ہی یہاں ہنگامہ برپا ہو گیا

قسمت تو دیکھ جتنے کیے شکوے ہجر کے
ان کو گماں رہا گلۂ روزگار کا

کہتے ہیں رنجش ظاہر میں مزہ آتا ہے
یوں ہی تم مجھ سے ذرا ہو کے خفا مل جانا

تمہیں بھی کھولنی زلفیں پڑیں گی
دل گم گشتہ گر اپنا نہ پایا

ہزاروں مر گئے دیکھا جو عالم سوگ میں اس کا
لباس آیا تھا وہ کافر پہن کر میرے ماتم کا

تھا میری طرح غیر کو بھی دعویٰ الفت
ناصح تو اسے دینے کو الزام نہ آیا

بے بال و پری کھوتی ہے توقیر اسیری
صیاد یہاں لے کے کبھی دام نہ آیا

زندگی ہووے گی کس طور سے یارب اپنی
دم میں سو بار اگر یوں وہ خفا ہووے گا

گھر میں برہم ہے وہ فتنۂ دوراں ہمدم

مجھ پہ طوفان کوئی تازہ اٹھا ہووے گا
آف جو عرش پہ ہے اپنا دماغ اے ظالم
کوئی دشمن تری نظروں سے گرا ہووے گا
اتنی سرخی شفق چرخ میں کس دن تھی مگر
عاشق زار کا کچھ رنگ اڑا ہووے گا
حق کے کہنے سے نہیں ملتی ہے سولی منصور
تو نے دعویٰ کہیں الفت کا کیا ہووے گا
جنس دل کی مری کچھ قدر نہ ہو گی افسوس
تم وہ لیتے ہو کہ کر دیں جسے اغیار پسند
گر مر کے چھٹے دل کی طپش سے تو عزیزو
تا حشر نہ نکلیں گے کبھی گور سے باہر
کبھی کہتا ہوں وصل مشکل ہے
کبھی کہتا ہوں کچھ محال نہیں
یاں انتظار ہی میں کٹ مجھ کو ساری رات
واں وعدہ کیا کیا تھا انہیں یاد ہی نہیں
وہم آتا ہے مٹا کر خط پیشانی ہائے
اس میں لکھا نہ ہو اس در کی جبیں سائی کو
تھے جن 1 سے گمان دوستی کے
دشمن وہ ہوئے ہمارے جی کے

۱۔ نسخہ اول (ص ۱۷۵) 'جی سے' نسخہ دوم (ص ۱۷۱) 'جن سے'۔

اک خلق ہے تلخ کام سن کر
کیا شور ہیں اپنی بیکسی کے
دل دینے کو قتل ہی سزا ہو
قایل ہیں تمہاری منصفی کے

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلی دل
کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے
شب وصال میں سننا پڑا فسانۂ غیر
سمجھتے کاش وہ اپنا نہ راز دار مجھے
وہ اپنے وعدے پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں
نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گداز مجھے
مرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر
نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے
یہ کہہ کے شب ہجر میں کرتا ہوں تسلی
جو رنج و مصیبت ہے سو انساں کے لیے ہے
تیغ نگاہ یار اچٹتی لگی تھی پر
برسوں گذر گئے مجھے آزار کھینچتے

تسلی

تسلی تخلص، میر شجاعت علی شاگرد شاہ نصیر مرحوم۔ اوایل حال میں ولولۂ شباب و اقتضائے جوانی سے معاملہ بندی کی طرف متوجہ اور تلامذہ شاہ مرحوم میں جرأت عصر مشہور تھا۔ شعر خوانی کی طرز عاشق پیشگی اور وارستہ مزاجی پر دلالت کرتی تھی اور شعر پڑھنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اپنے حال کا افسانہ کہتا ہے۔ اب مدت سے

ترک ماسوا کر کے اکثر قدم پاک، مورد لولاک صلعم کی زیارت کو غنیمت کبریٰ جان کر اسی مکان برکت نشان کے گوشے میں نقش پا کی طرح پڑا رہتا ہے۔ عجب خوش طالعی اس مرد پاک سرشت کی ہے کہ اس کو ایسی درگاہ ملایک سجدہ گاہ کی خاک پاک کا صندل دنیا کے دردسر سے نجات دیوے۔ یہ دو شعر اس کے یاد تھے جو لکھے جاتے ہیں:

مجھ سے بدنام اے لوگ عبث کرتے ہیں
ہم نشیں وہ تو مرے پاس نہ آیا نہ گیا
اس طرح ملیے کچلیے تو یہ آفت ہو تم
گر تکلف کرو کچھ پھر تو غضب لاؤ اجی

تسلیم

تسلیم تخلص، حاتم خاں قوم سے افغان او رروسائے رام پور او رشاگردان علی بخش بیمار سے ہے۔ ذہن سلیم اور طبع مستقیم رکھتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے اشعار سے منتخب ہوئے:

شباب گیسوئے مشکیں کے عشق میں گزری
پھرا کیا میں خطا میں تمام شب بہکا
کچھ اس کے حق میں بلے ہوں گے وہ لب مے گوں
یہ بات کیا ہے کہ تسلیم بے سبب بہکا
پہلے اے غنچۂ گل منہ تو ذرا بنوا لے
کیجیو پھر دہن یار سے نسبت پیدا
کہربا کاہے کو اس طرح سے تنکے چنتا
تیرے دیوانے کی کرتا جو نہ رنگت پیدا

تشنہ

تشنہ تخلص، محمد علی نوجوان وارستہ مزاج، درویش وضع، گاہ عریانی کو اپنا لباس بے تکلف مقرر کرتا ہے اور کبھی لباس کو زیب بدن کر کے اہل روزگار کی تقلید کی راہ میں چلتا ہے۔ اصلاح شعر کبھی حکیم آغا جان عیش اور کبھی شیخ ابراہیم ذوق مرحوم سے لی ہے۔ یہ دو تین شعر اس کے مرقوم ہوئے:

نہ ہوں وہ لب جو کھلیں شکوۂ جفا کے لیے
وہ ٹوٹیں ہاتھ جو اٹھیں کبھی دعا کے لیے
ہوئی تھی ایسی کہاں کی صفائی اس بت سے
کہ آسماں نے عوض خاک میں ملا کے لیے
تمھاری ہم کو خبر کیا کہ ایک مدت سے
یہ بے خبر ہیں کہ اپنی خبر نہیں رکھتے

تشہیر

تشہیر تخلص، مرزا مغلی بیگ، ساکن شاہجہان آباد، شاگرد غلام مولیٰ عرف مولائی 1 بخش قلق، جوان نیک نہاد اور خاندان شرافت اور دودمان نجابت سے ہے۔ طبیعت رسا اور فکر بلند رکھتا ہے۔ یہ دو تین شعر اس کے مرقوم ہوئے:

مرے سینے کی آہ آتشیں بھی برق ہے گویا
کہ اک دم میں یہاں پھونکا تو اک پل میں وہاں پھونکا
کیا خاک نشیمن کوئی گلشن میں بناوے
گل خوش ہیں اگر ہم سے تو صیاد غضب ہے
خوبان جہاں یاد رہے تم کو بھی یہ بات

تشہیر بھی کم بخت اک آزاد غضب ہے

تصدیق

تصدیق تخلص، نواب مہدی حسین خان رئیس جون پور کہ بالفعل بنارس میں عہدۂ تحصیل داری پر مامور اور وضع داری کے ساتھ مشہور ہیں۔ اشعار فارسی کا فکر کرتے ہیں۔ یہ دو تین شعر ان کے یاد تھے سو لکھے گئے:

کارم بجاں رسیدہ و جاناں نمی رسد
می میرم و مسیح بدرماں نمی رسد
دریا بآب دیدۂ گریاں نمی رسد
با موج اشک شورش طوفاں نمی رسد
با نالہ ام کہ در چمن از سینہ می کشم
گل بانگ عندلیب خوش الحان نمی رسد

تصور

تصور تخلص، نبی بخش نواسۂ شاہ نصیر مرحوم۔ قلم اس کی اہلیت اور اخلاق کو لکھے یا تیزیٔ فکر و جودت طبع کو تحریر کرے یا تاسف جواں مرگی سے بزم احباب کو ماتم سرا بنا دے۔ یہ دو چار شعر اس کے بطریق یادگار مرقوم کرتا ہے:

اس کے خیال زلف میں کچھ سوجھتا نہیں
آنکھوں میں اپنی دن شب دیجور ہو گیا
ہم بھی مثال آئینہ ہیں تجھ سے سینہ صاف
دل سے ترے غبار اگر دور ہو گیا
کیا کیا خیال دل میں گذرنے لگے جو آج

دروازہ اس کا شام سے معمور ہو گیا
کس نے کہا تھا تجھ سے تصور کہ اس سے مل
دل اپنا دے کے آپ تو مجبور ہو گیا

عشق بازی اے تصور کھیل لڑکوں کا نہیں
جان کا اس میں بچانا کام ہے ہشیار کا
خواب کا بس کیا چلے اس دیدۂ بیدار پر
چور کو آتے نہیں دیکھا کبھی ہشیار پر
آبلوں نے پاؤں کے پانی چڑایا اس قدر
تشنگی سے پڑ گئے کانٹے زبان خار پر
اس کی باتوں نے زباں کے کر دیے ٹکڑے مری
لے گئی سبقت زبان یار بھی تلوار پر

تصویر

تصویر تخلص، میاں چمن نام، مرد خوش کردار، نیک نہاد۔ حالاں کہ سواد روشن نہیں رکھتا اور امی محض ہے لیکن طبیعت خداداد کی اعانت سے فکر موزونی سخن دامن گیر رہتا ہے۔ اور اس استعداد پر رشک امثال ہے۔ ہر چند باعتبار اصل ونژاد کے نجیب زادہ ہے لیکن زمانے کی تنگ چشمی اور فلک کی ناتو ان بینی سے پیشۂ نیچہ بندی کو حصول روزی کا ذریعہ کیا ہے۔ ہیہات یہ کیا سخن تھا کہ زبان سے نکلا اور یہ کیا حرف تھا کہ لب سے آشنا ہوا۔ غرض اس پیشے سے دل سوزیٔ عشاق اور مقصود اس حرفے سے چارہ گریٔ عاشق پیشگان آفاق ہے کہ نے قلیان کے پردے میں آہ جگر سوز کو سر کریں اور بدگمانی رقیب سے کلبۂ احزان میں یک چند فارغ البال بسر کریں، اور یہ کیوں نہ ہو کہ شیوۂ شاعری بے درد محبت نہیں ہوتا۔ دردمند کو ہم درد کا پاس ضرور ہے

اور ہر جگر سوختہ اپنے ہم داغ کی دم سازی میں مجبور ہے۔ یہ چند شعر اس کے مرقوم ہوئے:

کچھ نہ بن آیا تو شب کو آپ کہہ کر اپنے ظلم
بے مزہ رکھنے کو وہ میرے پشیماں ہی رہا
تو اپنی جان پہ کھیلا ہے عشق میں اس کے
یہ دل میں کیا ترے تصویر دل فگار آیا
بات بھی کچھ کی تو اس نے ذکر دشمن کا کیا
وائے قسمت وہ کھلا بھی ہم سے تو کیوں کر کھلا
فدا نا آشنائی پر تو ہیں لاکھوں دل و جاں سے
اگر وہ بت کسی کا آشنا ہوتا تو کیا ہوتا
کیا حال دل سناؤں یارا نہیں بیاں کا
مارا ہوا ہوں میں بھی اک جور آسماں کا
گر آج بھی نزاکت آنے تمھیں نہ دیتی
کچھ اور تھا ارادہ یاں جان ناتواں کا
صبر اس پر اس ہماری حسرت دیدار کا
بند جس نے کر دیا روزن تری دیوار کا
وہ بھی ہوں گے کہ جو آرام سے ہیں الفت میں
چین ہم نے تو نہ پایا ترے شیدا ہو کر
خاک بھی میں تو ہو کے دیکھ چکا
نہ گیا واں مرا غبار تلک
پوچھیو مت مزاج چل تو سہی
یار تصویر دل فگار تلک

تیرا اور اغیار کا سا ربط ہے
دل میں میرے اور ترے پیکان میں 1

ہم کو کرنا ہی نہیں شکوہ بے جا و بجا
اب تمنا ہی تری دل سے اٹھا دیتے ہیں

میں باز آیا تمہاری دوستی کی ان نگاہوں سے
مجھے بھی یوں دیکھو دیکھتے ہو جیسے دشمن کو

خلش کچھ تو رہے اے بخیہ گر اس میرے سینے میں
لب زخم جگر میں کاش سی دے رکھ کے سوزن کو

ا۔نسخہ۲(ص۱۷۴)میں(غلط)۔

مجھ سے کیا پوچھتے ہو غل پس دیوار ہے کیا
تم نے جھانکا تھا سو یہ فتنہ و شر اس کا ہے

رہا ہوئے پہ بھی ہم تو رہے قفس کے 1 ہی گرد
کہاں وہ جائیں کہ جو بال و پر نہیں رکھتے

ہزار رکھتے ہیں ہم دل پہ زخم اے تصویر
تری طرح سے تو ٹکڑے جگر نہیں رکھتے

کچھ مزا شور تبسم نے تمہارے ہے دیا
یوں تو زخموں پہ بہت ہم نے نمکداں الٹے

یہ بھی کوئی ہنسی ہے کہ رخصت کا لے کے نام
سو بار بیٹھے بیٹھے مجھے تم رلا چکے

بھرا آتا ہے جی تصویر سن سن کر تری باتیں

لگایا تو نے اے کم بخت دل کس آفت جاں سے
کیا پوچھتے ہو خاک میں کس نے صلا دیا
جو کچھ کیا سو آپ کے دل کے غبار نے
آج کی شب نہ خفا ہو ترے قرباں، ہم سے
کل تو لیوے ہی گی بدلا شب ہجراں ہم سے
کون موسیٰ تھا؟ کہاں طور؟ کسے غش آیا؟
ایک یہ بھی تھی مری جان شرارت تیرے

تعشق

تعشق تخلص، فاضل یگانہ، علامۂ زمانہ، سید مولوی محمد شاگرد رشید عالم محقق، تحریر مدقق، مولوی رشید الدین خاں

۱۔ نسخہ ۲ (ص ۱۷۵) ''ہی کے''۔

مرحوم۔ جمیع علوم متداولہ میں استحضار تمام، خصوصیات کتب طبیہ میں مہارت تام حاصل ہے۔ جو کہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کو قرابت قریبہ کے لحاظ سے ان کی ترقی کمال منظور تھی، امر معالجہ کے باب میں ایسے نکات عجیبہ اور فوائد غریبہ حاصل ہوئے کہ مشتاقان قدیم کو بعضے اوقات ان کی حسن تدبیر پر اتفاق تقدیر کا گمان ہوتا ہے۔ سابق کبھی کبھی شعر ریختہ بھی کہتے تھے اور حکیم صاحب موصوف کی نظر اصلاح سے گذرانتے تھے۔ شاہجہان آباد لطافت بنیاد میں حکام وقت کی قدردانی و ہنر شناسی سے مدرسے میں سو روپیہ مشاہرے پر طلبائے عربی کی تعلیم کے واسطے معین اور زمرۂ مدرسین مدرسہ میں مدرس اول ہیں۔ ہر چند اب بہ سبب توغل علوم شریفہ کے شعر

گوئی کی طرف اصلاً التفات نہیں، لیکن بہ سبب موزونی طبعی اور مذاق فطری کے جب کوئی شعر گوش زد ہو جاتا ہے، عنان طبیعت بے اختیار ان مسائل غامضہ سے اس شعر کی جانب معطوف ہو جاتی ہے۔ اشعار قدیم سے یہ چند شعر انتخاب ہو کر مرقوم ہوئے:

سنتا ہی نہیں بلبل بیدل کی جو گل آہ
کیا تو نے شگوفہ یہ صبا کان میں چھوڑا

وعدۂ شام تو کیا ہے ولے
کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا

تجھ کو اس میری آہ و زاری پر
رحم اے فتنہ گر نہیں آتا

تیرے بیمار کا ہے یہ عالم
ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تو اے پیاں شکن وعدے پہ کس دن میرے گھر آیا
سدا سنتے رہے یوں ہی کہ شام آیا، سحر آیا

کہوں کیا حال اے گل رو تری فرقت میں آنکھوں سے
کبھو خوناب 1 دل ٹپکا، کبھی لخت جگر آیا

خواب راحت سے جگا کر اس کو لے آئی یہاں
کام آئی ہم دمو اس آہ کی تاثیر، رات

کہتے نہ تھے تعشق مت جاؤ اس گلی میں
آئے نہ واں سے دیکھا خوار و تباہ کیوں کر

رویا کیا سحر تک میں رشک سے عزیزو
ہنستے سنا جو اس کو غیروں سے انجمن میں

ہوتے ہیں دل کے ٹکڑے آتا ہے یاد جس دم
کچھ چپکے چپکے کہنا اس کا لب و دہن میں
کس پری سے ہے تعشق گرم جوشی ان دنوں
پھر فزوں ہم کو نظر آتی ہے وحشت آپ کی

تفتہ

تفتہ تخلص، منشی ہوگوپال متوطن سکندر آباد، عہد طفولیت سے سخن گوئی کی طرف مایل ہے۔سنا گیا کہ اشعار فارسی سے دیوان ضخیم فراہم کیا ہے۔راقم آثم تک سوا اس ایک شعر کے نہیں پہنچا۔اگر یہی طرز گفتگو ہے تو نہایت

ا۔نسخہ۲(۱۷۶) خوں ناب۔

خوش فکر ہے۔

ای نالہ سوے چرخ مرو گرم مرو گرم
با پیر نہ زیبد سر آزار جواں را

تمنا

تمنا تخلص، عبدالرحمان نام، برادر حقیقی مولوی محمد حسین ہجر، قصبہ جیور 1 کے قاضی زادوں میں سے ہے۔مدت تک شاہجہان آباد میں قیام پذیر ہو کر تحصیل علم فارسی نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولانا و مخدومنا مولوی امام بخش صہبائی کی خدمت میں کی اور فارسی شعر کی اصلاح بھی جناب ممدوح سے لی۔سخن بہت خوش اسلوب،طبیعت سلیم یہ چند شعر اس کے نتایج طبع سے ہیں:

این قدر آشفتگی ہر دم چرا بودے مرا
آشنا گر آں بت نا آشنا بودے مرا
سبحہ ہم زنار دارد گر گسستم باک نیست
من برہمن می شدم گر بت خدا بودے مرا
محو بے دار تحیر نفس است
شکر بر آئینہ بے دادم نیست
پرسش حال من از چشم کسے مے آید
غم بیمار ز بیمار بسے مے آید
دست از زندگی خویش تمنا بردار
کز پی قتل مسیحا نفسے مے آید

ا۔نسخہ دوم (۱۷۶) جیپور۔

در باغ نیز حسرت آغوش میدمد
بوئے سمن ز صبح کنارش سخن کند
بس کہ ہر حرف از سر بے تابی دل می طپد
نالہ بر بال کبوتر ہم چوں لبسمل می طپد
در جہاں آئین شفقت باعث رنج دل است
موج ہا پیوستہ در آغوش ساحل می طپد
مردیم و فکر زلف تو از ما نمی رود
سر رفت لیک جوشش سودا نمی رود
ہنوز از خانہ زنجیر بانگ نوحہ می آید

طلب گار تو بعد از مرگ دارد ماتمے دیگر

بزیر چشم خوباں زندگی کردم نہ دانستم

کہ ساقی می کند در جام من ہر دم سمے دیگر

دریدم پیرہن و ز بوی آں گل پیرہن آخر

بہ ذوق بے خودی چاک گریبان سحر گشتم

تمنا

تمنا تخلص، مرزا مغل جان۔ چند مدت سے مقیم آگرہ اور مصاجت راجا بلوان سنگھ بہادر راجا تخلص والی کاشی سے ممتاز ہے۔ اشعار ریختہ مرزا حاتم علی بیگ مہر کی نظر اصلاح سے گذرانتا ہے۔ یہ دو شعر اس کے اشعار سے انتخاب ہوئے:

جام سفال جلوۂ مے سے دمک گئے

پر تو سے آفتاب کے ذرے چمک گئے

بغل میں مے کشوں کی ہیں شراب ناب کے شیشے

لیے بیٹھے ہیں پریوں کو یہاں مے خوار پہلو میں

تمنا

تمنا تخلص، مرزا غیاث الدین ابن مرزا شمس الدین ابن حضرت فردوس منزل شاگرد حافظ قطب الدین مشیر۔ یہ چند شعر ان کے نتائج طبع سے ہیں:

جو آنکھ چراتے تھے لگے کرنے اشارہ

ہووے گی ابھی آہ کی تاثیر ہوئی کیا

تھامے ہوئے دل بیٹھے ہو کیوں آج تمنا

دل دل پہ جو رکھتے تھے وہ تصویر ہوئی کیا

اے تمنا دل پہ کیوں رکھے ہوئے ہو ہاتھ تم
پھر کہیں کیا دل لگا، عشق بتاں پیدا ہوا

چھپے کیا عشق تیرا غم ستائے بن نہیں رہتا
زباں پر نام بے تابی سے آئے بن نہیں رہتا

تمکین

تمکین تخلص، میر سعادت علی ساکن قدیم عظیم آباد، وارد حال دہلی۔ زبان پاکیزہ اور اشعار دل چسپ رکھتا ہے۔ سن پچاس سے متجاوز اور طبیعت میں ظرافت مضمر ہے۔ یہ چار پانچ شعر اس کے لکھے جاتے ہیں:

درد و غم رنج و اضطراب و قلق
حال کہیے بیاں تو کس کس کا

کان رکھ کر بات غیروں کی سنا کرتے ہو تم
کاش کے ہم بھی نہ ہوتے تم سے صورت آشنا

گر نشہ ہے یہی نگہ میں تری
مے کے پینے کی احتیاج نہیں

نام تمکین ہوا تو کیا ہمدم
رات دن بے قرار رہتا ہوں

مہر و الفت کا ثمر ہے مہر و الفت دہر میں
پر محبت سے مری تم اور دشمن ہو گئے

تمیز

تمیز تخلص، نواب احمد علی خاں۔ خوش خلق اور نیک نہاد۔ فکر سخن میں اکثر امثال و

اقران سے بہتر بہ نسبت غزل کے سلام و مرثیے کا فکر بیشتر دامن گیر رہتا ہے۔ اس زمانے سے پہلے ریاست اور حکومت بہادر گڑھ اور اس کے مضافات کی جو شاہجہان آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر اور بالفعل تحت حکومت نواب بہادر جنگ خان بہادر ہے، انہیں کے خاندان میں چلی آتی تھی۔ نواب امیر علی خان مرحوم کی بعض بعض ادائے ناخوش سے کہ مسند نشین حکومت تھا، وہ ریاست اس خاندان سے منتقل ہو گئی، لیکن اب تک بھی اس پرگنے سے کچھ جاگیر بہ قدر مدد معاش معین ہے۔ سکونت ان کی بیشتر شاہجہان آباد میں اور گاہ گاہ بہادر گڑھ میں ہوتی ہے۔ یہ تین شعر ان کے انتخاب ہو کر مرقوم ہوئے:

اب تو زمیں یہ پکڑی ہے محشر ہی کیوں نہ ہو
جنبش کریں گے ان کے نہ پر آستاں سے ہم

کس کی رخش گرم سے پامال میری خاک ہے
آج تک رویدگی جو قبر پر ہوتی نہیں

جذب دل سے لائیے کس طرح اس کو کھینچ کر
آہ میں تاثیر اپنی اس قدر ہوتی نہیں

تنویر

تنویر تخلص، خدا بخش خاں نام، شاگرد رشید حافظ قطب الدین مشیر، زمرۂ خواصان حضرت خلافت مرتبت ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ دام سلطنتہ میں منسلک ہے۔ خوش اخلاقی و نیک نہادی ایک شیوہ ہے کہ دست قدرت نے اس کی ذات میں ودیعت رکھا ہے۔ نشق سخن یہاں تک پہنچی ہے کہ شرایط شعر سے سمجھ کر ارادے کو افکار گوہر نثار سے متعلق کرتا ہے۔ والا اگر ارادہ کرے تو بے ارادہ قامت سخن حلیۂ موزونی سے دایما متحلّی ہوتا رہے۔ یہ چند شعر ان کے نتائج فکر سے ہیں:

سیکھ لیں اس نے بھی اس عہد شکن کی باتیں
کہ ٹھہرتا ہی نہیں دل کسی عنواں میرا

دل میں نشتر ہی چبھا کرتے ہیں ہر دم تنویر
لے چکے دم وہ کہیں کاوش مژگاں میرا

یہ نہ جانا تھا ہمیں کو ہوئے گا آزار یہ
سنتے تھے ہم عشق بھی ہے نام اک آزار کا

دیکھا اسے دریا میں تو بے تاب ہی دیکھا
غربت سے زیادہ نظر آیا وطن موج

جان کھائی مری ان پوچھنے والوں نے اور
کیا کہوں کہنے کے قابل ماجرائے دل نہیں

خدام حشر اپنے گریباں کریں گے چاک
یوں ہی چلو گے واں بھی جو دامن سنبھال کے

چہرہ سفید آج ہے، تنویر خیر ہے؟
سچ تو کہو کہ غم میں ہو کس مہ جمال کے؟

تنہا

تنہا تخلص، شخصے معروف بہ آ کا، قوم قصاب، مروت و آدمیت سے احباب کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے کہ جو مرد قصاب نے بدیع الزمان کے حق میں نہ کیا ہوگا۔ گو سپند کے ذبح کرنے کو راہ معشوق میں اپنے خون کا فدیہ ٹھہرایا ہے۔ یا قتل رقیب کی مشق کے واسطے حیوانات پر ہاتھ صاف کرنا پسند آیا۔ پارہ ہائے گوشت اور قطرہ ہائے خون اس کی دکان دل پسند میں ہیں یا لخت جگر و اشک سرخ کے مضامین بیت باند میں۔ یہ دو تین شعر اس کے مرقوم ہوئے:

تاب گہر تو پہنچے نہ دنداں کی آب کو
اور لب کریں خجل ترے برگ گلاب کو
دیدے کے وصل یار کا مژدہ بتاؤ تو
بہلائیں کب تلک دل خانہ خراب کو
اب نامہ بر بنائیں گے ناصح کو، جی میں ہے
معقول آدمی تو ہو کوئی جواب کو

توقیر

توقیر تخلص، عبدالقادر، متوطن نواح پنجاب۔ چند روز سے وارد شاہجہان آباد تھا۔ جوان وجیہ، خوش مزاج، مرنج مرنجان، فکر سخن بلند، زبان شستہ و پاکیزہ، معنی یابی کا سلیقہ خوب، طبع نہایت رسا۔ قریب ایک سال کے گذرتا ہے کہ عالم باقی کو راہی ہوا۔ یہ اشعار اس کے مرقوم ہوئے:

توپیر دل رمیدہ پھر آوارہ ہو گیا
کس نے سنا دیا اسے مژدہ بہار کا
واں نمک کا بھی صرفہ ہے توقیر
زخم کھانے کا کچھ مزا دیکھا
مجھ کو کیوں دیکھا بت ناآشنا کو دیکھ کر
ناصحو دیکھو کہ کچھ کہنا خدا کو دیکھ کر
انتظار نامہ بر میں اس قدر بے ہوش ہوں
جان تن میں آ گئی پیک قضا کو دیکھ کر
زخمی تری نگاہ کے آخر کو مر گئے
کہہ کہہ کے ہائے ہائے جگر ہائے ہائے دل

ہم تو خاطر سے تری غیروں کو بھی تعظیم دیں
رشک پر کہتا ہے بیٹھو، اپنی یہ عادت نہیں

بتوں کو چاہنا اور حضرت توقیر یہ صورت
بظاہر تو نظر آتے ہو تم، مرد مسلماں سے

توفیق

توفیق تخلص، میر توفیق علی، متوطن قدیم آگرہ، اور اب مدت سے خاک شاہجہان آباد کو شرف قدوم سے مشرف رکھتا ہے۔ زبان بھاکا میں مہارت تام اور دہرہ و کبت کی تصنیف میں قدرت تمام حاصل ہے۔ پچاس ہزار دہرہ اس کی لوح حافظہ پر مرقوم ہے۔ بندش الفاظ اور بلندیٔ معنی اور جدت تشبیہ اور حسن استعارہ میں کبیشران قدیم سے قدم آگے بڑھایا ہے۔ گاہ گاہ فکر ریختہ بھی کرتا ہے۔ اس وقت یہ شعر یاد ہے:

دشمنوں سے آہ بے مہری کا کیا کیجے گلہ
دوست ہی ناآشنا ہے، بے وفا بے دید ہے

تہور

تہور تخلص، مرزا غلام فخر الدین، برادر حقیقی راقم، جوان متین اور نیک نہاد تھا۔ مضامین شستہ اس طرح حاضر وقت رہتے تھے کہ ادھر زبان خامہ متحرک ہوئی اور ادھر زہرہ جبینان معانی شبستان کاغذ میں خیل خیل جلوہ گر ہو کر تماشایان معنی دوست کی دل ربائی میں آمادہ ہوئے۔ اکثر جناب احسان علیہ الرحمۃ سے اصلاح لی ہے اور گاہ گاہ مومن مرحوم سے۔ عین عنفوان جوانی میں اس تنگ نائے فانی سے عازم ملک جاودانی ہو کر اس مغموم و گریاں کے دل سوزاں پر مانند لالہ داغ رکھا، خدا

مغفرت نصیب کرے۔ یہ چند شعر اس سے یادگار ہیں:

تجھ سے کیا شکوہ ہے، جی میں یہی آتا ہے کہ میں
دل سے سمجھوں کہ تجھے اس نے دیا، کیا سمجھا

سنتے ہی نام غیر تہور بھی ہے غضب
اس جنگ جو سے لڑنے کو تیار ہو گیا

لے آئے ذرا خط کو جواب، اس سے کسی ڈھب
افسوس کہ قاصد سے اب اتنا نہیں ہوتا

آیا نہ ترے گوہر دنداں کے مقابل
شہرہ ہی سنا کرتے تھے ہم دُرِّ عدن کا

ناصحا پند و نصیحت تو نہ کر محفل میں
یاں مرے ساتھ کوئی اور بھی رسوا ہو گا

پھر خدا لائے اسے یادش بخیر
کیا تہور بے تکلف یار تھا

گر تہور کو نہیں شوق شہادت قاتل
کیوں ترے آگے جھکائے ہوئے گردن آیا

اب ہے کیا باقی جو ہے کاوش تری دشت جنوں
چاک داماں ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا

رشک دشمن کا سبب عشق میں کیا ہے ناصح
امتحاں کیجیے مشفق کہیں شیدا ہو کر

تیمور

تیمور تخلص، گل بن حدیقۂ بخت مندی، مرزا سعادت سلطان طال عمرہ ابن برادر

مہربان مرزا قادر بخش موزوں تخلص، خسر پور راقم آثم۔ اس نخل سرا بستان جوانی۔ ریحان شباب وریعان جوانی سے تازہ بہرہ مندی حاصل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ثمرات زندگانی سے عمر طبیعی تک کام یاب رکھے۔ اکتساب علم فارسی میں عمر عزیز کمال محنت کے ساتھ صرف کرتا ہے۔ ثمرہ اس مشقت کا یہ ہے کہ چند روز میں فکر رسا اور طبع سلیم کی اعانت سے سواد روشن ہوگئی اور تحریر عبارت میں ملکۂ معقول بہم پہنچا۔ ریختہ گوئی کا شوق تازہ پیدا ہوا ہے۔ اگرچہ اوایل میں کچھ غزلیں جناب غفران مآب حضرت حافظ احسان علیہ الرضوان کی نظر فیض اثر سے بھی گذرانی تھیں، اب راقم کم سواد سے اصلاح لیتا ہے۔ چند شعر اس کے نتائج افکار سے منتخب ہوکر درج تذکرہ ہوئے:

اس چمن زار میں جوں شبنم و گل اے گل رو
کبھی خنداں مجھے ہونا کبھی گریاں ہونا

مہکے گی یونہی بزم جو زلفوں سے تمھاری
لینے کا نہیں نام کوئی مشک ختن کا

اس سادہ مزاجی پہ بھی مرتے ہیں ہزاروں
اللہ رے عالم ترے بے ساختہ پن کا

کرتا ہے جیب، عاشق دیوانہ تار تار
ہر رات تیری زلف معنبر کو دیکھ کر

روتا ہوں اپنی بے پر و بالی پہ باغباں
فصل خزاں میں بلبل بے پر کو دیکھ کر

ضبط نالہ کیا تو جان گئی
اپنا گویا میں آپ قاتل ہوں

باب الثاء المثلثہ

ثابت

ثابت تخلص، صاحب طرز متین، مرزا معز الدین مرحوم، خلف الصدق حضرت فردوس منزل شاہ عالم بادشاہ انار اللہ برہانہ، شاگرد حافظ عبدالرحمان خان احسان غفر اللہ لہ۔ فن سخن میں کامل اور تلامذۂ حضرت مرحوم میں اس کو منصب استادی حاصل تھا۔ اولاد تیموریہ میں بیشتر اسی صاحب طبع کی شاگردی سے ممتاز ہیں۔ راقم خردسالی میں اس کے جمال باکمال سے مشرف ہوا تھا۔ یہ چند شعر اس کے کلام سے انتخاب ہوئے:

شبنم کی طرح اس چمن دہر میں ثابت
جز گریہ ہمیں اور تو کچھ کام نہ آیا

آفریں دل کو ترے ثابت وگرنہ بار عشق
نے زمیں سے اٹھ سکا نے آسماں سے اٹھ سکا

تھا قلق اور بے قراری رات
مجھ کو روتے کٹی ہے ساری رات

لگایا تیر جو تم نے فقط کلیجے میں
ہر ایک عضو ہے میرا جدا جدا دل گیر

انصاف سے کہہ محتسب اس ابر و ہوا میں
کس طرح سے ہو ساقی گل فام فراموش

ناتوانی سے یہ حالت ہے کہ جاتا ہوں کہیں
اور اڑائے لیے جاتی ہے ہوا اور طرف

سر مرا کاٹ کے تو ہاتھ نہ دھو، تا کہ رہے
منزلت خوں کو مرے رنگ حنا کے نزدیک

آہ گر پردہ نشیں وہ بت خود کام نہ ہو
دیر میں کفر نہ ہو، کعبے میں اسلام نہ ہو

ثابت

ثابت تخلص، شیخ ثابت علی ولد شیخ محمد علی ساکن نواح پورب۔ بالفعل سرکار راجا بھرت پور میں ملازم اور چند روز سے سرانجام فرمایش سرکار مذکور کی تقریب سے وارد شاہجہان آباد ہے۔ ہر چند زبان شعر فصیح ہے لیکن روزمرہ گفتگو کا اس سے زیادہ تر دل چسپ ہے۔ یہ دو تین شعر حسب اتفاق اس کی زبان گوہر بیان سے مسموع ہوئے:

آنے کی کس کے کیا سنی ہے
جان لب پہ ٹھہر گئی ہے آ کر
کہتے ہیں وہ بے وفا اب آیا
کہنے ہی کی بات ہے سنا کر
ثابت کا ہے حال غیر کل سے
تم بھی اسے دیکھ آؤ جا کر

ثبات

ثبات تخلص، مہر علی، متوطن قدیم بڑھانہ اور ساکن حال دہلی۔ جوان وجیہ و خوش رو۔ اگرچہ عمر عزیز کو صحبت رنگین طبعان ظریف مزاج میں رائگان بہت کھویا ہے لیکن نجابت ذاتی کی کشش سے تحصیل علم کی طرف مایل اور کسب معاش کی جانب متوجہ ہوتا جاتا ہے۔ اشعار سودا و میر سے ہزار دو ہزار گنجینۂ حافظہ میں فراہم رکھتا اور انہیں اشعار کی نیرو اور موزونی طبع کی مدد سے آپ بھی گاہ گاہ غزل یا قطعہ کہتا ہے۔

بندش الفاظ اور ربط معنی گواہ حسن طبیعت اور شاہد جودت فکر ہے۔ یہ دو تین شعر راقم تذکرہ کے روبرو پڑھے تھے، ان کو درج اوراق کیا:

شب کو جو میں نے زلف کو چھیڑا تو یوں کہا
مار سیہ کو ہاتھ لگانا نہ چاہیے
دیکھا مجھے تو ہو کے خفا غیر سے کہا
اس بزم میں ہر ایک کو آنا نہ چاہیے
کھل جائے گا وہاں کس و ناکس پہ راز عشق
اے دل اس اضطراب سے جانا نہ چاہیے

ثروت

ثروت تخلص، میر محمد مشاہد ساکن نارنول سابق والی جھجر کی سرکار میں سر رشتہ روزگار کا درست رکھتا تھا، اب شاہجہان آباد میں تلاش معاش کے واسطے مقیم ہے۔ اخلاق پسندیدہ او راطوار حمیدہ اس صاحب مروت کے اندازہ تحریر سے خارج ہیں۔ اشعار میر وسودا و درد کے حد سے زیادہ گنجینۂ حافظہ میں مخزوں رکھتا ہے، اور ان اشعار کی اعانت سے آپ بھی موزوں کرتا ہے۔ یہ دو شعر اس کے تذکرے میں مندرج ہوئے:

داغ ہے لالہ کے دل میں روئے زیبا دیکھ کر
پا بہ گل ہے سرو اس کا قد رعنا دیکھ کر
کیا بلا ہوتی ہے آفت رشک کی ہمدم کہ میں
مر گیا اغیار سے ربط اس پری کا دیکھ کر

ثریا

ثریا تخلص، سید امیر علی گوپاموی، نوجوان سعادت منش و نیک روش ہے، اور بیشتر اوقات تحصیل علم و تکمیل فن وطب میں مصروف ہے۔ گاہ گاہ شعر ریختہ بھی موزوں کرتا ہے۔ یہ دو شعر اس کے وقت تحریر تذکرہ ایک آشنا کی زبان پر گزرے تھے سو درج اوراق ہوئے:

جھوٹے وعدے بھی یاں غنیمت ہیں
اس میں تسکین کچھ تو ہوتی ہے
مژدہ بوالہوس پہ دھیان نہ کر
جھوٹے موتی سدا پروتی ہے

ثمر

ثمر تخلص، نہال حدیقۂ مروت واہلیت، شجرۂ باغ سعادت و آدمیت، نوبادۂ گلشن جوانی، نوبر نخل زندگانی، صافی خمخانۂ امید، احمد سعید خلف سعد اللہ خاں۔ باوجود حداثت سن اور آغاز شباب کے خلق ذاتی اور اہلیت جبلی کا یہ حال ہے کہ اغیار کی دل شکنی ملت مردمی میں گناہ اور بیگانوں سے چشم پوشی کرنے کو بھی مذہب مروت میں کفر جانتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ پیشانی کریم پر چین کا ہونا نازیبا ہے۔ بہ سبب موج کے دریا کی عطا پر طعنہ زن ہے، اور اس خیال سے کہ اہل ہمت کی بخشش عام ہوتی ہے، صدف کی تخصیص سے ابر گوہر بار کے حوصلے میں سخن ہے۔ مولوی خلیل اللہ کی خدمت میں کہ تازہ وارد شاہجہان آباد اور علم فقہ میں کامل استعداد ہیں، تحصیل صرف ونحو اور تہذیب اخلاق میں سرگرم ہے۔ جو کہ موزوں طبع واقع ہوا ہے اور شعر سے مناسبت ذاتی ہے، کبھی کبھی سخن کی طرف ملتفت اور ریختہ گوئی کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ ہر چند اس فن میں نومشق ہے لیکن متانت کلام اور تازگی طرز 1 جو اس کو حاصل ہے، ایک امر ہے خداداد۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ یہ چند شعر صدق

کلام پر گواہ اور اثبات مدعا پر شاہد ہیں:

نگاہ مست سے ساقی کی یہ سرور ہوا
کہ دل سے حسرت مے کا خمار دور ہوا

مثال آئینہ ہم سے کھلی حقیقت حسن
کہ ہم کو دیکھ کے اپنا تجھے غرور ہوا

ہے آج تشنۂ خوں کس کا حسن پاک ثمر
کہ قطرہ قطرہ جگر میں مۓ طہور 2 ہوا

دیکھتا تھا حسن اپنا، مجھ کو آئینہ سمجھ
اور میں خوش تھا کہ بارے مہرباں مجھ پر ہوا

تھا تامل، امتحان عشق کے قابل ہے کون
بل بے ہمت، اس ضعیفی پر گماں مجھ پر ہوا

خلش مژہ نہ تھی کم کہ مرے زخموں پر
تبسم لب دل بر نمک فشاں ہوتا

۱۔ نسخہ ۲ (ص ۱۸۳) طرح۔ نسخہ اول میں حروف اڑ گئے ہیں طرز جو پڑھا گیا۔ (فائق)

۲۔ نسخہ ۲ (ص ۱۸۳) ظہور (غلط)۔

مکدر اس نے تو اتنا کیا غضب تھا اگر
مرے غبار کی جا دل میں آسماں ہوتا

نگاہ گرم کا تیری ہے کچھ اثر الٹا
کہ غیر پر پڑی اور دل جلا دیا میرا

ثنا

ثنا تخلص، مولوی ثناء اللہ، خلف شیخ کریم اللہ۔ کتب درسی میں مہارت تام اور حل دقایق میں قدرت مالاکلام ہے۔ سعادت منشی و نیک نہادی کے اوصاف تو حد اندازہ سے افزوں ہیں۔ اب چند مدت سے سفر حجاز کے ارادے پر بمبئی میں متوقف ہے۔ گاہ گاہ شعر بھی کہتا ہے۔ یہ ایک شعر اس پاک طینت کا یاد تھا سو تحریر کیا۔

خواب میں مجھ سے وہ بگڑا تھا یہ تعبیر تو دیکھ
کہ سحر سامنے آیا تو پشیماں آیا

ثنائی

ثنائی تخلص، مرزا عاشور بیگ خلف مرزا محمد اکبر بیگ مہندس ابن مرزا جیجوں بیگ بدخشانی۔ عربی و فارسی سے بہرۂ وافر اور ہیئت و نجوم میں دست گاہ تمام رکھتا ہے۔ قصاید عربی سے ہر چند دفتر دفتر ذخیرہ ہے لیکن شعر فارسی گاہ گاہ خواہ جوش طبیعت، خواہ تحریک احباؔ سے زبان قلم پر آ جاتا ہے۔ یہ ایک شعر ان چند اشعار سے کہ میری نظر سے گزرے، انتخاب ہوا:

از جفائے تو خزاں بر سر باغم زدہ اند
از ستم ہائے تو بچراغم زدہ اند

ثواب

ثواب تخلص، سعادت علی خلف میر شہاب الدین ساکن قدیم شاہجہان آباد۔ اب عرصۂ دراز سے کرنال میں مقیم ہے۔ اوایل میں بہ سبب روزگار مہین برادر خاک لکھنؤ میں عزت و اعتبار کے ساتھ بسر کی اور اہل سخن کی برکت صحبت سے شعر گوئی کی

طرف ملتفت ہو کر موزونیِ کلام پر قدرت بہم پہنچائی۔ اور جو کہ اکثر اہل فن سے ملتا تھا، وقت فرصت جس سے اتفاق ہوا اپنے سخن کو اسی کی نظر اصلاح سے مشرف کیا۔ اور ہنوز رطب و یابس کلام اور تقیر و قطمیر شعر سے بہ خوبی آگاہ نہ ہوا تھا کہ برادر شفیق نے سفر آخرت اختیار کیا اور وہ بہ سبب کم یابیِ معاش کے نواح دکن میں سرگردان رہا۔ اب مدت سے جمعیت خاطر بہم پہنچا کر پھر کرنال میں کسی تقریب سے زاویہ گزیں ہے۔ یہ تین شعر اس کے ایک دوست کی زبان سے مسموع ہوئے تھے سو درج تذکرہ ہوئے:

کبھی ہے مردگان غم پہ احساں معجز قم کا
کبھی حق نمک ہے زخم دل پر اس تبسم کا

ترے غم کی بدولت آگ یہ دل میں بھڑکتی ہے
کہ گر اک آہ کھینچوں آب ہو زہرہ جہنم کا

تپ دوری سے شعلے استخواں سے یوں نکلتے ہیں
بھڑکے جیسے ثواب آتش سے پارہ پارہ ہیزم کا

باب الجیم التازی

جان صاحب

جان صاحب تخلص ہے میر یار علی ساکن لکھنؤ کا۔ تمام عمر ریختہ گوئی میں صرف کی اور اگر انصاف کیا جاوے تو اس نے بہ نسبت انشاءاللہ خان اور رنگین کے ریختی کو آب و تاب خوب دی اور زبان کو شستگی اور بخشی۔ دیوان ریختی اس کا مشہور اور اکثر اشعار اس کے نوجوانوں کی زبان پر مذکور ہیں۔ یہ چند شعر اس کے دیوان سے منتخب ہوئے:

پھل دینی بھائی سے بھی نہ مجھ کو ملا بہار
دنیا میں کوئی اپنا نہ لاگو نظر پڑا

رنڈی کسی شرابی سے تیری لگے گی آنکھ
تعبیر سن جو خواب ہے دیکھا شراب کا

کیا ہم کو پڑی گو وہ زناخی کے گھر آیا
اچھا نہیں کرتا ہے اجی ذکر پر آیا 1

اے جان مرا خرچ ہے تنخواہ پہ رکھا
رنڈی سے تمہیں حیلہ حوالہ نہیں رہتا

۱۔ نسخہ ۲ (ص ۱۸۴) 'پر آیا'

لگی ہے آگ محبت کی دل میں آ کے بجھا
دوگانا جان، خدا کا ہے گھر جلا جاتا

میں بات کرتی جو اپنوں میں تم سے اے صاحب
ذلیل ہوتی وہ بندی تمہارا کیا جاتا

کس کے تم غم میں بن گئیں مردہ

اوئی، در گور، کیا یہ حال ہوا

1خوب بھڑکایا تھا اس کو سوت نے

میں ہوئی جب گرم ٹھنڈا ہو گیا

ماں باپ کا لحاظ بھی دل سے اڑا دیا

اے باجی آج کل کی ہیں سب لڑکیاں خراب

مجھے نفرت ہے صورت سے نگوڑے جان صاحب کی

وہ اس کی شکل کیا ہے اے بوا قربان کی صورت

میں گلہ کرتی نہیں کرتی ہو تم شکوا عبث

آج دفتہ پہلی باتوں کا ہوا کھلا عبث

چھوڑ دینا چار دن رکھ کر اگر منظور تھا

سارے عالم میں مجھے تو نے کیا رسوا عبث

2ماں سے ہم کو سوا ہے پیاری ساس

باجی دنیا ہو اور ہماری ساس

جوہر ان کے کھلے ہیں بہوؤں پر

چھریاں نندیں ہیں اور کٹاری ساس

3آج مجھ سے ہے تو کل اور سے مرزا اخلاص

ایسے ہرجائی سے ہو نوج نگوڑا اخلاص

۱،۲،۳۔اس سے پہلے ایک شعر کثافت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔

کیوں چڑھی آتی ہے ٹھکاری 1 سی سر پر باندی

بھوت لپٹا ہے جو کرتی نہیں مردار لحاظ

جب ہم سی ڈھونڈ لاؤ گے تم نیک پارسا
اس دن کریں گے آپ کو جھک کر سلام ہم

پاؤں بھاری کیا ہوا عہدی[2] سے بدتر بن گئی
دو قدم منزل ہے مجھ کو اٹھ نہیں سکتا قدم

رنڈی چل دور چھنے مجھ پہ یہ بہتان نہ کر
مرے بیری مرے دشمن ہوں گرفتار کہیں

ایک پر بیٹھ رہوں اور کسی سے نہ ملوں
ایسے بندی نے کیے ہیں نہیں اقرار کہیں

جان صاحب مری خاطر سے نہ کہنا تم نے
رنڈی دیکھی ہے دوگانا سی طرح دار کہیں

پاس ان کے گر نہ جاؤں میں تو لوگو کیا کروں
چین ہی لینے نہیں دیتا نگوڑا دل مجھے

جان نثار

جان نثار تخلص، میاں جی غلام فرید، ساکن فرید آباد کہ شاہجہان آباد سے دس بارہ کوس کے فاصلے پر واقع اور شرفائے عظام اور نجبائے کرام کا مولد و منشا ہے۔ اوقات عمر عزیز کو تعلیم اطفال میں بسر کرتے ہیں۔ ریختہ گوئی کا خیال بیشتر دامن گیر رہتا ہے۔ یہ شعر ان کے نتائج افکار

۱۔ نسخہ۲ (ص ۱۸۵) 'تھتکاری'

۲۔ احدی۔ سستی اور کاہلی میں ضرب المثل طبقہ جس کا تعلق غالباً اکبر کے عہد

سے ہے۔

سے ہے:

پیچ اس زلف سیہ کا ہم سے وا ہوتا نہیں
لاکھ ڈالیں پیچ میں اس کے اگر شانے کو ہم

جذب

جذب تخلص، میر عزت اللہ خان عرف میر بھکاری۔ ہر چند وطن آبائی بریلی ہے لیکن مدت سے خاک پاک شاہجہان آباد اس کی سکونت سے زبدۂ ربع مسکوں ہو گئی تھی۔ علوم رسمی سے آگاہ تو تھا لیکن بہ سبب کمی مزاولت کے ایک ملکہ سا باقی رہ گیا تھا، مگر علم مجلسی میں اقران و امثال سے بیشی رکھتا تھا۔ اکثر بلاد ہندو فارس کی سیر سے بہرہ اندوز ہوا، آخر کار بخارا کے قریب سفر راہ عدم اختیار کیا۔ یہ شعر اس کا گلشن بے خار سے منقول ہوتا ہے:

واں صفائی و خود نمائی ہے
یاں مری جان کی صفائی ہے

جراح

جراح تخلص، ناصر، کشمیری الاصل فن جراحی میں کامل۔ اگر چہ موافق اس بیت کے:

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

جراحت کو مرہم کے ساتھ فراہم کرنا لازم پیشۂ جراحی ہے لیکن اس کے نشتر 1 کا

مثل زخم غمزہ خوبان لاعلاج اور آب۲ نشتر اس کے مرہم کا جزو ترکیب تھا۔ مدت ہوئی کہ عالم فانی سے رحلت کی۔ کلام اس کا سوائے اس شعر کے کہ 'گلشن بے خار' میں مندرج ہے، راقم کو اور نہیں پہنچا:

جراح ٹانکے دینے میں مت کر درنگ تو
اس واسطے کہ زخم مرے۳ یار گرم ہے

جعفری

جعفری تخلص، میر باقر علی، کہین برادر حقیقی میر نظام الدین ممنون۔ علوم رسمی میں دست گاہ معقول اور صناعت طب میں مہارت تام تھی۔ چند سال ہوئے کہ تحصیل ثواب حج کے واسطے سفر مکہ اختیار کیا اور بعد معاودت کے راہ میں سفر آخرت درپیش آیا۔ اشعار اس یگانہ روزگار کے بہ سبب بے پروائی اعزہ کے دست یاب نہ ہوئے۔ ناچار یہ چند شعر ایک تذکرے سے منقول ہوئے:

جو ہر آن دل غم سر انجام ہو گا
تو مر کر بھی کاہے کو آرام ہو گا

نسخۂ اول (ص ۱۹۱) میں 'نشر' غلط اور نسخۂ دوم (ص ۱۸۶) میں 'نشتر' صحیح ہے۔
۲۔ نسخۂ اول (ص ۱۹۱) 'اب نشتر' غلط ہے اور 'آب نشتر' نسخۂ دوم (ص ۱۸۶) میں صحیح۔
۳۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور میں 'مرا' ہے۔

نہ خوباں سے مل جعفری دیکھ اتنا
کہا مان کہتا ہوں بدنام ہو گا

آرام وعدے کی شب اک دم کبھو نہ آیا
آیا نہ چین دل کو جب تک کہ تو نہ آیا
دو ایک جام سے کیا لب جعفری کے تر ہوں
یاں تشنگی بجھی کب جب تک سبو نہ آیا
تیغ یوں دل میں خیال نگہ یار نہ کھینچ
نا خدا ترس تو کعبے میں تو تلوار نہ کھینچ
نوک مژگان کے تصور میں نہ رہ اس کے دل
آپ کو آپ تو بالائے سر دار نہ کھینچ
بے سر و پا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر
ناز ہر گل نہ اٹھا، منت ہر خار نہ کھینچ

جعفری

جعفری تخلص، محمد جعفر، مرد نیک نہاد، آزاد منش، کشادہ پیشانی و پاکیزہ روش، اور سکنائے الہ آباد سے ہے۔ بعد قطع سلسلۂ روزگار کے اہل دنیا سے التجا نہیں کی۔ بیشتر سیاحت میں بسر کرتا ہے اور راقم سطور سے رابطۂ الفت کو حد صداقت تک پہنچایا ہے۔ خط گلزار عبدالرحمان معمار سے سیکھا، اور وہ پیشۂ معماری میں استاد اور فن تصویر میں غیرت مانی و بہزاد تھا۔ اس صاحب سلیقہ کی نازک کاری سے استاد کے کمال پر قیاس کیا جاتا ہے۔ لیکن بہر کیف اس نیک مرد، سعادت منش کی تعریف مجال قلم سے خارج ہے۔ حضرت فیض موہبت شیخ الاسلام فرید شکر گنج سے بلا واسطہ فیض باطنی حاصل اور بعد حصول بشارت کے بالفعل زمین کرامت آگین اجمیر میں مزار مقدس حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے جوار میں منزوی ہے۔ اوایل حال میں گاہ گاہ شعر ریختہ بھی موزوں کرتا تھا۔ یہ دو شعر بہ طریق یادگار رقم ہوئے:

ہے وہ پابند چمن مجھ کو یہ حیرت ہے کہ لوگ
سرو کو کس لیے آزاد کہا کرتے ہیں
جعفری کس کے واسطے یہ یار
در بدر یوں خراب پھرتے ہیں

جعفری

جعفری تخلص، شیخ جعفر علی قاضی زادہ، متوطن پرگنہ وادری۔ آدمی نیک نہاد اور کریم الاخلاق ہے۔ پینتیس برس کی عمر میں مردم صد سالہ کی متانت بہم پہنچائی ہے۔ بالفعل نواب عبدالرحمان خان والی جھجر کی سرکار میں ملازم ہے۔ شعر ریختہ آب و تاب سے کہتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے افکار گوہر نثار سے مرقوم ہوتے ہیں:

الٰہی ہر گھڑی ہر زخم دل سے خوں ٹپکتا ہے
شہید ناز ہوں میں آہ کس دست حنائی کا
وہ اپنے چین سے بیٹھا ہے جعفری گھر میں
کہ جس کے وسطے میں در بدر خراب ہوا
لگا تھا دیکھیے آزار کیا خدا جانے
ترا مریض تو اب تک نہ پھر بحال ہوا
گم ہو گئے ہم بحر تفکر میں سراپا
تس پر بھی معما نہ کھلا اس کی کمر کا
ہجر میں کرتا ہوں یوں ہر دم تلاش وصل یار
مانگتا ہے جیسے صحت کی دعا ہر دم مریض
شق جا بجا سے ہو گئی اک دم میں سب زمیں
تڑپا ترا جو کشتۂ الفت مزار میں

اے دل خیال زلف بتاں کیوں کہ چھوڑ دوں
وحشی ہوں اور پاؤں میں زنجیر بھی نہیں

مر گئے اس جستجو میں سینکڑوں خانہ خراب
جعفری عشق بتان ہند کا گھر دور ہے

جلیس

جلیس تخلص، الہ وردی خاں کہین برادر سعادت یار خاں رنگین، مرد سپاہی وضع، مودب، کم گو تھا۔ یہ دو شعر اس کے سنے گئے:

تیرے دہن سے از بس کھینچے ہے اک خجالت
غنچہ وہ کون سا ہے جو سر فرو نہ آیا

چشم جلیس کو اب درکار تھا یہ سرمہ
دست صبا تو لے کر اس خاک کو نہ آیا

جمال

جمال تخلص، میر جمال الدین خلف میر کمال الدین مرحوم۔ عجائب حالات سے اس بزرگ کے یہ ہے کہ بہ حسب ظاہر وسیلۂ معش کچھ نہیں رکھتا اور فراخ دستی میں رشک 1 امثال ہے۔ یہ شعر اس کے نتائج طبع سے اسی کی زبانی نام زد 2 گوش ہوا:

ہم تمھیں آشنا سمجھتے ہیں
آپ کیا جانے کیا سمجھتے ہیں

جمیل

جمیل تخلص، جمیل الدین پسر شیخ حفیظ الدین تھانیسری۔ ہر چند عمر اس کی ہنوز

بارہ تیرہ برس سے متجاوز نہیں ہوئی، لیکن ذہن کی تیزی برق سے اور طبیعت کی شوخی شعلۂ جوالہ سے زیادہ ہے۔ ازبس کہ حداثت سن کا اقتضا غالب ہے، اشعار میں مضامین خندہ انگیز تمسخر آمیز بیشتر باندھتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے کلام سے انتخاب ہوکر نذر ظرفائے خوش مزاج ہوتے ہیں:

رواں جو سوئے فلک آہ کا دھواں ہوتا
تو اک جہاز دخانی یہ آسماں ہوتا
چڑھا ہی لیتا اڑنگے پہ اس ستم گر کو
جو آج کو میں زبردست پہلواں ہوتا

۱۔ نسخہ۲ (ص ۱۸۸) 'رشک امثال'۔ یہی صحیح ہے۔
۲۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ (ص ۱۸۸) میں 'ذخیرہ' ہے۔

تو نے دیکھیں ہیں غیر کی آنکھیں
تیری نظروں میں کب سمائیں گے ہم
ترے کوچہ میں میں آنے نہیں دیتا ہوں غیروں کو
بنا میں ھیکڑی سے اپنی چوکیدار پھرتا ہوں
ترے غم نے مجھے بخشا ہے اب سامان عشرت کا
کہ شکل اپنی بنائے مثل موسیقار پھرتا ہوں
کہا میں نے کہ اک دن تو ذرا چہرہ دکھا دیجے
اسی کے واسطے اتنا ذلیل و خوار پھرتا ہوں
تو ہنس ہنس کر لگا کہنے کہ یوسف تو نہیں کچھ میں
کہ ہر اک کو دکھاتا جلوۂ دیدار پھرتا ہوں

بہتی مرے پھوڑے سے پڑی راد غضب ہے
اور اس پہ تغافل ترا فصاد غضب ہے

جن ہو کے جمیل اس کو چمٹ جاتے ہیں ہم بھی
ہر چند کہ وہ شوخ پری زاد غضب ہے

اس پہ عاشق ہوں پر نہیں یہ خبر
شکل گوری ہے یا کہ کالی ہے

سیم کی طرح دل گداز میں ہے
میرا سینہ ہے یا کٹھالی ہے

کھودتی ہے ہر ایک کا سینہ
تیری مژگاں ہے یا کدالی ہے

آنکھ پوچھے تو دے جواب وہ لب
اک جوالی ہے اک سوالی ہے

زلف سلجھی رہے تو ہے وہ گھاس
اور الجھی رہے تو جالی ہے

اس کے ابرو سے ہم کو فیض نہیں
ماہ نو ہے پہ ماہ خالی ہے

ہم غریبوں کا بسترہ کیسا
اک پرانی پھٹی نہالی ہے

لب لعل اس کا ہے مسّی آلود
اور کچھ پان کی سی لالی ہے

لال تو ہے پہ ہے یہ سم بکم
چٹکی سرمے کی اس نے کھا لی ہے

مت برا مانیو جمیل اس کا
اس کی گالی نہیں سہالی ہے

جنون

جنون تخلص، شیخ غلام محی الدین احمد ساکن آگرہ، یہ شعر ان کا سنا گیا:

بیان کیجیے کس سے جنوں سنے گا کون
دل حزیں پہ جو گزری ہے بے قراری رات

جوش

جوش تخلص، شیخ نیاز احمد معروف اللہ دیا، شاگرد شیخ ابراہیم ذوق۔ بیشتر بزم مشاعرہ میں حاضر ہوتا اور غزل خوب بطرز مرغوب پڑھتا ہے۔ دو تین مہینے کا عرصہ ہوا کہ عالم جاودانی کی طرف راہی ہوا۔ مردے (مرد) با اخلاق اور صاحب وفاق تھا۔ حق جل وعلیٰ اس کی خاک کو نم ابر رحمت سے سیراب کرے۔ یہ چند شعر اس کی تحریر ہوئے:

آنسو کا کوئی تار نظر آئے تو آئے
وحشت میں مرے تن پہ کہاں تار قبا کا
حاصل نہ ہوا وصل میں مقصود کہ مجھ کو
پاس ان کا رہا اور انہیں پاس حیا کا
ہے ڈر یہی کہ تو نہ پشیماں ہو بعد قتل
ورنہ ہمیں تو مرنے کا کچھ اپنے ڈر نہیں
منظور ہے شفا کسے درمان درد سے
اک شغل سا یہاں مجھے دن رات چاہیے

جوشؔ

جوشؔ تخلص محمد نظام الدین خلف محمد وجیہ الدین۔ اصل اس سخن سنج کے آباواجداد کی پنجاب اور مولد وموطن اس کاکول ہے۔ مرد قابل ونکتہ یاب، اگرچہ فن شعر میں نو مشق اور زمین سخن میں تازہ وارد ہے لیکن کلام کی پختگی اور طرز کی تازگی مشاقان کہن سال سے کم نہیں۔ یہ چند شعر صدق مقال پر شاہد عادل ہیں:

بار اتارا ہے دوش سے سر کا
ہے یہ احساں تمہارے خنجر کا

نظر آتا ہے جس جگہ چشمہ
ہے نشاں میرے دیدۂ تر کا

ہے پرستش سنگ کی عشق بتاں میں بندگی
جاویں گر کعبے تو پہلے سنگ اسود چوم لیں

دل لگائیں گے اور سے ہم بھی
آپ سمجھیں نہ دل لگی اس کو

سر کو تہ تیغ رکھ کے میرے
ثابت قدمی کا امتحان لو

سرد ہے دود آہ کی گرمی
دل کے جل بجھنے کا نشان ہے یہ

بت اگر کعبے میں نہیں آتے
ہم بھی جاتے ہیں بندگی کر کے

قدم عشق پیشتر بہتر
پیچھے پاؤں اس گلی سے کیوں سر کے

جوہر

جوہر تخلص ایک شخص کا ہے شاگردان مرزا اسداللہ خان غالب سے۔شعر فارسی کا فکر کرتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ مرزائے موصوف کی توجہ سے راہ مستقیم پر آ گیا ہے کہ اسلوب سخن فی الجملہ سلیقے پر دلالت کرتا ہے۔یہ چند شعر اس کے راقم کو پہنچے تھے،سو لکھے گئے:

تو وز راہ کرم بر سرم گزار غلط
من و برہ نہ نشستن بہ انتظار غلط

برو بزہد بد آموزیم مکن زاہد
من و ز شاہد و می توبہ در بہار؟ غلط

بہ عمد در خور پرسش نیم مگر وقتی
شود بہ کلبۂ من راہ آں نگار غلط

برراں سرم کہ دگر با کسی نیامیزم
امید لطف ز یاران روزگار غلط

جولان

جولان تخلص، درویش وارستہ مزاج، آزادہ منش، الف شاہ نام۔ہر چند حسب و نسب اور وطن کا حال اس بزرگ وار سے استفسار کیا گیا،اس سب کے جواب میں یہ شعر اپنا پڑھا:

کیا بتائیں کہ کہاں ہے مسکن
کوئے قاتل میں رہا کرتے ہیں

لیکن خارج سے دریافت ہوا کہ روسائے بریلی سے ہے۔اول الف خان نام

رکھتا تھا، بعد ترک و تجرید کے الف شاہ کے ساتھ مشہور ہو گیا۔ آزادانہ زیست کرتا ہے، وارستگی و استغنا سے فرشتے کو خیال میں نہیں لاتا، آدمی تو کیا خاک ہے؟ مدت سے اکبر آباد میں مقیم ہے۔ گاہ گاہ بے پروایانہ کسی طرف کو چلا جاتا ہے۔ یہ چند شعر اس بزرگ کے اشعار سے منتخب ہوئے:

ہم وہ ہیں صید وفا کیش کہ خوں روتے ہیں
ٹوٹ جاتا ہے تڑپنے سے اگر دم اپنا

کیا تحریر فرط شوق میں جب نام احمد کا
تو کاغذ سبز بختی سے بنا تختہ زبر جد کا

اٹھایا ہے گلی سے اس پری رو کی اگر مجھ کو
تو لے چل وحشت دل اب جدھر چاہے ادھر مجھ کو

برنگ گل جو کشتوں کا ترے ہر زخم خنداں ہے
ترا کوچہ ہے اے سفاک عالم یا گلستاں ہے

معشوق پر بھی ہوتی ہے تاثیر عشق کی
چٹکی کلی جو بلبل بے دل نے آہ کی

باب الجیم الفارسی

چالاک

چالاک تخلص، میر قدرت اللہ، ساکن قدیم دہلی، مرد خوش مزاج، علم فارسی سے بہ قدر ضرورت آگاہ اور سرمایۂ معیشت سے بہ حسب ظاہر فارغ بال۔ گاہ گاہ امتحان طبیعت کے طور پر شعر ریختہ بھی کہتا ہے۔ یہ شعر اس کی دو تین غزلوں میں سے انتخاب ہوا:

روز کے صدمے کہاں تک میں اٹھاؤں چالاک
دل کی جا کاش مرے سینے میں پتھر ہوتا

چرکین

چرکین تخلص ہے ایک شخص ظریف، شوخ مزاج، ساکن لکھنؤ کا۔ وہ ہمیشہ سخن پاکیزہ کا دامن نجاست معنوی سے آلودہ رکھتا، یعنی مضامین بول و براز اس طرح شعر میں باندھتا کہ زمین سخن کو گوہ گڑھیا بنا دیتا، مگر اس کی قوت شامہ یک قلم باطل ہو گئی تھی کہ اس غلاظت سے بے دماغ نہ ہوتا تھا۔ انصاف تو یہ ہے کہ ابیات میں ہر چند گوہ اچھالتا اور کاغذ کے ہر گوشے میں پیشاب کی نالی بہاتا تھا، لیکن کوئی لطیف مزاج اس سے دماغ بند نہ کرتا اور کوئی پاکیزہ طبع اس سے گھن نہ کھاتا، گویا بحر شعر نے اس نجاست کو بہا دیا تھا:

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

ایک دوست نے کہا کہ یہ ان نعمائے لطیف کا فضلہ ہے کہ ابو اسحاق اطعمہ نے تناول کی تھیں۔ میں نے کہا لطافت ان نعما کی بخیر، کھانے کس قدر کثیف ہوں گے

کہ ان کا فضلہ اس مدت دراز کے بعد دفع ہوا۔ اوایل حال میں تو اس نے یہ وضع ہزل سمجھ کر اختیار کی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس قال کو حال بنالیا اور اس گندہ ذہنی نے اس کو گھوری 1 بنادیا۔ گویا یہی بو اس کے بدن میں رچ گئی ہے۲۔ مدام لباس چرک پہنتا اور ایسی میلی کچیلی وضع رکھتا کہ اجنبی اس کو سچ مچ حلال خور سمجھتا۔ صحبت کا اثر مشہور ہے۔ یہاں صرف تصور اور خیال نے یہ تاثیر کی کہ صحبت کو پرے بٹھا دیا۔ حق یہ ہے کہ جو ابتدا میں کہتا تھا انتہا میں کر دکھایا۔ آخر الامر لال بیگ کی صحبت اور گوگا پیر کی ہم نشینی کے شوق میں شہر کے مقامات پاکیزہ سے بھاگ کر صدہا آرزو کا ٹوکرا سر پر رکھے ہوئے بہ طریق پاتراب کے جنگل کے کسی کوڑے پر اول منزل کی۔ ہر چند الفاظ کی نجاست ظاہری سے قلم گھن کھا کر نہ چاہتا

۱۔ نسخہ۲ (۱۹۱) اگھوری۔
۲۔ نسخہ۲ (۱۹۱) تھی۔

تھا کہ اس کے اشعار کو ہاتھ لگاوے، لیکن یہ سمجھ کر کہ قصر عالی میں جائے ضرور سے گریز نہیں ہے، دم کے دم اس طرف بھی متوجہ ہوا:

تھا گرفتاری میں خطرہ جو مجھے بیداد کا
کر دیا بیت الخلا ھگ ھگ کے گھر صیاد کا
ایک دن بھی دل نہ اس بت کا پسیجا ہائے حیف
تھا مگر گوز شتر نالہ دل بے تاب کا
کھات پڑنے لگی چمن میں پھر
بلبلو موسم بہار آیا
اک نہ اک عارضہ رہا ہم کو

تھم گئے دست تو بخار آیا

ہگ دیا ڈر کے سوچ کر انجام

زیر پا جب کوئی مزار آیا

طفل مہتر پہ دل دیا چرکیں

کیسے گھسل پہ تم کو پیار آیا

روتے انسان کو ہنساتا ہے

گوز میں یہ کمال ہے صاحب

وصل کا وعدہ کیا بیت الخلا میں یار نے

پنجۂ مژگاں سے جھاڑا چاہیے پیخانہ آج

ہر ایک آنوں کی پھٹکی ہے ریزۂ الماس

تمہاری.....ا ہے ہیرے کی کاں نہیں معلوم

دیوانے اس کے چاک گریباں کو سی چکے

پھٹ جائے.......۲ بھی تو نہ ہرگز رفو کریں

ا، ۲۔ یہاں سے ایک لفظ بر بنائے کثافت حذف کردیا گیا ہے۔

عاشق جو ہے تو ناصحوں کے منہ کو.....ا جان

گوز شتر سمجھ تو جو یہ گفتگو کریں

وعدے تو کیا کرتے ہو عشاق سے جھوٹے

بو گو کی نہ آنے لگے غنچے سے دہن میں

چمن میں جب کسی کا قد موزوں یاد آتا ہے

کھڑی.....۲ اسے بدتر جانتا ہوں سروبستاں کو

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

تبرا بھیج دنیا پر عدم کی راہ لے ناداں
نہ کر اس مزبلے میں بیٹھ کر آلودہ داماں کو

تیغ اس نے لگائی جب کمر سے
مریخ نے ھگ دیا ڈر کے
کر بات نہ غیر فتنہ گر سے
گو اچھلے گا خوب ادھر ادھر سے
ٹل جائے گی ناف آئیں گے دست
تلوار نہ تو لگا کمر سے
ھگتے میں بندھا جو زلف کا دھیان
پیچس رہی شام تک سحر سے
مت بار گنہ اٹھا تو ناداں
یہ ٹوکرا گو کا پھینک سر سے
دستوں پہ دست آتے ہیں بجھتے ہیں پوتڑے
اس حال میں نہ آؤ یہ تم سے بعید ہے
پھولے نہیں سماتے ہیں گل چین و باغباں
آئی بہار کھات کی ہوتی خرید ہے

۱، ۲۔ یہاں سے ایک لفظ کثافت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔

---

1 وصل کی شب بستر جاناں میں میں نے ھگ دیا
کیا سمجھتا تھا کہ یہ مجھ سے خطا ہو جائے گی
افسوس آج ان کو نہیں۲....... کی خبر

کل تک خراج لیتے تھے جو روم و زنگ سے
قبض کی شدت اگر چہ کیں ہے عالم میں یہی
کھات بھی نایاب مثل کیمیا ہو جائے گی
۳...کھولے سوتے ہیں وہ خاک میں زیر زمیں
پوتڑے سیتے تھے جن کے قاقم و سنجاب سے
سمند گوز بھی صاحب عجب منہ زور گھوڑا ہے
چھٹے ہے شہ سواروں کی بھی جس کی بد لگامی سے
عبث بدنامیوں کا ٹوکرا سر پر اٹھانا ہے
لگانا دل کا بس جھک مارنا اور گو کا کھانا ہے

چمن

چمن تخلص، گل محمد کشمیری ساکن قدیم شاہجہان آباد، پیشۂ رفوگری میں استاد تھا۔ لیکن سوزن قلم اور رشتۂ مسطر سے کسوت سخن کے چاک کو خوب نہ سی سکا۔ کئی برس ہوئے کہ تار انفاس کو رشتۂ کفن کیا۔ یہ دو تین شعر

ا۔ اس سے پہلے ایک شعر کثافت کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔

۳،۲۔ یہاں سے ایک لفظ بر بنائے کثافت حذف کر دیا گیا ہے۔

اس کے یاد تھے:

ہمارے چاک جگر پر ہو کیا کسی کو خیال
پھٹے میں پاؤں کسی کے دیا نہیں جاتا
ہوش جس مہ نے زلیخا کے اڑائے خواب میں

ہم بھی اے ہمدم اسی کے دیکھنے والوں میں ہیں
یوں بند پر ہیں چمن کے داغ تیرے عشق کے
پھول جیسے اے سمن بر ان ترے شانوں میں ہیں

باب الحاء المہملۃ

حافظ

حافظ تخلص، خدا طلب، صوفی مشرب، سر ایر آگاہ، معارف انتباہ، یادگار خلف حافظ شرف۔ اس جزو زمان میں خاکساری اور نفس شکنی اس صاف دل و پاک اعتقاد پر ختم تھی۔ کمال تسلیم سے الف قد کو دال بنا دیا تھا اور رکوع اور سجود کے شوق میں منار قامت کو محراب کر دیا تھا۔ موافق اس قول کے کہ ''المومن مرأت المومن'' یعنی مومن سب کو اپنا سا سمجھتا ہے۔ وہ ہر کسی کو نیک سمجھتا اور اپنے سے بہتر جان کر کمال تواضع اور فروتنی سے پیش آتا۔ علم موسیقی میں مہارت چست اور اس فن کی سمجھ بہت درست۔ چتر اور بین بجانے میں دست گاہ تمام، خیال اور دہر پت گانے میں قدرت مالا کلام۔ مگر وہ سب مضامین عرفان سے مالا مال ہوتے اور وہ راگ ان معانی بلند کی اعانت سے عارف کو مدارج علیا تک لے پہنچتے۔ گویا یہ شعر مولانا اشرف العارفین جلال الدین رومی قدس سرہ کا اسی کے نغمے کی شان میں ہے:

ایں زمزمہ مر کی ست مر روح ترا
بردارد و خوش بہ عالم یار برد

شعر گوئی کی طرف بھی توجہ بہت فرماتا اور اس کے پردے میں بھی وہی راگ گاتا۔ سوز سینہ شبستان ابیات میں شمع افراز اور داغ بہت مجمر اوراق میں عود سوز۔ ہر چند وہ لوگ کہ مائدۂ سخن سے لذت یاب اور لطف شعر سے آشنا ہیں، اس کی دست پخت طبیعت سے مزہ نہ اٹھاتے لیکن اہل مذاق کو ان معانی کی لذت اور ان مضامین کی کیفیت اپنے سے بیگانہ کر دیتی تھی۔ از بس کہ یہ اقوال اس کے دل کے اسرار تھے، ارباب باطن کے سوا اس سے کم کسی کو احتظاظ ہوتا۔ سچ ہے کہ حال کو اہل حال ہی خوب سمجھتا ہے۔ کسی راہ یافتہ سرایر عشق نے کیا نالۂ جاں سوز سر کیا ہے کہ: ''لیلیٰ را بہ چشم مجنوں باید دید۔'' نواب محمد میر خاں ابن شاہ نظام الدین معروف بہ شاہ جی کہ

تو نگر صورت و درویش سیرت اور دنیا دار 1 ظاہر و فقیر باطن تھے، ہمیشہ اس صحبت فیض منقبت کو مغتنم جانا کیے اور بعد اس کی وفات کے اپنے نفس واپسیں تک حرف افادات پیشیں کو آشنائے زبان کرتے رہے۔ ایک بدمست ظاہر اور ہوشیار باطن میرا دوست کیا کہ فی الجملہ مجھ کو اس سے اعتقاد، اور سوز دل و گداز باطن مثل شمع اس کے ظاہر سے ٹپکتا تھا۔ میں نے اس پاک باطن نیک کردار کی زبان سے یوں

۱۔ نسخہ اول (ص ۱۹۸) میں 'دنیا'، اور نسخہ دوم (۱۹۴) میں 'دنیا دار' ہے۔

سنا کہ: ایک روز صوفیان حقیقت شناس کا ہنگامہ گرم تھا، اس جلسے میں اس روشن ضمیر نے ایک رباعی عارفانہ پڑھی اور سب حلقے کو ایک حال طاری ہوا۔ اس جگہ ایک لڑکا سات آٹھ برس کا بھی حاضر تھا، اس کا بھی وہی احوال ہو گیا اور جب مجلس تمام ہوئی، دوپہر کے بعد اس کو ہوش آیا۔ مرزا بیدل درست فرماتے ہیں: مصرع

حرف ایں طائفۂ سحر بیاں اعجازیست

راقم آثم یہ چند شعر لکھ کر اس کے سوز و گداز کی کیفیت سے آگاہ کرتا ہے:

شب نئی شان میں تجھے دیکھا
روز ہر آن میں تجھے دیکھا
تو نے تفسیر پڑھی حافظ پر
اس کی صورت کا بیاں ہو نہ سکا
سرسبزی یہ تری ہی آنکھوں میں چھا رہی ہے
کیا باغ سبز تو نے عشاق کو دکھایا
حقیقت میں تجھ کو جو ہم دیکھتے ہیں
تو ذات و صفت کو بہم دیکھتے ہیں

ایک تجلی نے تو روشنی عالم کو دی
آگے اب اندھیر ہے، جلوہ گری اور بھی
مطلب ہے لامکاں سے نہ کچھ کائنات سے
مجھ کو تو مدعا ہے فقط تیری ذات سے

حزین

حزیں تخلص میر بہادر علی مرد سنجیدہ اور صاحب اخلاق حمیدہ کا ہے۔ اس کی وضع اور متانت لازم وملزوم اور آثار اخلاق جیسے گل اور شگفتگی کا ہجوم۔ سینہ رشک آئینہ، دل ایسا صاف کہ کدورت حسد کو اس میں راہ نہیں ہے، اور آنکھ ایسی سیر کہ خواب دنیا پر نگاہ نہیں۔ مرزا ولی عہد بہادر کی ملازمت سے ممتاز اور بہ سبب خوش اطواری و نیک نہادی کے رتبۂ تقرب سے سرافراز۔ اوایل میں اشعار اردو کی اصلاح زین العابدین خان مرحوم عارف تخلص سے لی تھی۔ غالب ہے کہ اب سخن اس سحر طراز کا مرزا اسد اللہ خاں غالب تخلص کے حلیۂ تربیت سے محلی ہوتا ہوگا۔ زبان میں شستگی، فکر میں رسائی، معنی میں بلندی، تراکیب میں چستی جیسے چاہیے فراہم ہے۔ شاعر میں اتنی باتوں کا جمع ہونا معراج الکمال اور عرش المعرفت ہے۔ یہ چند شعر اس کے افکار گوہر نثار سے ہیں:

یک لخت بہا کرتا خون جگر آنکھوں سے
فرقت میں اگر تیری پینے سے بچا ہوتا
سب ناز سہے میں نے بے جا و بجا ان کے
نبھتی نہ حزیں ان سے گر میں بھی برا ہوتا
ہے یہی رونا تو خط کاہے کو لکھا جائے گا
جو کہ لکھتے جائیں گے اشکوں سے مٹتا جائے گا

اک تماشا جان کر قاتل اگر ٹھہرا رہا
ہم بھی تڑپے جائیں گے جتنا کہ تڑپا جائے گا

میرا احوال زبوں ان پہ کھلے گا کیوں کر
سامنے آئیں گے جب وہ تو سنبھل جاؤں گا

بے گانہ وار نعش پہ آ جائے ناگہاں
تجھ سے نہ یہ بھی اے بت ناآشنا ہوا

دنیا کی حسرتیں ترے گوشے میں آ گئیں
اللہ ری وسعتیں تری اے تنگ نائے دل

جل جل کے آخرش تپش غم کے ہاتھ سے
اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل

دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا نہ تھا
اور دیکھیے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

شعلہ و بسمل و سیماب کو ہم دیکھ چکے
تیرے دل سا تو حزیں ایک بھی بیتاب نہیں

سبو منہ سے لگا لیویں گے اتنا صبر ہے کس کو
کہ بھریے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

رنج پہلے جو حزیں ان سے وہ راحت سمجھو
ہے غنیمت کہ تمہیں یاد تو کر لیتے ہیں

ہے ہنر سے اک فقط انسان کی مٹی خراب
ورنہ جوہر سے ملی ہے آبرو فولاد کو

دل خوں گشتہ ہاں وقت مدد ہے
خجل کرنا نہ چشم خوں چکاں سے

تھمے آنسو تو اب تھمتا نہیں دل
یہ دشمن خانگی نکلا کہاں سے
بلا سے گر نگاہوں میں ہیں ہلکے
سبک ہو کر تو اٹھے ہم جہاں سے
حزیں کس سے توقع ہو وفا کی
نہ ہو امید جب اپنی ہی جاں سے
اثر جو آہ میں پایا تو ہو گئی تسکیں
وہ بے قرار ہوئے، آ گیا قرار مجھے
اے سوز عشق! روز نیا داغ تا بہ کے
اس سے تو آگ تن میں لگا ایک بار دے
ہم سادہ لوح اور جہاں سر بسر سراب
جتنے فریب چاہے ہمیں روزگار دے
بے خودی کھو کے لیے سر پہ ہزاروں جھگڑے
توبۂ مے سے ہوئے ہم تو پشیماں الٹے

حسرت

حسرت تخلص، منولال قسم کاتیہ پسر لالہ پیارے لال وکیل محکمۂ عدالت دیوانی انگریز 1۔ نوجوانان شاہجہان آباد اس سعادت واہلیت کے ساتھ کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ کتب فارسی کو جناب فیض مآب استادی مولانا ومخدومنا مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھا ہے اور مشق شعر فارسی بھی انہیں کی خدمت بابرکت سے بہم پہنچائی۔ یہ چند شعر اس کے نتائج افکار سے لکھے جاتے ہیں:

کردیم در خزانۂ دل جمع نقد داغ

لالہ برد زکوۃ زر بے حساب ما

ا۔ نسخہ۲(ص۱۹۵) 'انگریزی'۔

دل آں چناں ز درد تو برخود طپد کہ نیست
سیماب را مقابلہ با اضطراب ما
حسرت نصیب دیدۂ ما روئے دوست نیست
شاید کہ جذب دل کشد اورا بہ خواب ما
از گل داغ بتاں تا سینہ شد گلشن مرا
آتش دل ہر نفس زد شعلہ چوں گلخن مرا
چوں سحر دردید از خار غمش دل چاک چاک
کے تواند دوخت خورشید فلک دامن مرا
حسرت از یاد لب او جان خود را دادہ ام
چشمۂ حیواں سبب شد از پئے مردن مرا
چوں سحر دارم گریباں چاک از شوق رخش
کے شود کاں آفتاب از جلوہ مسرورم کند
گر چنیں آں آتشیں خو می فروشد جلوہ ہا
می تواند فرق تا پا آتش طورم کند
یار در آغوش و درد انتظارم می کشد
ساقی آں مے داد گو ہر لحظہ مخمورم کند
آتش دل ہمچو اخگر می کند خاکسترم
گرد ایں کلفت بہر دم زندہ در گورم کند

می کند صد دشت طے حسرت برنگ گرد باد
تا بکے آوارگی ہا از وطن دورم کند
در تماشا گاہ عالم جز جنوں سودے نداشت
ای خرد بگذر ز ہوش و روز شب دیوانہ باش
رشتہ ہائی سبحہ و زنار از یک عالم اند
گہ بہ سنگ کعبہ سر نہ، گاہ در بت خانہ باش
از فروغ بادہ جام خویش رشک مہر کن
می خور و در بزم رنداں روز شب مستانہ باش
چوں صفا نگرفت دل با کس چہ سود آمیختن
سیر کن در خاطر و از عالمے بیگانہ باش
دوست گوشے بر حکایت ہائے ما کے می نہد
حرف ما گو درمیان مردماں افسانہ باش

حسرت

حسرت تخلص، نونہال گلشن نجابت، حافظ عبدالرحمان، ساکن پانی پت، حضرت معارف دست گاہ، سرایر آگاہ، قاضی ثناء اللہ مرحوم پانی پتی کے نبائر سعادت مند سے ہے۔ باوجود نوجوانی و نوخاستگی کے سعادت و اہلیت سے بہرہ مند، اوقات شبا روزی تحصیل کمال میں صرف کرتا ہے۔ جو کہ مانند سرو و شمشاد موزونی جوہر ذاتی ہے، مشغلۂ تحصیل سے جب فرصت بہم پہنچتی ہے، قامت سخن کو حلیۂ وزن و تقطیع سے محلّی کرتا ہے۔ یہ دو چار شعر اس صاحت طبع کے مرقوم ہوئے ہیں:

ہم تو حسرت کو سمجھتے تھے کہ اک عارف ہے
یہ تو اے وائے نہ کافر نہ مسلماں نکلا

کس لیے چاک قفس بند کیے اے صیاد
کیا ہوا میں نے اگر سوئے گلستاں دیکھا
تم بھی رو بیٹھو گے دل کو ہمیں ہنستے کیا ہو
اگر آئینہ کبھو تم نے مری جاں دیکھا
اس نے حسرت کو کیا قتل کہیں ہائے کہ آج
میں نے اس شوخ سے ظالم کو پشیماں دیکھا
گر نہیں دوست خدایا مری جاں کے دشمن
کیوں شب غم مرے جینے کی دعا کرتے ہیں
ہائے کیا جور کشی کی ہمیں عادت ہے کہ آپ
اس ستم گار کر تحریک جفا کرتے ہیں
کیا ہوا دیکھ تو ناصح کہ ہمارے منہ سے
یا صنم نکلے ہے جب یاد خدا کرتے ہیں
کیوں کر کہوں کہ ہجر میں مطلق نہیں خبر
اتنی خبر تو ہے کہ مجھے کچھ خبر نہیں

حسن

حسن تخلص، میر حسن، کہین برادر میر حسین فگار، مرد خوش اخلاق، فن فارسی سے بہ قدر ضرورت آشنا، ریختہ گوئی کی طرف متوجہ۔ گاہ گاہ جو کوئی شعر گوش زد ہوا، مزے سے خالی نہ تھا۔ والی شہر الور کی سرکار میں فی الجملہ ناخن بندی موجب رفاہ حال ہے۔ اس وقت کوئی شعر ناخن بہ دل زن لوح حافظہ پر مثبت نہ تھا، اس ایک شعر پر قناعت کی:

سانولی رنگت سے لازم ہے حذر سید حسن

اس دھندلکے میں مسافر مفت مارا جائے ہے

حشمت

حشمت تخلص، مرزا غلام فخر الدین مرحوم ابن مرزا معظم بخت مغفور ابن حضرت شاہ عالم بادشاہ نور اللہ مرقدہ، شاگرد حافظ عبد الرحمان خاں مغفور۔ مرد حلیم، صاف طینت، پسندیدہ صفات، پاکیزہ اخلاق تھے۔ بیشتر شریک مشاعرہ ہوتے اور کچھ اپنے کلام اور اغلب اپنے خلق طبعی سے سامعین کی طبع کو مسرور فرماتے۔ حضرت استاد سے ایسی محبت رکھتے تھے کہ اس جناب کے مرض الموت میں بیشتر یہ دعا ورد لب تھی کہ ''الٰہی میرا سینہ استاد کے داغ کا گنجینہ نہ کر۔'' ازبس کہ یہ دعا صدق دل سے تھی، اس نالۂ سحری اور آہ نیم شبی نے عرش اجابت تک رسائی اور اثر قبول نے اس کے انفاس صدق اقتباس کی پیشوائی کی، یعنی استاد کے انتقال سے ایک روز پہلے اس گرم رو راہ اخلاص نے ملک بقا کا عزم کیا۔ ''انا للہ وانا الیہ راجعون''۔ چند شعر اس مغفور کے بہ طریق یادگار تحریر ہوئے:

زلفوں کے بنانے کا پردہ تھا بہانہ تھا
منہ پردہ نشیں ہم سے پردے میں چھپانا تھا
خیر کیجو تو الٰہی ہے سبب کیا کہ مرا
آپ سے آپ ہے کچھ آج کلیجہ ہلتا
نالوں سے مرے برپا سو فتنۂ محشر ہیں
قامت سے ترے قایم نقشہ ہے قیامت کا
اشک باری تو نہ کر اتنی خدا کے واسطے
غرق اک عالم ابھی اے چشم تر ہو جائے گا
گھر دو ہی قدم پر تو ہے ان قدموں کے صدقے

بڑھیے کوئی دو چار قدم اور زیادہ
ترے بیمار ہجراں کا ترے بن
یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولا
تری حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

حفیظ

حفیظ تخلص۔ مداح امام ہمام، مرثیہ خواب اہل بیت عظام، حافظ حفیظ مرحوم غفر اللہ لہ۔ یہ بزرگ اساتذۂ مرثیہ خوانان شاہجہان آباد سے شمار میں آتا تھا۔ عزاداری کی تاثیر سے اس کی آواز بھی حزیں تھی۔ تلامذہ اس کے اس فن میں تعزیہ داران امام سے بھی گنتی میں زیادہ تھے اور اب تک ہر مجلس ماتم میں اس کی مرثیہ خوانی کا ذکر تمام مرثیہ خوانوں کے کلام کا بند ترجیع ہے۔ مثنویٔ معنوی مجالس مشائخ، علی الخصوص فاتحہ (جناب مستطاب قدوۂ عرفائے خدا آگاہ، اسوۂ جمہور اہل اللہ حضرت شاہ ولی اللہ والد ماجد پیشوائے علمائے عصر مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہما) کے روز خوش نزور کے چھتے میں جو شہر کرامت بہر شاہجہان آباد سے مسافت ربع میل پر واقع اور شاہ خدا آگاہ موصوف کا مقبرہ ہے، حضرت بابرکت مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس خوش الحانی سے پڑھتا تھا کہ کمال رقت سے تمام صحرا میں سامعین کے اشک کا دریا بہہ جاتا تھا۔ موزونی طبع کو اکثر مرثیہ گوئی میں صرف کیا اور مرثیوں کے مضامین قصص کاذبہ اور روایات وضعی نہ ہوتے تھے بلکہ محامد ائمۂ ھدیٰ اور اوصاف شجاعت شہدائے کربلا، اور اگر حسب اتفاق کوئی حکایت جاں سوز بھی زبان پر آتی تھی تو وہ حکایت کہ رواۃ معتبر کی گواہی سے زیور تصدیق پائی تھی۔ حال نزع میں یہ شعر موزوں کیا:

شاہ مرداں جو کوئی اس راہ پہ آیا کرے
فاتحہ اس قبر پر للہ پڑھ جایا کرے

اور وصیت کی کہ میری قبر شاہ مرداں کی راہ میں بنوائیں اور بالین گور پر یہی شعر لکھوائیں۔ اب تک یہ شعر اس قبر کی بالین پر مرقوم ہے اور ہر مہینے کی بیسویں خصوصاً لخت جگر خیر الانام علیہ الصلوۃ والسلام کے چہلم کے روز جو ماہ صفر کی بیسویں اور شہدائے کربلا کے ایام عزا کا خاتمہ ہے، ہجوم زائرین سے اس قبر کی خاک پر پائے نگاہ نہیں پڑ سکتا اور کثرت دعائے مغفرت سے ہر دعا کے حصے میں اجابت کا جزو لا یتجزیٰ بھی کفایت نہیں کرتا۔ یہ دو تین شعر تحریر تذکرہ کے وقت جزدان حافظہ میں محفوظ تھے تحریر ہوئے:

ہم تو دشمن آپ کے ہیں بارے یہ فرمائیے
اور کس کس سے نبھی ہے دوست داری آپ کی
رو برو غیروں کے شکوہ آپ کا ہم کیا کریں
ہو رہیں گی پھر کبھی باتیں ہماری آپ کی
اے حفیظ ایسے ستمگر، بے وفا، بے دید سے
دیدہ و دانستہ دیکھی، ہم نے یاری آپ کی

حقارت

حقارت تخلص میر ممن ولد سلطان علی داروغۂ کارخانۂ انگریزی۔ اس سے زیادہ کچھ اس کے حال سے اطلاع نہیں۔ ایک شعر اس کا گوش زد ہوا تھا، لکھا گیا:

کسوت خاک پہ اتنا نہ ہو ناداں اے قیس
اپنے تن پر بھی کبھی جامۂ عریانی تھا

حقیر

حقیر تخلص، میر امام الدین معروف بہ میر کلو۔ مرد متین، حلم مزاج، صاف دل۔ آئینۂ طبیعت کو غبار بغض و ظلمت حسد سے پاک اور آفتاب ضمیر کو کسوت جہل و گرد کدورت سے صاف کر دیا تھا۔ اعدا بھی اس کے آئینۂ دل سے باوجود کورئ عداوت کے راز پنہاں کو بے پردہ مشاہدہ کرتے اور اغیار اس کی خلوت ضمیر میں باوصف بیگانگی کے آشناؤں سے ہم پہلو بیٹھتے۔ مشق سخن کمال کو پہنچی تھی۔ شعر ریختہ نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کہتا۔ ہر چند رعایت الفاظ کی پابندی حد سے زاید تھی لیکن سلاست عبارت کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ جاتا تھا۔ اکثر اشعار اس کے ناخن بہ دل زن ہیں۔ ایک عرصہ ہوا کہ اس جہان فانی سے عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا۔ یہ چند شعر اس کے انتخاب ہو کر مرقوم ہوئے:

لے کے موتی بھی نہ دوں گا طفل اشک اپنا حقیر
نور چشم آنکھوں کے گھر میں ایک لڑکا رہ گیا

چڑھی جو شیخ کو افیوں تو دانۂ تسبیح
سمجھ الائچی دانے تمام ٹھونگ 1 گیا

ہوں ہست و نیست، عالم تصویر کی طرح
گویا ہوں اور خموش ہوں زنجیر کی طرح

دل میں ہے بیٹھ رہیں در پہ صنم کے ہی حقیر
راہ کعبے کی تو آتی ہے نظر دور ہمیں

یاد میں اس بت کافر کی ہوں ایسا مصروف
کہ خودی بھول گئی اور خدائی مجھ کو

بن کے جوگی چشم قاتل کے نبی میں دل بسا
کوئی پوچھے کیا بنی تجھ پر کہ بستی چھوڑ دی

بعد مدت بر میں آیا ناوک دلبر سو آہ
دشمنوں نے کھینچ، میری جاں تڑپتی چھوڑ دی

ایک آنے پر تمہارے جان دیتا ہے حقیر
لے لو صاحب تم نے کیوں یہ جنس سستی چھوڑ دی

گلی میں یار کی، چینٹی گھسیٹ لائی تجھے
حقیر صدقے ہو تو اپنی ناتوانی کے

ابتر ہیں یہ سب لخت جگر روک لو اڑ کے
جانے دے اگر روٹھ چلے، اشک کے لڑکے

کس رو سے چھٹے زلف ستم گر کا گرفتار
وہ "سیدیٔ فولاد" رکھے جس کو جکڑ کے

دل شورش اشکوں نے تو ہر چند بجھایا
پر شعلۂ دل آہ مرے اور ہی بھڑکے

ا۔نسخہ ۲(۱۹۹) 'ٹونگ'۔

کوئی غیر نہ تھا گھر کے ہی مردم ہوئے دشمن
آنکھوں نے بہایا مجھے اس طفل سے لڑ کے

پامال ہوئے تم تو حقیر آہ جہاں میں
چوں نقش قدم یار کے قدموں سے بچھڑ کے

حقیر

حقیر تخلص، منشی نبی بخش، خلف منشی حسین بخش کہ نظم و نثر فارسی میں علم یکتائی بلند

اور شہر لطافت بحر اکبر آباد میں محلّہ تاج گنج اس کی سکونت سے باغ ارم پر ناز کرتا ہے۔ بالفعل عہدۂ سر رشتہ داری محکمۂ فوج داری کی تقریب سے قصبۂ کول میں تشریف فرما اور اس کی خاک قدم اس نواح کے ساکنین کی آنکھ میں توتیا ہے۔ کلام میں فصاحت کو بلاغت کے ساتھ جمع اور متانت کو سلاست کے ساتھ فراہم کیا ہے۔

یہ چند شعر اس کے نتائج افکار سے ہیں:

زخم کے منہ میں بھر آیا پانی
جب کہ پیکاں کا مزا یاد آیا

پھر گریباں کے اڑیں گے ٹکڑے
پھر وہی چاک قبا یاد آیا

خط جو غیروں کو کیے اس نے رقم
ہم کو قسمت کا لکھا یاد آیا

بس کہ مصنوع ہے صانع کی صفت
بت کو دیکھا تو خدا یاد آیا

آج پھر اس بت کافر نے حقیر
وہ ادا کی کہ خدا یاد آیا

کیا سبک رو ہیں رہروان عدم
کہ کسی کا نہ نقش پا دیکھا

دیر میں ہے ذکر اپنا کعبے میں بیاں اپنا
ایک ہم ہیں اور چرچا ہے کہاں کہاں اپنا

ہاتھ دوڑائے جنوں نے پھر گریباں دیکھ کر
پاؤں پھر وحشت نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

کوئی لا سکتا نہیں مضمون حالی کو بزور

خود بہ خود آتا ہے یہ طبع سخن داں دیکھ کر
سنتے ہیں گئے مانی و بہزاد عدم کو
اب کھینچیں تو کھینچیں کمر یار کی تصویر
وہ نگاہیں جن سے تھی مجھ کو تسلی کی امید
تشنۂ خوں آفت دل دشمن جاں ہو گئیں
گر یہی چاک کی عادت ہے تو اے دست جنوں
پیرہن سارے گریباں ہی گریباں ہوں گے
قتل تم سو کو کرو گے تو مریں گے لاکھوں
کشتہ ہر کشتے کے ہم راہ صد ارماں ہوں گے
گر تو نہیں ہے عاشق پھر یہ حقیر ہر دم 1
کیوں نالۂ حزیں ہے کیوں آہ آتشیں ہے

حکیم

حکیم تخلص، حکیم نہال الدین، حال اس کا بجز اس کے کہ صدر دیوانی آگرہ میں محرر رہے، اور کچھ معلوم نہیں۔

۱۔ نسخہ ا (ص ۲۰۵) میں "مرد ہر دم" غلط۔

یہ دو شعر اس کے مسموع ہوئے:

مرے پہ بھی نہ گئی میرے گھر کی تاریکی
رہا خموش چراغ مزار ساری رات
بسر ہوئے شب فرقت عجیب کلفت سے

بجائے خواب غشی سی رہی تھی طاری رات

حمید

حمید تخلص، حمید الدین، زمرۂ سواران سلطانی میں انسلاک اور فن شعر میں فی الجملہ سلیقہ رکھتا ہے۔ یہ شعر اس کے نتائج افکار سے ہے:

نیند آئی تھی مدت میں جگا کس نے دیا ہائے
پاؤں مرے اے گردش تقدیر ہلا کر

حمید

حمید تخلص، سید حسین علی، طالب علم مدرسۂ آگرہ۔ یہ دو شعر اس کے تحریر ہوئے:

رہا وہ غیر کے گھر کل تمام شب ظالم
میں کیا کہوں جو رہی دل کو بے قراری رات
حمید جیسا قیامت کا روز ہے دشوار
اسی قدر ہے جدائی کی سخت بھاری رات

خوشم

خوشم تخلص، منشی دیپ چند قوم کھتری، مرد معمر اور سنجیدہ تھا۔ خط نستعلیق و شکستہ کو بہت درست لکھتا۔ استعداد فارسی کامل اور طرز نثر طرازی نہایت دل چسپ۔ حضرت فیض مرتبت امیر خسرو دہلوی قدس سرہ کی طرز کی پیرو۔ محسنات بدیعی خصوصاً اشتقاق اور مراعات النظیر کی طرف التفات اس مرتبہ تھی کہ بسا اوقات سر رشتہ حسن معنی کا ہاتھ سے جاتا رہتا۔ 'خزاین الفتوح' کو کہ جناب تقدس انتساب امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا سکۂ سخن وری اور متانت عبارت میں دست آویز منشیان چابک رقم

ہے، خلاصہ کر کے ان معنی کو نثر متین میں لکھا اور حق یہ ہے کہ خوب لکھا۔ کہیں کہیں مراعات لفظی کی قید نے اس نثر کو بھی حلیۂ معنی سے معرا کر دیا۔ لیکن بہ ایں ہمہ خوبی اس نثر کی دائرۂ بیان سے خارج ہے۔ مذاق شعر سے بہرہ کم رکھتا تھا، اس واسطے زمین شعر میں کبھی گذارہ نہ کیا۔ مگر اخیر عمر میں ظرافت اور کبر سن کے تقاضے سے یہ فکر بھی دامن گیر ہوا۔ اور از بس کہ نظم میں مہارت نہ تھی، جو کہ اس کی انشا پردازی کی قدرت سے آگاہ نہ تھے، وہ اشعار سن کر نا معتقد ہو جاتے اور زبان طنز کو دراز کرتے۔ غالباً شعر گوئی کی طرف توجہ کرنا اختلال حواس کا نتیجہ تھا اور اس تخلص کا اختیار کرنا بھی اسی پر دال ہے۔ دو تین سال ہوئے کہ جہان فانی سے دل اٹھا کر تلاش ملک بقا میں اپنے آپ کو آگ میں جھونک دیا۔ یہ شعر بہ ضرورت تذکرہ مرقوم ہوا:

جب کہ آنے کی سنی ہم نے خبر دلدار کی
بھر گئی کانوں میں بو اس زلف عنبر بار کی

حیا

حیا تخلص، شاہزادۂ صاحب تمکین مرزا رحیم الدین، خلف زبدۂ شاہزادگان بلند اقتدار، سلالۂ سلاطین کام گار، مسند نشین مجد و علا، مرزا کریم الدین متخلص بہ رسا۔ اگر اس بلند مرتبت کے اوصاف حمیدہ اور اطوار پسندیدہ مرقوم ہوں تو اس دریائے ذخار کی بے پایانی آشنایان بحر معانی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے اور اگر اس سے یک لخت ہاتھ اٹھایا جائے، شوق ثنا کی محرومی جراحت خاطر پر نمک پاش اور ناخن حسرت سے دل خراش ہے ع: گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ سبحان اللہ سخن اعجاز سے ہم پہلو اور معنی سحر سے دو بدو۔ کلام کی اساس کمال پختگی سے بنائے ریختہ اور طبیعت کی گرم جولانی عرصۂ روانی میں عنان گسیختہ۔ ہر لفظ رنگینیٔ معنی سے سبز تہ نما، ہر نکتہ مشکل

اشارات خوبان دل ربا۔ دل نشینیٔ سخن ایسی کہ ہنوز لب سے آشنا نہیں ہوا کہ طبیعت سامع میں جا بیٹھا، اور برجستگی کلام اس درجہ کہ حجلۂ فکر سے اب تک قدم باہر نہیں نکالا کہ جلوہ گاہ صفحہ میں جا پہنچا۔ رسائی ذہن کو معنی بلند سے بام عرش پر ہم آغوشی اور دقت طبع کو مضامین متین سے نشیمن قارون میں گرم جوشی۔ رنگینی کلام غیرت گل، کیفیت سخن رشک مل۔ عرصۂ سخن کی یکہ تازی سے قدم آگے بڑھا کر بساط بازیٔ شطرنج پر منصوبہ پیش بینی کا ایسا چنا ہے کہ اگر ابوزید زندہ ہوتا، اس یکتائے دہر کے ہاتھ سے ایسی ضرب اٹھاتا جیسے زید سے عمرو۔ اگر اوراق کتاب بہ قدر تصنیف بیوت شطرنج بہم پہنچیں پھر بھی حوصلہ ان اوراق کا قابل اس کے نہ ہو کہ شمہ اس کے اوصاف سے ان میں گنجایش پذیر ہو۔ راست فکری اس فن میں ایسی کہ فرزیں باوصف کج روی کے عرصۂ شطرنج میں راست روی کے اندر بادشاہ وقت تھے۔ غایب بازی کا یہ حال کہ اگر حریف گوشۂ خیال میں بساط گستر ہو، اس کی منصوبہ بینی سے جاں بر نہ ہو۔ قوت حافظہ کی اعانت سے کلام الٰہی سے لوح خاطر میں ایسا منقوش ہے کہ آیت وافی ہدایت ''سنقرئک فلاتنسیٰ'' کا مصداق اگر اسی یکتائے دہر کو قرار دیں تو بجا ہے۔ باوجودیکہ اکثر فنون میں علم یکتائی بلند کیا ہے لیکن ملک سخن میں کشور خدایان کمال سے باج ستان اور اقلیم کشایان فضایل کا تاج بخش ہے۔ کثرت افکار گوہر نثار سے دیوان اتمام کو پہنچا اور انہیں ایام میں حلیۂ طبع سے محلی ہو کر بصیرت افزائے اہل انصاف ہوا۔

یہ چند شعر اس دیوان سے انتخاب ہو کر تحفۂ ارباب کمال ہوئے:

ہوتا جو بادباں نہ محمد کی ذات کا
ڈوبا تھا بحر غم میں سفینہ نجات کا

نہ کیوں کر وصل میں تڑپوں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
تڑپنا بستر غم پر، شب تاریک ہجراں کا

دیکھنے پائے نہ دل بھر کر قیامت میں اسے
روز محشر، وصل کی شب کے برابر ہو گیا

اک نہ اک دن جان جاتی آخرش یونہی حیا
مر گئے اس پر تو اس کے دل ہی میں گھر ہو گیا

بن ترے کل قتل کا گلشن میں ساماں ہو گیا
شاخ گل ناوک بنی، ہر غنچہ پیکاں ہو گیا

دل میں وہ موئے مژہ کھٹکا تھا آ کر مثل خار
خار سے سوزن بنا، سوزن سے پیکاں ہو گیا

اب نہ کہنا میں تری فریاد سے رسوا ہوا
شکر کر اس کا کہ جو ہونا تھا واں، یاں ہو گیا

بہاتا ہوں غم عشق بتاں میں رات دن آنسو
بھنور میں آ گیا ہوں، ہے مری آغوش میں دریا

ملایا خاک میں اور اس پہ کہتے ہیں کہ مجھے
کچھ امتحان محبت کا کر نہیں آتا

ممکن ہے کہ رحم اس بت کافر کو نہ آئے
پر ہم کو حیا حال دکھانا نہیں آتا

سنا ہے، یار کہتا ہے، کسی کے کام آؤں گا
جو یہ سچ ہے تو میں بھی قسمت اپنی آزماؤں گا

حاصل دل بیتاب تڑپنے سے نہیں کچھ
معشوق کے آنے پہ، اجارا نہیں ہوتا

کوں محو تماشا ہے مری لاش پہ عالم
کیسہ دو کوئی مرتا ہے، تماشا نہیں ہوتا

اللہ رے لاغری کہ قضا مجھ کو ڈھونڈتی
یاں تک پھری کہ حشر کا میدان آ گیا
رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آ گیا

گلی میں پھینک دیا اس کی میں نے کاٹ کے سر
یہ بوجھ تھا مری گردن پہ سو اتار آیا
بتوں کو چاہ کے ہم تو عذاب ہی میں رہے
شب فراق کٹی روز انتظار آیا
کھلی نہ آنکھ ترے کشتۂ تغافل کی
ہزار شور قیامت اسے پکار آیا

خدا ہی ہے کہ رہے توبہ کعبے جانے تک
قدم قدم ہے تصور شراب خانے کا
وہ بات ہی نہ رہی ذکر غیر آتے ہی
وہ وقت ہی نہ رہا الفت آزمانے کا
کہا بتوں سے تسلی دو آن کر تو کہا
خدا نہیں کہ جو ہم دل رکھیں زمانے کا
رہی جو دل کی طپش یہ تو ہو چکا یارا
شگاف سینہ و چاک جگر سلانے کا

سہل سمجھے تھے دم قتل گراں جانی کو
ہو گیا کام تری تیغ کو دشوار اپنا
دیکھتے ہی اسے کچھ کہہ نہ سکے حشر میں ہم
ہو گیا بند وہاں بھی لب اظہار اپنا

دشمن کو دیا میرے لیے وہ ہی فلک نے
جو کینہ کہ میں نے دل مضطر سے نکالا

یہ انتظار دم مرگ چشم تر میں رہا
کہ مر گئے پہ بھی عالم وہی نظر میں رہا

لحد میں آئے گا آرام اے حیا کیوں کر
جو لوٹتا دل بے تاب یوں ہی بر میں رہا

حق میں حیا کے یارو دعا کیجیو کہ وہ
مصروف وقت مرگ بھی یاد بتاں میں تھا

کیونکہ عالم کو ہو نظارہ ترے دیدار کا
حسن یوسف کی طرح سودا نہیں بازار کا

تھک گئے بہر دعا ہاتھ اٹھتے اے حیا
پاؤں بھی ٹوٹا نہ اک دن چرخ کج رفتار کا

قبا کے ٹکڑے کیے ہیں تو جیب بھی کر چاک
گھڑی گھڑی کی جنوں زور آزمائی کیا

شب فراق ہماری بھی ہو گئی آساں
جو تم نہ آئے تو بس موت بھی نہ آئی کیا؟

پس وصال میسر مجھے وصال ہوا
مرے جنازے پہ بیٹھے رہے وہ ساری رات

جگر کو تھام کے دل کو دیا جو صبر تو کیا
تڑپ تڑپ کے گذاری تو کیا گذاری رات

وہ ناتواں ہوں کہ آیا نظر نہ موت کو میں
قضا پھری مرے بستر کے گرد ساری رات

جگر وہ کیا جو نہ ہو چاک دن میں سو سو بار
وہ دل ہی کیا نہ رہے جس کو بے قراری رات

شروع شام جدائی میں نالہ و افغاں
ابھی تو اے دل مضطر پڑی ہے ساری رات

ترے نزدیک اے زاہد بتان ہند کافر ہیں
مرے آگے خدا کا سجدہ ہو تو ان کے دامن پر

دیتی نہیں ہے ولولۂ جوش عشق چین
تہمت عبث ہے موج نسیم بہار پر

عمر اپنی خیال کمر یار میں گذری
دنیا ہی میں گویا کہ رہے ملک عدم میں

ناصح نہ دل سے ترک محبت کا کر کلام
ایسی سنے تو میں ہی نہ سمجھا لیا کروں

آدمی ہوں نہیں پتھر کا کلیجہ میرا
اس قدر تو نہ ستم کر کہ اٹھا بھی نہ سکوں

فلک نے جذب عدو میں دیا جہاں کا اثر
رکھا نہ کچھ بھی مرے نالہ و فغاں کے لیے

آتے ہی آتے موت کے، یاں عمر ہو چکی
جو ہے سو میری جان کو غفلت شعار ہے

کہتے تو ہیں گھبرائے نہیں پھرنے کے اب ہم
دل بس میں نہ ہووے گا تو کیا کیا نہ کریں گے

پڑے اس میں جو مشت خاک عاشق
تو دریا بوند بھر پانی کو ترسے

توبہ دھری رہی جو وہ آ بیٹھے اے حیا
ہے کس کو اعتبار کہ تم پارسا ہوئے
کیا جانے روز حشر کو کھلتی نہ کھلتی آنکھ
اچھا ہوا اڑا دی جو نیند انتظار نے
محبت اب نہیں کرنے کے چرخ جانے دے
کہ آدمی ہی تو تھے ہو گئی خطا ہم سے

حیات

حیات تخلص، محمد حیات خان ولد احمد یار خاں قوم افغان متوطن قدیم رام پور ساکن حال میرٹھ۔ مرد کریم الاخلاق عمیم الاشفاق ہے۔ اگرچہ بیشتر استفادہ روشن شاہ روشن تخلص سے کیا تھا لیکن نواب مرحوم الٰہی بخش خاں معروف غفر اللہ لہ سے بعد شرف بیعت کے گاہ گاہ فن سخن میں بھی مستفید ہوا۔ تیس برس کے عرصے سے پرمٹ کے سررشتے میں گرد آوری کے عہدہ سے ممتاز ہے۔ یہ دو شعر اس کے نتائج افکار سے بہم پہنچے:

ہم اور بلبل و پروانہ بزم الفت میں
ازل سے کھائے ہوئے دل پہ داغ ہیں دو تین
تیرے بسمل کی یہ حالت ہو تہ خنجر ناز
سر جدا، ہاتھ جدا، پاؤں جدا وجد کرے

حیدر

حیدر تخلص، حیدر شکوہ نبیرۂ مرزا سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم بادشاہ۔ دو سال ہوئے کہ اپنے کہین برادر مرزا نور الدین شاہی تخلص کے ہمراہ لکھنؤ سے شاہجہان آباد میں

آیا تھا اور بزم مشاعرہ میں جو بہ حسب ارشاد حضرت جہاں بانی دربار عام میں مزین ہوتی تھی، مدعیان کمال کی طرح 1 اپنا سخن پڑھتا تھا۔ اس کے سخن نے اصحاب فہم کے دل میں تو جگہ نہ کی لیکن اس نے ایک باغ سبز دکھا کر باریابان سلطانی کے ضمیر صفا تخمیر میں جا پیدا کر لی۔ اب مدت ہوئی کہ زمین لکھنؤ میں سائر اور وہاں ۲ کے سخن طرازوں کی خدمت میں دائر ہے۔ یہ شعر اس کا مرقوم ہوا:

ناز سے جب وہ چلتے ہیں پازیب سے آتی ہے یہ صدا
کافر کہیے ان کو جو انکار قیامت رکھتے ہیں

حیران

حیران تخلص، میر ولایت علی معتبران شاہجہان آباد اور روسائے اقبال مند اس سواد لطافت بنیاد سے ہے۔ سابق سرکار گردوں مدار حضرت ظل سبحانی میں عہدۂ کپتانی سے ممتاز تھا، اب خانہ نشین ہے۔ یہ دو تین شعر اس کی غزل سے انتخاب ہوئے:

ہر بن مو سے ہیں شعلے سے نکلتے پیہم
عشق نے آگ مرے سینے میں بھڑکائی کیا
سر پٹکتا رہوں یا چھوڑ کے سر مر جاؤں
تیری مرضی ہے بتا اے غم تنہائی کیا

۱۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں 'طرف' ہے۔

۲۔ نسخہ ۲ (ص ۲۰۵) 'اردو زبان' غلط۔

شکل تصویر جو حیرت میں ہے تو اے حیراں

اس کی تصویر کسی نے تجھے دکھلائی کیا

حیرت

حیرت تخلص، حافظ عبدالرحمان ساکن جھنجانا۔ زبدۂ شرفائے عظام، اسوۂ نجبائے کرام سے ہے۔ نیک نہادی اور حسن اخلاق اس کے دفتر احوال سے ایک سطر اور خوش وضعی واہلیت اس کے نسخۂ اوضاع سے ایک حرف ہے۔ سینۂ بے کینہ ذخیرۂ کلام الٰہی سے لوح محفوظ کا نمونہ اور رنگ انبساط چہرۂ سلوک کا گلگونہ ہے۔ علم ضروری سے بہرہ ور اور دقایق سخن سے آگاہ۔ کتب درسی کی تحصیل جناب استادی مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ سے کی اور اسی جناب مستطاب سے ریختے کی اصلاح لی ہے۔ یہ چند شعر اس کے نتایج افکار سے ہیں:

لخت جگر رکا ہے آنکھوں میں آ کے ورنہ
طوفاں اٹھائے میری چشم پر آب کیا کیا

کچھ دل میں بے کلی ہے کچھ ہے جگر میں سوزش
ہیں عشق کی بدولت مجھ پر عذاب کیا کیا

پہلو میں اک کسک سی چلی جائے ہے مدام
یہ دل ہے یا چھپا ہے کوئی خار دیکھنا

اے وحشت اپنے آبلۂ پا سے دشت میں
رہ جائے تشنہ لب نہ کوئی خار دیکھنا

دل دے کے دل بروں کو ہوا در بہ در ذلیل
حیرت ہے ہم کو شاق ترا خوار دیکھنا

زندگی کے لطف سے غفلت نے رکھا بے خبر
یوں کٹی ہے عمر اپنی جیسے عالم خواب کا

جولاں سے اس کے ہو کے پریشاں کچھ اور بھی
رتبہ ہوا 1 بلند ہمارے غبار کا

اک دو ہی آنسوؤں میں لگا ڈوبنے فلک
نکلے گی خاک دیدۂ خوں بار کی ہوس

گر شربت وصال نہیں موت ہی سہی
کوئی تو نکلے اس دل بیمار کی ہوس

دین کو زلف و خط و خال و مژہ نے چھینا
دل بھی غالب ہے کہ ہو گا انہیں دو چار کے پاس

ہم جاتے جاتے دیر کو کعبے میں آ گئے
سرگشتگی سے چھوڑ کے راہ صواب کو

سوتے سے تو نے فتنۂ محشر اٹھا دیا
حیرت جگا کے آج پھر اس مست خواب کو

نہ کھلا ہائے مرا غنچۂ امید کبھو
حسرتیں دل کی رہیں دل ہی میں کیا کیا باقی

رہرو راہ فنا سب سر منزل پہنچے
رہ گیا میں ہی فقط راہ میں تنہا باقی

کاش وہ وصل میں پوچھے مرے دل کا احوال
اور کہوں میں بھی جو ہے دل میں تمنا باقی

ہر چند چھپایا نہ چھپا جوش محبت
یہ راز ہوا فاش مرے دیدۂ تر سے

1۔ نسخہ ۲ (۲۰۶) 'ھوگر' غلط۔

اس زردیٔ چہرہ کا کہو حال تو حیرت

کیا دل کو لگا بیٹھے کسی رشک قمر سے

اب دیکھیے کیا جان پہ بنتی ہے خدایا

ہم جی تو چلاا بیٹھے ہیں الفت میں بتاں کی

حیرت کا خدا جانے ہے کیا حال کہ ہمدم

کچھ رات سے آتی نہیں آواز فغاں کی

حیرت

حیرت تخلص، مرزا رمضانی پسر مرزا صمصام الدین، اولاد امجاد مرزا مراد شاہ پسر اعلیٰ حضرت شاہجہان بادشاہ نور اللہ مرقدہ۔ اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ اس پاک نہاد کے حیطۂ تعداد سے خارج ہیں۔ راہ روان عرصۂ معرفت کی محبت اور پیشوایان مسلک طریقت کی ارادت ایسی اس کے دل میں ہے کہ دل عاشق میں ہو اے معشوق اس طرح متمکن نہ ہوگی۔ فن سخن کو مرزا رحیم الدین حیا تخلص سے کسب کیا ہے۔ یہ چند شعر اس کے انتخاب ہو کر لکھے گئے:

کیوں خفا غیر کے کہے سے ہو

کیا سنا تم نے اور کیا دیکھا

دیکھ پاٹ اپنے دامن تر کا

پانی پای ہے دل سمندر کا

وہ خار ہوں کسی سے الجھتا نہیں ہوں میں

دشمن کی آنکھ میں بھی کھٹکتا نہیں ہوں میں

ا۔ نسخۂ مطبوعۂ نول کشور ۱۲۹۹ھ: جلا

دل لگتے ہی یاں جان کے لالے پڑے حیرت
آئے گا ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

حیرت اب یار سے کیوں ترکِ وفا کرتے ہو
پہلے ہی تم نے محبت نہ بڑھائی ہوتی

اب کے گر جی بچے تو اے ناصح
ہاتھ اٹھائیں گے، دل لگانے سے

باب الخاء المعجمة

خالق

خالق تخلص، خالق بخش اکبر آبادی، شاگرد اسیر۔ اس کے یہ اشعار بہ نسبت اور اشعار کے جو راقم کو پہنچے تھے، قابل انتخاب نظر آئے:

تمہاری یاد میں عالم کی یاد بھول گئے
جو یاد کچھ بھی رہی تو ہمیں تمہاری رات
فراق و رنج و الم، یاس و درد و داغ و قلق
کرم سبھوں نے کیا ہم پہ باری باری رات
بندھا خیال جو اس کی جبیں کے افشاں کا
ستارے گن کے ہے خالق نے سب گذاری رات

خاص

خاص تخلص، محمد حیدر خاں پسر الٰہی بخش خاں مرحوم باشندۂ شاہجہان آباد۔ نوجوان نیک اطوار اور پلٹن سپاہیان شاہی

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ: کی

میں منشی گری کے عہدے سے ممتاز ہے۔ اصلاح شعر شاہزادۂ بلند قدر مرزا جمیعت شاہ ماہر تخلص سے لیتا ہے۔ یہ اشعار اس کی بیاض سے منتخب ہوئے:

تھی جدائی گرچہ پہلو میں مرے وہ یار تھا
ناز تھا آزردگی تھی رنج تھا انکار تھا

کاوشیں جھیلیں نہ کیا کیا یاد مژگاں میں تری
گاہ نشتر تھا جگر میں گاہ دل میں خار تھا

دیکھ لے نقشہ اگر اس عالم تصویر کا
تو تو کیا زاہد، دل آئے اس پہ تیرے پیر کا

سخت مشکل ہے کہ ہے وہ شوخ تو نازک دماغ
اور نالہ ہے شعار اپنے دل دل گیر کا

ماہ نو کو دیکھ کر ابرو کو دیکھا چاہیے
دیکھنا منظور ہو اے دل اگر شمشیر کا

کیوں تقاضائے خلش ہر دم نفس کے ساتھ ہے
دل میں شاید رہ گیا ہے کوئی پیکاں تیر کا

ضعف سے اب تو یہ نوبت ہے کہ اے خاص مری
اب تلک سانس بھی آیا تو بمشکل آیا

خادم

خادم تخلص، خادم علی۔ وطن اصلی اس کا لاہور ہے اور اب مدت سے خاک شاہجہان آباد میں اس برات روزی مقرر ہے۔ یہ شعر اس کا سنا گیا:

منتیں جو کہ نہ کرنی تھیں سو کیں پر وہ شوخ
نہ ملا اپنے جگر سوختہ سے پر نہ ملا

خانی

خانی تخلص، مرزا خانی ساکن شاہجہان آباد۔ مرد 1 (کذا) آدمی اور صاحب خلق نیک تھا، لیکن دماغ میں مالی خولیا تھا اور طبیعت میں ہجوم اوہام۔ زمین بازار اس

کے قدم کی گردش سے کم آسودہ ہوتی تھی۔ اس کے اشعار خلل دماغ پر مشعر ہیں۔ فیض سخن سے گاہ گاہ شعر دل چسپ بھی کہ سینۂ دل پر ناخن زن ہو، زبان قلم سے ٹپک جاتا تھا۔ یہ شعر اس کا یاد تھا اور اتفاق سے اسی کے حسب حال ہے:

بے عقلیوں کے کام ہی کرتے رہے سدا
عاشق ہوئے تو یہ بھی خلل تھا دماغ کا

خانی

خانی تخلص، خان جہاں افغان، ساکن شاہجہان پور شاگرد جناب غفران مآب مولوی عبداللہ خاں علوی۔ ذہن سلیم اور طبع قویم رکھتا تھا۔ کتب تحصیلی سے اکثر مقامات مشکلہ جودت حافظہ سے مستحضر تھے۔ گاہ گاہ شعر فارسی کہتا اور حضرت مغفور مرحوم کی نظر اصلاح سے گذرانتا۔ یہ

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ میں ''مرد'' پڑھا جاتا ہے، طبع اول ۱۲۷۱ھ میں صاف نہیں ہے۔

شعر اس کا یاد ہے:

آنکہ بر مستیم انکار بہ بے جا می کرد
چشم میگون ترا کاش تماشا می کرد

خرد

خرد تخلص، بالا پرشاد قوم کھتری، ساکن شاہجہان آباد۔ مرد خوش مزاج، نیک اخلاق، استعداد فارسی میں اقران و امثال سے ممتاز۔ خط نستعلیق کو اس درستی سے

لکھتا ہے کہ درست نویسان روزگار اس کے روبرو اگر اپنی تحریر پر خط شکستہ کا گمان کریں تو عجب نہیں۔ ہر چند طبیعت نہایت موزوں ہے لیکن وارستہ مزاجی سے کچھ فرصت بہم پہنچتی ہے تو فکر شعر کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ غالباً اس کے مزاج کی وارستگی گنج طبیعت سے خزانہ خیال اور گنجینۂ فکر میں منتقل ہو جاتی ہے کہ سخن بھی نہایت بے قراری سے کبھی زمین کاغذ پر قدم رکھتا ہے کبھی نہیں۔ یہ شعر اس کا یادتھا مرقوم ہوا:

یہ ہے پتھر اور وہ گل برگ تر اے جوہری
کیا ہے نسبت لعل کو اس کے لب خوش رنگ سے

خرد

خرد تخلص، پنڈت رام نراین شاگرد حافظ غلام دستگیر مبین۔ یہ شعر اس کا سنا گیا:

تم آپ سے نہیں جاتے یاں سے گھبرا کر
یہ جس کے جذبۂ دل کا اثر ہے کیا کہیے

خرم

خرم تخلص، زبدۂ انام، محمد احمد نام، مرد شیریں گفتار، پسندیدہ کردار، ساکن شاہجہان آباد۔ مروت جبلی ایک جامہ ہے کہ خیال ازل نے اس کی قامت استعداد پر قطع کیا ہے۔ گاہ گاہ فکر شعر کرتا ہے۔ یہ دو تین شعر اس کے سنے گئے:

مر کر بھی نہ چھوٹوں گا ترے ہاتھ سے ظالم
گر اے دل سوزاں مرے پہلو میں رہا تو
جاں تن سے نکل جائے ترے سامنے بے مہر
اک دم کے دم اس خستہ کی بالیں سے نہ جا تو
مانا کہ ہم سے آپ کو نفرت ہے پر اے

کیا کیجیے کہ ہم کو محبت ہے آپ سے

خضر

خضر تخلص، جواں سال و جواں دولت، بلند اقبال، والا مرتبت، عالی دودمان، منیع المکان، فرزند رشید حضرت ظل سبحان، کہیں برادر حقیقی صاحب عالم و عالمیان، ولی عہد خلیفۂ دوران مرزا فتح الملک بہادر دام اقبالہ۔ یعنی نونہال حدیقۂ بختیاری، مسند نشین ایوان کام گاری، فلک رتبت، آسمان رفعت، مسیح گفتار، کلیم زباں، مرزا خضر سلطان بہادر کہ گلشن عمر میں ثمر پیش رس دولت و جوانی سے کامیاب اور چمنستان اقبال میں سرچشمۂ بخت مندی سے سیراب ہے۔ خار اگر اس کے چشمۂ لطف سے نم ناک ہو گل کی لطافت پر طعنہ زن ہو۔ سوسن اگر اس کے انفاس سے فیض یاب ہو سخن سنجان زبان آور کے مقابل گرم سخن ہو۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تحصیل کمال میں مصروف اور روز و شب مشق سخن میں مشغوف ہے۔ یہ چند شعر اس قدر شناس اہل ہنر کے کلام سے منتخب ہوئے:

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر
غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا

لہو میں میرے ہوں رنگیں اگر دیکھوں تو یہ دیکھوں
انہوں کے ہاتھ پر رنگ حنا دیکھا تو کیا دیکھا

نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی نہ سن سکتے ہیں کچھ تیری
ہمیں اس وقت میں اے بے وفا دیکھا تو کیا دیکھا

جام جمشید کو، آئینہ سکندر کو ملا
خضر میں ہو ہوں کہ جسے میں مرے دل آیا

چھٹوں کس طرح پھندے سے بتوں کے

مجھے کچھ بن نہیں آتی خدایا

تار نفس سے ہے بہم الجھا ہوا یہ تار

نکلے گا دم بھی ساتھ جو نالہ رسا ہوا

گالی سے کون خوش ہو مگر حسن اتفاق

جو تیری خو تھی وہ ہی مرا مدعا ہوا

کہتے ہو وہ بھی ہوں پیشہ ہے جیسا تو ہے

مجھ سے اک چھیڑ ہوئی شکوہ عدو کا نہ ہوا

کہتے ہو کہ اک روز تجھے قتل کریں گے

پر یہ بھی تو اے شوخ ستم گر نہیں ہوتا

وہ بھی کیا دن تھے کہ فتنہ رات دن بیدار تھا

خط سے واں رخ سادہ یان آئینہ بے زنگار تھا

تری خاک کف پا سے نہ بدلوں

کوئی دے گر مجھے اکسیر آ کر

پتھر کی چٹائی سے ہو تلوار کو برش

سرمہ جو دیا ہو گئی ان کی نظر اب تیز

مے کشوں کے مزار پر رکھنا

ہوں جو بھیگے ہوئے شراب کے پھول

ظلم ہم پر ذرا سمجھ کے کرو

اے بتو! بندۂ خدا ہیں ہم

واہ ان کا خط کب آیا ہے کہ فرط ضعف سے

کھولنا مشکل ہے خط بال کبوتر 1 سے ہمیں

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved 2002-2006

خلیفہ

خلیفہ تخلص، محب اللہ قوم حجام، مرید با اخلاص حاجی لال صاحب قدس سرہ العزیز۔ استرہ اس کا اسرار حقیقت کا موشگاف اور مقراض اس کی رموز معارف سے گویا۔ اس سے زیادہ اس کے حال سے اطلاع نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شعر اس نے موزوں کر کے خواجہ قطب الدین بختیار کے مزار مبارک پر رکھ دیا، شب کو بشارت ہوئی کہ جو شخص ہنگام سحر اول زیارت کو حاضر ہو اس سے تجھ کو کچھ نفع پہنچے گا۔ اتفاقاً ایک حیز۲ وارد ہوا اور ہنوز اس کی

۱۔ نسخہ اول (ص ۲۱۵) ''کہتو'' غلط۔

۲۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ حیز (بہ معنی مخنث)

زبان کسی حرف سے آشنا نہیں ہوئی تھی کہ حیز اس کا ہاتھ پکڑ کے کسی طرف لے گیا اور جب اس کے پاس سے پھر آیا، تین دن تک مزار فیض آثار پر معتکف رہا، اسی اثنا میں ایک جذب اس کی طبیعت پر غالب ہو گیا لیکن نہ ایسا کہ آثار سلوک سے مانع ہو۔ تمام عمر ترک علایق کے ساتھ بسر کی۔ وہ شعر یہ ہے:

بہ	کلید	کسے	کشاد	نیافت
قفل	رزگاری	مرا	بشکن

خلیفہ

خلیفہ تخلص، رجبی حجام۔ موزون طبع، ظریف مزاج، ساکن شاہجہان آباد تھا۔ راگ و رنگ میں شریک یاران رنگین صحبت اور ضلع اور جگت میں ہم رنگ مصاحبان صادق المودت۔ ایک پہلوان کی ہجو میں چند شعر موزوں کیے تھے، اس میں سے یہ

شعر یادرہ گیا:

اوندھا پڑے ہے نیچے سدا ہر جوان کے
تا لوگ یہ کہیں کہ کبھی چت نہیں ہوا

خلیل

خلیل تخلص، سید ابراہیم علی اکبر آبادی، ساکن محلّہ نوری دروازہ، شاگرد خلیفہ گلزار علی اسیر۔ حال اس کا اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوا۔ یہ چند شعر اس کے منتخب ہو کر لکھے گئے:

وصف دہن تنگ نے خاموش کیا ہے
نے جائے تکلم ہے نہ موقع ہے صدا کا
اس زلف کے پھندے سے رہائی نہیں ممکن
ہرگز نہیں چھٹتا ہے گرفتار بلا کا
وصل کا سنتے ہی مژدہ ہو گیا اپنا وصال
موت کا پیغام تھا قاتل ترا پیغام کیا
کعبہ و دیر میں کس کے لیے پھرتے ہو خلیل
سچ کہو شوق ہوا کس بت ہرجائی کا
تیور بدل کے دیتے ہیں تعظیم ظاہری
بے قدریوں سے ہوتی ہے توقیر آج کل
بے کسی میں نہیں ہوتا ہے کسی کا کوئی
شمع بھی روئی نہ آ کر سر تربت مجھ کو
یوسف کو فقط ایک زلیخا نے لیا مول
وہ کون ہے تیرا جو خریدار نہیں ہے

وارث آدم صفی اللہ ہے تو اے خلیل
حور ہے تیرے لیے باغ جناں تیرے لیے
مل جائے گا موقع جو کبھی داد رسی کا
اے بت تری اللہ سے فریاد کریں گے

خلش

خلش تخلص، فردوس علی نام، ماموں 1 زادہ محمد عبدالحکیم بسمل تخلص۔ ہنوز سن چودہ پندرہ سے متجاوز نہیں اور جودت ذہن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد تحصیل علم سے فراغت حاصل کر لی۔ دسویں برس میں حفظ کلام ربانی اور اکثر کتب نظم ونثر فارسی کی تحصیل سے فارغ ہوا۔ فکر شعر میں تازہ قدم رکھا ہے اور صاحب زادہ جناب صہبائی مولوی عبدالکریم سوز سے شعر کی اصلاح لیتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے مرقوم ہوتے ہیں:

اس سے مل مل کے دلا دیکھ تو کیا کیا نہ ہوا
ہم کو کیا تیرے ہی کچھ حق میں یہ اچھا نہ ہوا
میں جو پامال بھی ہوتا تو ترے قدموں میں
حسرت آتی ہے کہ کیوں خاک کف پا نہ ہوا
کیوں یہ کہتے ہو خلش کو کہ وہ بیمار نہ تھا
کچھ تو آزار اسے تھا کہ وہ اچھا نہ ہوا
کیوں نہ چھوڑا بہار میں صیاد
میری منظور گر رہائی تھی
ضعف سے لب پہ تھم گئے نالے
ورنہ آفت فلک پر آئی تھی

کچھ اثر تھا نہ آہ سے منظور
یہ بھی اک طبع آزمائی تھی

ا۔ نسخۂ اول (ص ۲۱۶) میں 'ماموں'۔

کیا مزے سے خلش گزرتی تھی
جب کہ اس بت سے آشنائی تھی
میرے ہی دل کی طرح یہ بھی نہ ہوئے درد مند
کوئی پوچھے تو کہ یہ کیسا جرس میں شور ہے

خمار

خمار تخلص امرناتھ نام، قوم پنڈت۔ نوجوان خوش وجاہت لطیف مزاج، تیز فکر، اشعار فارسی کی طرف راغب۔ ہرچند اس فن میں ہنوز عالم نومشقی ہے لیکن جو کہ موزوں طبع اور طبیعت معنی یاب واقع ہوئی ہے، سخن خالی لطف سے نہیں ہوتا۔ یہ دو تین شعر اس کے مرقوم ہوتے ہیں:

اے بخت مژدہ باد کہ مشت غبار ما
موج نسیم برد بہ کوئے نگار ما
با چنیں کافر دلے صید حرم نتواں شدن
دل اسیر حلقۂ زلف بتاں داریم ما
دوش با آں جاں شکار نازنیں گفتا خمار
بشنو ای غافل کہ حرفے بر زباں داریم ما

خموش

خموش تخلص، گویائے خوش گفتار، مرزا خدا یار، متوطن قدیم حضرت شاہجہان آباد۔ مدت سے زمین پنجاب اس کی سکونت سے انتخاب ربع مسکوں ہے۔ مرد عزیز الوجود اور مظہر آثار سخا و جود ہے۔ اوایل میں قدر دانی راجا رنجیت سنگھ سے بہت سرمایہ بہم پہنچایا، لیکن کثرت ایثار سے جب دیکھا گیا، جام دانی میں ایک دو جامہ پوشاک کے سوا کبھی ذخیرہ نہ ہوا تھا۔ اب بھی اس نواح میں غالباً حکام وقت کی طرف سے عہدۂ تحصیل داری پر مامور اور حرف اس کے جود و کرم کا زبان خلایق پر مذکور ہے۔ مصداق اس شعر کا گویا وہی بزرگ منش ہے:

نمی باشد نشانے غیر درویشی کریماں را
کہ افشاندن تہی می سازد آخر دست دہقاں را

یہ دو تین شعر اس کے نتایج طبع موزوں سے ایک آشنا کی زبان سے کہ نواح پنجاب سے وارد شاہجہان آباد تھا، مسموع ہوئے:

کیا ترا احوال ہے ہم سے بھی تو کچھ کہہ خموش
آشناؤں سے نہیں اچھا چھپانا راز کا

خموش کس سے نیا اختلاط ہے کہ ہمیں
کچھ ان دنوں کہیں تیرا پتا نہیں ملتا

دیکھ آیا تھا خموش خستہ جاں کو میں وہاں
دل کو دھڑکا ہے کہ کہتے ہیں کوئی مارا گیا

خواہش

خواہش تخلص، آزادہ مرد، نیکو نہاد، میر اللہ دار متوطن الہ آباد۔ مستغنیانہ زیست کرتا ہے۔ چار پانچ برس ہوئے کہ سفر حجاز اختیار کیا، اب تک کچھ خبر گوش زد نہیں

ہوئی۔ اگر راہی **ملک** بقا ہوا، جان اس قدسی جنت کی طوطیان فردوس کے ساتھ ہم نوا ہوا اور اگر حیات مستعار ہنوز اس کے خاکی کا طراز آستیں ہے، وہ لقائے پر ضیا 1 پھر منتظران شاہجہان آباد کی آنکھ کے واسطے بصارت افزا ہو۔ یہ دو شعر اس راقم کے گنجینۂ حافظہ میں مخزون تھے:

تیرے آنے کی دھوم ہے دل میں
حسرتوں کا ہجوم ہے دل میں
ہر قدم پر ہیں آفتیں برپا
چال ہے یا کوئی قیامت ہے

خورشید

خورشید تخلص، خورشید احمد لکھنوی مولد، دہلوی مسکن۔ نسب اس صاف باطن کا چونتیس واسطے سے امیر المومنین حضرت عمر فاروق ابن خطاب رضی اللہ عنہ تک اور پانچ واسطے سے زبدۂ کرام، سلسلۂ عظام، عارف ربانی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت خواجہ محمد زبیر علیہ الرحمۃ و الغفر ان کی مسند خلافت اس حتکی ارایک معرفت کی تمکین سے زیب وافر رکھتی ہے۔ اوایل میں شاہ رؤف احمد سے کہ اس کے برادر عم زادہ اور جناب مستطاب واقف اسرار خفی و انوار جلی شاہ غلام علی مرحوم کے خلیفہ تھے، خاندان نقشبندیہ میں بیعت کر کے اجازت ارشاد مریدان با اخلاص حاصل کی اور پھر شاہ سعد اللہ حیدر آبادی اور حضرت سراپا افادت، سراپا آگاہ، معارف دست گاہ، شاہ احمد سعید مدظلہ العالی علی مفارق المستفیدین سے کہ بالفعل تکیہ گاہ شاہ غلام علی مرحوم میں بجائے والد ماجد مغفور شاہ ابو سعید مبرور کے متمکن ہیں۔ فیض یاب ہو کر از سر نو رہ نمائی طالبان مقصود کی اجازت لی۔ اور اس پر قناعت نہ کر کے اطراف ممالک دور دست یعنی اقصائے نواحی

ہندوستان اور خراسان اور ماوراءالنہر اور ولایت فرغانہ جس کا تخت گاہ خوقند ہے اور بلخ اور بخارا اور سمرقند میں سیر کی اور ہر صاحب کمال سے استفادہ کیا۔ خصوصاً اپنے بزرگان کرام کے مزارات سے فیض بے حساب کسب کیا۔ اشعار فارسی و ریختہ طرز خوش اور روش دل کش کے ساتھ کہتا ہے۔ فن شعر میں اول شاہ رؤف احمد مرحوم مزبور سے کہ متخلص بہ رافت اور اس نیک نہاد کے پیر طریقت تھے اور پھر محمد مومن خاں مومن مغفور اور بعد اس کے مرزا اسد اللہ خاں غالب سلمہ اللہ تعالیٰ سے استفادہ کیا۔ یہ چند شعر اس کے کلام سے منتخب ہوئے:

اشعار فارسی

سوے چمن اے واے پریدن نتوانیم
در موسم گل ریخت فلک بال و پر ما

دیدن بروے خوب تو گیریم جرم ماست
بر حال زار رحم نہ کردن گناہ کیست

عاشق و رندم و بے باک بہ مسجد چکنم
اے برہمن بت و بت خانہ و زنار کجا است

از رقیب آزار، اے دل گر رسد ہرگز منال
از بر اے گل جفاے خار می باید کشید

بی طلب آید و من ہیچ نہ پرسم خورشید
نالۂ من بہ دلش خوش اثرے پیدا کرد

از جاے رفتۂ ز بدآموزیٔ رقیب
لطفے عنایتے کرمے داشتی چہ شد

آخر بگو چگونہ بحق مشتغل شدی؟
خورشید مہ لقا صنمے داشتی چہ شد

ما لعل تو با لعل بدخشاں نہ فروشیم
جنس ست گراں مایہ کہ ارزاں نہ فروشیم

خیزم از مدرسہ و جانب مے خانہ روم
ساغر مے ز کف ماہ جبیناں گیرم

ساقی بخیز و بادۂ گل گوں بجام کن
فارغ مرا ز وسوسۂ ننگ و نام کن

اے صبا نگہت آں رشک چمن باز رساں
مژدۂ دولت دیدار بمن بار رساں

مہ و خورشید یک سو چہرۂ آں سیم تن یک سو
عبیر و مشک یک سو بوے زلف پر شکن یک سو

اشعار ریختہ

کہاں پہلو میں دل خورشید جس کو ہم تسلی دیں
جو کچھ تھا آنسوؤں کے ساتھ خوں ہو کر نکل آیا

پھاڑنے کو اور کیا باقی رہا دست جنوں
چاک دامن ہو گیا پرزے گریباں ہو گیا

جاتا نہیں آنکھوں سے تصور کبھی خورشید
موجود ہے ہر وقت وہ گویا مرے آگے

نوید وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے خورشید
کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے

بتوں کے شعق سے باز آتے ہی نہیں خورشید
ملا ہے تم کو محبت میں کیا مزا کہیے

باب الدال المہملہ

دارا

دارا تخلص، میراں شاہ مرزا دارا بخت مغفور ولی عہد سابق حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی محمد بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ۔ حلم و بردباری و عموم اشفاق و کرم اخلاق ان کی ادنیٰ صفت تھی۔ کاروبار سلطنت ظاہر کو اپنی ہمت عالی کے لائق نہ جان کر پدر بزرگ وار کے سامنے تسخیر ملک مقدس کی طرف متوجہ ہوئے۔ گاہ گاہ فکر شعر اور شیخ ابراہیم ذوق کو اپنے تلمذ سے سربلند کرتے تھے۔ یہ تین شعر ان کے نتائج افکار سے تحریر ہوتے ہیں:

ہم خاک ہو کے آئے ہیں کوچے میں یار کے
لیکن یہ خوف ہے کہ صبا کو خبر نہ ہو

دل سے لطف و مہربانی اور ہے
مہربانی کی نشانی اور ہے

مجھ سے کب ہوتا ہے اب دارا وہ صاف
اس کے دل میں بد گمانی اور ہے

داغ

داغ تخلص ہے شمع افروز بزم محبت، گرمیٔ ہنگامۂ الفت، دوست صداقت التیام، نواب مرزا نام جوان خوش وجاہت کا کہ پاکی سیرت و لطف صورت کو بزم خوبی میں فراہم اور صافی باطن اور حسن ظاہر کو محفل کمال میں باہم رکھتا ہے۔ ادب و تواضع ایک جامہ ہے اس کی قامت احوال پر راست اور خلق و مروت ایک ذخیرہ ہے اس کے گنجینۂ طبع میں بے کم و کاست۔ ضمیر صافی اور فروغ مشرق اور آفتاب شوخی فکر اور

طبع لمعۂ برق اور سحاب، معنی کی رنگینی اور عبارت کی متانت اور الفاظ کی شستگی اور کلمات کی تنگذری حد اوصف سے خارج ہے۔ فن سخن میں شیخ ابراہیم ذوق غفراللہ لہ سے استفادہ، اور فیض استاد اور طبیعت رسا کی امداد سے آرایش بزم کمال میں آمادہ ہے۔ راقم حروف کے ساتھ ایسا ارتباط ہے کہ ربط ظاہری کو اتحاد باطنی سے مبدل کیا اور اختلاط صوری کو صداقت معنوی کی صورت میں ممثل۔ یہ چند شعر اس صاف دل، نیک نہاد کے نتائج طبع سے ہیں:

سب خاک ہوئیں آج مرے دل کی امیدیں
کل تک تو تری ذات سے کیا کیا نہ یقیں تھا

نہیں تاب ستم تو حضرت دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

داغ مہماں سرائے دنیا میں
اور چندے مقام کرنا تھا

ترے وعدے پہ ستم گر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

کب تک کروں تحمل اس نالہ و فغاں کا
سینے سے دل کو پھینکوں جھگڑا ہے یہ کہاں کا

اک آفت زمانہ لڑکپن میں ہے وہ شوخ
کیا ہو گا جب کہ آئے گا عالم شباب کا

لگ گئی چپ تجھے اے داغ حزیں ایسی کیوں
مجھ کو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

ہم جانتے ہیں خوب ترے طرز نگہ کو
ہے قہر کی آنکھ اور محبت کی نظر اور

گر تو کسی بہانے سے آ جائے وقت نزع
ظالم کریں ہزار بہانے قضا سے ہم

تیرہ بختی نہ گئی اپنی، تو جانا ہم نے
کہ کبھی رنگ زمانے کا بدلتا ہی نہیں

ہے کچھ جواب سست مقرر جو اب ادھر
اٹھتے ہیں دیر دیر مرے نامہ بر کے پاؤں

رہتی ہے کب بہار جوانی تمام عمر
مانند بوے گل ادھر آئی ادھر گئی

انہوں نے خط تو بھیجا پر سمجھ میں کچھ نہیں آتا
کہ سو سو طرح کا ہر بات میں پہلو نکلتا ہے

کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری
لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری

سنتے تھے ایک عمر سے طوفان نوح کو
دکھلا دیا مگر مژۂ اشک بار نے

دل و دین کو جس نے دیا ڈبو یہی نامراد ہے اے بتو
کہیں داغ تم نے سنا جو ہو اسی رو سیاہ کا نام ہے

وہ تو ستم کریں گے کوئی مر ہی کیوں نہ جائے
جائے کہیں تو آدمی کہہ کر ہی کیوں نہ جائے

دولہ

دولہ تخلص، مظہر الدولہ نواب جہاں گیر محمد خان خلف میاں امیر محمد خاں والی بھوپال۔ جوان اقبال مند، رستم تواں، حاتم سخا، شیر صولت، ضیغم مہابت تھا۔ ازبس

کہ طبع موزوں اور فکر نکتہ پسند رکھتا تھا، قدر شناسی کمال سے شعرائے بلند سخن صلہ ہائے نمایاں سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ گاہ گاہ بزم مشاعرہ اس کے در دولت پر آراستہ ہوتی تھی۔ اتفاقاً عین ایام شباب میں اپنی کدبانوے دل پسند کی تزویر و کید سے کوس رحلت کو بلند صدا اور عشرت خانے کو ماتم سرا کیا۔ سچ ہے زنان حیلہ ساز کے ہاتھ سے مردان صاف طینت نے زہر ممات چکھا ہے اور ہشیار دلان خردور نے اپنی نقد اوقات کو ان رہزنان بے امان سے حتی المقدور بچائے رکھا ہے۔ "ان کید کن عظیم" ایک حرف ہے ان کی حیلہ سازی کی کتاب سے اور سحر سامری ایک فصل ہے ان کے غدر و کید کے باب سے:

اگر راست بودے ہمہ فعل زن
زناں را مزن نام بودے نہ زن

یہ تین شعر اس والا مرتبت کے مسموع ہوئے تھے، سو لکھے گئے:

پہلو میں بھی میرے وہ گل اندام نہ آیا
مرنا بھی مرا ہائے مرے کام نہ آیا

دل جلوں کو بعد مرنے کے بھی لگ جاتے ہیں پر
راکھ ہو کر اڑ گیا دیکھو پر پروانہ آج

رہے وہ سبز قدم سرخ رو نہ ہوئے کبھی
حنا ترے سر انگشت پر اگر نہ لگے

باب الذال المعجمة

ذکا

ذکا تخلص خوب چند، قوم کایستھ شاگرد قدیم شاہ نصیر مرحوم۔ فکر شعر کو اکل و شرب کی طرح ضروری سمجھ لیا تھا اور جو کہ اطعمہ قوم ہنود کے کم لذیذ ہوتے ہیں، اس کے اشعار کو بھی اس قبیل سے تصور کیا چاہیے۔ تمام عمر کا ذخیرہ اکٹھا ہو کر برابر ''گنج باد آور'' کے ایک دیوان فراہم ہو گیا ہے اور ایک تذکرۃ الشعرا تالیف کیا ہے کہ غالباً سخن وروں کے اسما پر اس طرح محیط ہے جیسے عقل فعال اشیائے موجودات پر۔ یہ چند شعر اس کے افکار سے ہیں:

سواد خط نہ سمجھ اس کے سرخ چہرے پر
یہ **ملک** روم پہ لشکر چڑھا ہے زنگی کا

عالم کو ہوئی دام اسیری سے رہائی
لیکن تری زلفوں کا گرفتار نہ نکلا

اک سایہ ہی رہتا تھا ہر اک وقت مرے ساتھ
سو اس نے بھی دیکھی جو شب تار نہ نکلا

پھینکا کسی نے سینے سے جب تیر کھینچ کر
ک آہ رہ گیا دل دل گیر کھینچ کر

آسیا جب کہ چلے سر پہ ذکا نیند کہاں
ہاتھ سے چرخ کے ڈھونڈے ہے تو آرام کہیں

شہد و شکر سے وہ لب شیریں دو چند ہیں
ان کی نہ بات پوچھ کہ ہونٹ اپنے بند ہیں

نقش پا خالق گیتی نے بنایا ہم کو
جس کے قدموں سے لگے اس نے مٹایا ہم کو

مژہ کو سرمے سے اس شوخ نے کیا ہے سیاہ
رکھی ہے سان پہ تلوار دیکھیے کیا ہو

ذوق

ذوق تخلص، طوطی شکرستان شیریں زبانی، بلبل چمن زار رنگین بیانی، صیرفی نقود کمال، دستہ بند رنگینی مقال بانی بنائے فصاحت، میزاب گلشن بلاغت، فارس مضمار سخن وری، شہسوار عرصۂ معنی پروری، مسند نشین ایوان دانش و آگاہی، استاد حضرت ظل الہی، شیخ ابراہیم مخاطب بہ خاقانی ہند۔ سایۂ تربیت ظل سبحانی میں شب جوانی کو صبح پیری تک پہنچا دیا اور رضائے مرشد آفاق میں اپنے ہوائے نفسانی کو یک قلم مٹا دیا۔ خسرو روزگار کی بہ دولت جس قدر درجہ اعتبار کا بلند ہوا، مرتبہ پندار کا پست اور جتنا دبستان کمال میں ہوشیار رہوا، مے کدۂ عرفان میں مست۔ اس کوہ گراں قدر کے پلۂ وقار میں کاہ، آفتاب روشن اس صاف دل کے فروغ ضمیر کے مقابل سیاہ۔ بلندئ مرتبہ کو لباس خاکساری میں ایسا چھپایا تھا جیسے گرد میں آسمان، رعونت تونگری کو کوب فقر میں ایسا دبایا تھا جیسے زمین کے نیچے گنج شائگان۔ اگر حکم کا پاؤں قلۂ کوہ پر پڑتا، بیخ کوہ گرانی بار سے پشت گاو زمین پر تکیہ کرتی اور اگر علم کی آنکھ باریک بینی کی طرف متوجہ ہوتی، کثرت میں معنئ وحدت کو صورت کثرت سے روشن تر مشاہدہ کرتی۔ تسلیم سے ابرو کی مانند سر وچشم عالم پر جاگزیں، اور افتادگی سے زلف کی طرح چہرۂ خوباں پر 1 مقدم نشیں۔ ہلال ابرو اگر اس صاحب کمال کے آفتاب توجہ سے ایک پرتو لیتا، بدر ہو جاتا اور طفل اشک اگر اس صاحب قدرت کے کنار شفقت میں تربیت پاتا، سنین عمر حد پیری تک پہنچاتا۔ بلندئ سخن کو آسمان سے دعوئ برابری، شیرینئ طرز کو قند سے کلۂ 1 ہم سری۔ قلم کے زور سے ضرب المثل کو طپانچۂ رستم کی توانائی، روح القدس کے فیض سے صریر قلم کو اعجاز مسیحائی۔ سبحان اللہ اس تازہ گفتار

کی طبیعت کیا گلشن سراسر بہار اور کیا گلزار سراپا نگار تھی کہ فضلہ اس کا سبزہ وریاحین سے بہتر اور خاشاک اس کا بنفشہ وسنبل سے خوش تر۔ ہجوم قافلۂ معنی سے ہر بیت میں معانی کثیر منزل گزیں اور کثرت ورود مضامین سے ہر مصرعے میں مضامین متعدد گوشہ نشین۔ ہر چند کثرت انواع سخن سے خود ترتیب دیوان کی طرف التفات نہیں کی لیکن اکثر احبائے صداقت کیش اور تلامذۂ اخلاص اندیش ان

ا۔ نسخہ دوم (ص ۲۱۷) میں ''پر'' نہیں ہے۔

ا۔ نسخۂ دوم (ص ۲۱۷) 'کلمہ'۔

اشعار گوہر نثار سے بڑی بڑی بیاضیں فراہم رکھتے ہیں اور شب و روز مانند فرزند عزیز کے زینہ سے منضم۔ سبحان اللہ زمانۂ قدرنا آشناس کس قدر ناتوان بین اور چرخ سفلہ نواز کیا نادان پرور، دانا کش ہے کہ اس سخن سنج بے عدیل کو گاہ حیلہ ہائے دل کش اور گاہ موانع جاں گزا اور کبھی شعبدۂ ابلہ فریب اور کبھی سوانح ہوش ربا سے اس قدر فرصت نہ دی کہ کواکب نیرۂ سخن کو کہ گردش روزگار سے بنات النعش کا حکم رکھتے تھے فراہم کرتا اور ثریا کی مانند ایک سلک میں انسلاک دیتا کہ مشتاقان فہیم کی نظر اس غیرت ازرنگ سے گاہ نگار خانۂ چین کے نقوش کی رنگینی مشاہدہ کرتی اور گاہ طلسم بہار کی نیرنگی کا لطف اٹھاتی۔ اس نیرنجی مشعبد نے طالبان کمال کی محرومی کے لیے طرفہ سامان کیا۔ ایک طرف ایسا خلق عمیم اس کی طینت میں تخمر کیا کہ دوست بھی اس کے خوان دل نوازی سے کامیاب ہوتے اور دشمن بھی اس کے چشمۂ الطاف سے سیراب۔ خلایق نے جب اس کے مدرسۂ افادہ میں درو دربان نہ دیکھا، شوق نے پاؤں بڑھایا اور کاہلی نے کس و ناکس کی طمع سے ہاتھ اٹھایا۔ صبح سے شام تک تربیت طلاب کمال اور حک و اصلاح سخن سے خواب و خور کی مہلت نصیب اعدا تھی، اور ایک

جانب ہجوم امراض گوناگوں اور افراط عوارض بوقلموں سے 1 عافیت مزاج پر ایسا عرصہ تنگ کر دیا کہ دائرہ صحت نقطۂ موہوم کے حوصلے سے ہم آغوش ہو گیا۔ تفرج گلزار شباب کے آغاز سے سیر مقامات شیخوخت تک حوادث دہر سے بھی نشیب و فراز پیش آتے

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور (۱۲۹۹ھ): نے۔

رہے، اور نقطے بھی اسباب تشویش کے صرف احوال ہوتے رہے۔ ان موانع و عوائق کی مزاحمت کب روا رکھتی ہے کہ پائے ثبات کو دامن فراغ خاطر میں تردد سے باز رکھے، اور خامہ و دوات کی دست یاری سے ذخائر طبیعت کو کبھی نظر ثانی کے زیور اصلاح سے مزین کرے اور کبھی گنجینۂ کتاب میں مخزون۔ روزگار کی اس قدر نا مساعدی سے زمانۂ حال میں پاشکستان 1 مواضع دور دست اور استقبال میں متوقعان نقو دہستی کے حق میں زیان عظیم متصور تھا۔ کاش روزگار غدار اسی قدر ناہنجاری پر بس کرتا۔ اس سفاک دراز دست اور اس بے باک سیاہ مست نے تو حاضران بزم استفادہ پر بھی ہاتھ صاف کیا، اور نہ چاہا کہ چندے اور نعمت الوان فواید تربیت سے کام ستاں اور لذت گیر رہیں۔ اس نقاش صحیفۂ کمال کے نقش وجود کو لوح ہستی سے ایسا محو کر دیا کہ نگاہ طلب اگر خلوت عنقا میں تجسس کرے، نشان نہ پائے۔ حیف! صد حیف ذوق بے چارہ کس ترقی جاہ اور کون سی افزونی مال سے اس تنگ چشم کوتاہ نظر یعنی چرخ ستم گر کا محسود ہوا۔ یہی ایک بیش مایگئ متاع ہنر اور تونگرئ سرمایۂ کمال اس بے ہنر نوازی کی آنکھ میں مثل خار کھٹکتی تھی کہ ایسے نہال بارور کو باغ عالم سے مستاصل کیا۔ عرفی شعرازی کا نوحۂ حسرت کس قدر دل خراش ہے:

از من بگیر عبرت و کسب ہنر مکن

با بخت خود عداوت ہفت آسماں مخواہ

ا۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ: پاشکستگان۔

اجمال زیور تحصیل سے اس طرح محلی ہوتا ہے کہ ماہ صفر سن بارہ سو ایکھتر ہجری میں مرض اسہال نے اشتداد اور ''اعراض گوناں گوں 1 '' نے امتداد بہم پہنچا کر لشکر طبیعت پر شب خون کیا اور ضعف سابق اس مرض کا سر بار اور اس علت کا علاوہ تھا۔ باوجودیکہ زبان کو یارائے حرف زنی اور لب کو طاقت جنبش باقی نہ تھی، صفائے باطن اور جلائے آئینۂ ضمیر کے اقتضا سے جو جو نگار خانہ جہان قدس سے افاضہ ہوتا تھا، بے اختیار انفاس فیض اقتباس کے ہمراہ محفل اظہار میں جلوہ گری کرتا تھا۔ اس کے نفس مطمئنہ کو مبدأ فیاض سے کیا نسبت خاص تھی کہ وہ واردات غیبی جن سوانح سے مشعر تھیں، ان کا ظہور جلوہ گاہ وقوع میں بے تکلف معائنہ ہوا۔ اسی اثنا میں گنجینہ داران خزانہ تحت العرش نے یہ گوہر بے بہا اس جوہری سخن پر عرض کیا:

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

اور طرفہ یہ ہے کہ جب وہ دن گزر گیا اور شب چہار شنبہ آخری ماہ صفر نے، با آں کہ اس کی حیات سے ہنوز ایک رمق باقی تھی، نقاب سیاہ چہرۂ روزگار پر ڈال دی، بہ کشادہ پیشانی خراب آباد عالم صوری سے دل اٹھا کر مسیحان صومعۂ نیل گوں کے ہم پا گلشن جناں کی طرف راہی ہوا اور چہار شنبہ کے روز اس کا جنازہ اس عظمت شان سے اٹھا کہ حاضرین وقت کو: ع

گماں تھا تختۂ تابوت پر تخت سلیماں کا

۱۔ نسخۂ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ: ''اعراض گوگوناگوں''۔

اس اندوہ سے قلم کی زبان شق اور صفحے کا رنگ فق ہے۔ کیا کہیے اور کیوں کر لکھتے۔ جس قدر الم اہل روزگار کے دل پر طاری تھا، اگر سب لکھا جائے، تمام ترکستان کے خدنگ قلم کے واسطے کافی نہ ہوویں اور سواد ہند مداد کے باب میں وافی۔ سخن کی سوگواری کا حال مرقوم ہوتا ہے۔ اشعار نے اس ماتم میں رقم سے لباس سیاہ پہن لیا اور ابیات نے اس غم میں بین السطور سے گریبان چاک کیا۔ قلم دہن دوات میں صورت آہ تھا اور حروف کا لباس سیاہ۔ 'الف' کمال حیرت سے اپنی جائے پر ایسا خشک ہوگیا، گویا اس کے اعضا سے حرکت یک قلم سلب ہوگئی تھی۔ 'بے' فرط غشی سے زمین سخن پر دراز پڑی تھی، ازبس کہ حالت اضطراب میں کچھ سنگ ریزے اس کے اعضا میں چبھ گئے تھے، جن کی نظر فقط اس کی پشت پر واقع ہوئی۔ اس سنگ ریزے کو ایک نقطہ سمجھ کر اس کو 'بے' ہی تصور کیا اور جو لوگ اس کے چہرے کو دیکھتے تھے، بہ قدر زخم کے کسی نے دو نقطے ''تے'' کے گمان کیے اور کسی نے تین نقطہ ''ثے'' کے قرار دیے۔ ''جیم'' اور ''حے'' اور ''خے'' سینہ خراشی کے واسطے ہمہ تن ناخن تھے اور ''دال'' و ''ذال'' کا قامت بار غم سے خم۔ سب حروف نے اسی طرح سے بزم ماتم کو مرتب کیا اور ہر ایک نے روز عیش کو شب:

مقتدائے حکمت و صدر زمن کز بعد او
گر زمیں را چشم بودے بر زمن بگریستے
گوہری بود او کہ گردونش بہ نادانی شکست
جوہری کو تا بریں جوہر شکن بگریستے

بادشاہ گردوں بارگاہ، ملایک سپاہ، سراج الدین محمد بہادر شاہ خلد اللہ ملکہ نے غم استاد سے اس روز جشن موقوف کیا اور ارکان دولت اور اعیان سلطنت میں تہلکۂ

عظیم پڑ گیا۔ حضرت سلطنت پناہ کے کمال التفات کا حال یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چند خلاف آداب سلاطین روزگار ہے، قطعۂ تاریخ اپنی زبان الہام ترجمان سے ارشاد کیا اور چند بار لب گوہر فشاں پر لاکر ذوق مرحوم کے حقوق جاں نثاری کو یاد کیا۔ وہ قطعہ یہ ہے:

شب چار شنبہ بہ ماہ صفر
بہ حکم خداوند جاں داد ذوق
ظفر روئے اردو بہ ناخن ز غم
خراشید و فرمود استاد ذوق

عموم غم اور شمول اندوہ کا حال یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ فصحائے سحباں بیان اور بلغائے شیریں زبان، بل موزوں طبعان تازہ مشق اور کم سودان نو نیاز، سواد مینو بنیاد حضرت شاہجہان آباد کیا، کہ نواحی دور دست کے مواضع وقری 1 میں ایسی گل زمین متصور نہیں کہ وہاں روشن سوادان سطور صحایف سے حرف شناسان رقوم ابجد تک کسی نے زبان خامۂ رنگیں نگار کو حرف تاریخ سے آشنا نہ کیا ہو۔ مسموع ہوا کہ ایک خوش مذاق نے سعی اور تجسس کو کام فرما کر ان قطعات سے کچھ کچھ بہم پہنچائے۔ بعد شمار کے دریافت ہوا کہ تین سو سے زیادہ فراہم ہو گئے تھے۔ سبحان اللہ! رنگ قبول ایک گلگونۂ خداداد ہے کہ روئے شاہد ہنر اس سے گل گوں اور حسن دل ربائے کمال اس سے روز افزوں ہوتا ہے۔ اس راہ میں نہ سعی وکوشش کارگر ہے اور نہ جستجو و تلاش راہ بر:

کسے در مقسم اقبال و ادبار
بغیر از قدرت حق نیست مختار
قبول خاص درگاہ الٰہی
نخواہی یافتن خواہی نخواہی

رموز دانان ہنرور اور گنجینہ داران تواریخ و سیر پر خوب واضح ہے کہ جس وقت سے کوچۂ قلم قوافل معنی کی آمد و رفت کے لیے جادہ اور میدان ورق کاروان حروف و الفاظ کے واسطے فرودگاہ ہے، شعرائے گرامی اور سخنوران نامی کہ سحبان ان کے خوان فیض سے ریزہ خوار اور صاحب ابن عباد ان کے خرمن افادہ سے زلہ بردار ہے، حوصلۂ تعداد سے افزوں مسافر اقلیم عدم ہوئے اور کسی کو اس قدر قبول خاطر خاص و عام روزی نہیں ہوا۔ بازار حسد قدیم سے گرم ہے اور ناتواں بینی ہمیشہ سے بے آزرم۔ کہتے ہیں کہ اس خاک ارم رشک میں کسی مدعی فضل و ہنر نے جب ذوق مرحوم کے ماتم میں صدائے نوحہ کو اس قدر بلند اور دست دشمن کو حسرت و اندوہ میں اتنا سرگرم اور عامی و جاہل کو تلاش مواد تاریخ میں اس حد تک ساعی اور دور و نزدیک کو مراسم عزا میں یہاں تک مستعد دیکھا، قریب تھا کہ پنجۂ حسد سے گریبان طاقت کو چاک کرے اور ناخن غیرت سے سینۂ تحمل کو مجروح، آخر بخیۂ لب گسستہ ہوا اور حرف شکوہ اس پیرائے میں زبان حیرت بیان سے آشنا کہ اگر مجھ کو یقین ہو کہ میری موت ایسی حسرت افزا ہوگی تو اس عزاداری کی ہوس میں اپنا گلا آپ گھونٹ کر مر جاؤں۔ سچ ہے: ع ''مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند'' یہی مرگ ہے۔ ہرچند قطعات تاریخ کہ بالفعل پیش نظر اور سرمایۂ روشن سوادیٔ بصر ہیں، اکثر ایسے ہیں کہ زبان قلم کو ان کے ذکر سے ساکت ہونا عیب سخن فہمی ہے، لیکن جب چشم بصیرت وا اور نظر انصاف بینا ہوتی ہے، دل دردمند بے اختیار صدا دیتا ہے کہ ''اے راہ تلاش میں عناں گسیختہ اور اے عرصۂ طلب میں گرد انگیختہ! اگر قطعۂ حزن انگیز مسمی بہ ''واقعۂ تعب خیز'' (۱۲۷۱) کہ نتیجۂ فکر رسا اور ریختۂ خامۂ بلاغت نگار والی اقلیم سخن وری ناظم مناظم معنی پروری، صاحب زادۂ بلند اقبال جناب کمالات مآب حضرت استادی و مولائی مولوی امام بخش صہبائی، یعنی موجد معانی دل افروز، مولوی عبدالکریم سوز ہے، ان جواہر آبدا کے سلک میں منسلک کیا جاوے تو ان کا حال ان کے روبرو لیعنہٖ

ایسا ہے کہ حسن یوسفی کے بازار میں سیہ چردگان زنگ بار کو عرض کریں۔ اس کی رنگینیٔ کے روبرو وہ نقوش نیم رنگ ہیں اور اس کی متانت کے مقابل ان جواہر بے بہا کی قدر سبک سنگ۔ اور اگر یک قلم اس کے اظہار سے اغماض علم میں آئے، مذاق سخن فہمی کی محرومی کا کیا جواب؟ ناچار تشنگی شوق کا علاج اسی آب سے اور خمار طلب کا چارہ اسی شراب سے کرتا ہوں، تاکہ سرمستان مصطبۂ انصاف پر منکشف ہو جائے کہ شستگی الفاظ و پاکیزگی معانی و چستی تراکیب و سیرابی اداو بے تکلفی مواد تاریخ کس قدر دعوے داران کمال کی دندان شکن ہے:

واقعہ تعب خیز

صبح دم نکلا میں اپنے گھر سے با آہ و فغاں
ذوق کے مرنے کا جب مشہور افسانا ہوا
جا کے اس بیگانہ خو، نا آشنا، بے مہر سے
یوں کہا میں نے کہ کیا ہنستا ہے تو بیٹھا ہوا
آج وہ دن ہے کہ ہر جا نالہائے زار سے
حشر سے پہلے ہی اب اک حشر ہے برپا ہوا
لب پہ نالہ، دل میں غم، سینے میں درد جاں گداز
اس طرح تیغ الم کا ہے ہر اک مارا ہوا
تجھ کو بھی کچھ حال سے ہے اس کے ظالم اطلاع
جس کی ماتم داریوں کا یہ اثر پیدا ہوا
مجھ سے ہنس ہنس کر لگا کہنے کہ اے دیوانہ وش
یہ جو ہے ہرزہ درائی تجھ کو ہے سودا ہوا
کچھ سمجھ میں میری تو آتی نہیں باتیں تری
ہے عجب تجھ سا خرد مند آج دیوانا ہوا

کچھ سبب تو مجھ سے کہہ اس کا کہ اب کس واسطے
خندۂ گل چھوڑ کر شبنم صفت رونا ہوا

میں نے یہ سن کر کہا اس سے کہ اے خانہ خراب
سنگ دل تجھ سا تو کوئی بھی نہیں پیدا ہوا

ہوتے ہیں سارے بتان بے وفا غفلت شعار
پر نہ ایسے جس قدر اب تو ہے بے پروا ہوا

تجھ کو بھی شاید خبر ہو ذوق نام اک شخص تھا
اتفاقاً دیکھ کر تجھ کو ترا شیدا ہوا

ایک مدت سے تری آنکھوں کا وہ بیمار تھا
کی دوا مقدور تک لیکن نہ کچھ اچھا ہوا

آج لے کر حسرتیں سی حسرتیں سوئے عدم
ہو گیا راہی جہاں سے اور تن تنہا ہوا

ہائے یاں سے اس طرح ہو ہو کے دل برداشتہ
عازم ملک عدم اب وہ سخن آرا ہوا

واں خدا جانے اسے کس کی محبت لے گئی
جو گیا اس طرح وہ جلدی سے گھبرایا ہوا

گرد تھا وہ دامن رحمت پہ اڑ کر جا پڑا
پست تھا وہ جا نشین مسند اعلا ہوا

توبہ توبہ دامن رحمت پہ کار گرد کیا
یہ خطا کا حرف سرزد مجھ سے اب کیسا ہوا

پاک تھا وہ آب ذات پاک ہی میں مل گیا
نور تھا وہ نور ہی میں جا کے پوشیدہ ہوا

ایک جوہر تھا کہ وہ معدن میں جا کر چھپ رہا
ایک قطرہ تھا کہ جا کر واصل دریا ہوا

کیا کہوں میں اس کے جیتے جی جہاں میں کون کون
دشمن جانی بنا اور درپئے ایذا ہوا

تجھ کو بھی ہر دم سدا ذوق دل آزاری رہا
تو نے جو جو ظلم اس کی جان پر چاہا ہوا

اور رقیبوں نے نہ کب چاہا کہ کیجیے اس پہ ظلم
وہ نہ کس دن تختۂ مشق ستم ان کا ہوا

اب جو وہ سوئے عدم راہی ہوا تقدیر سے
ہر کسی کے لب پہ حرف افسوس کا پیدا ہوا

لیکن اب افسوس و حسرت کرنے سے کیا فائدہ
اس کے حق میں تو جو کچھ اے یار ہونا تھا ہوا

اس کو تو مرنا تھا آخر رنج سہہ کر مر گیا
گو کسی کے لب پہ اب اک شور واویلا ہوا

اب تو گر بالفرض تجھ سے تنگ دل بے مہر نے
اس کے مرے کا کیا افسوس تو بھی کیا ہوا

گو کہ ان باتوں سے اب وہ جی تو اٹھنے سے رہا
پر مجھے حسرت ہے یہ ظالم کہ کیا سے کیا ہوا

ہائے وہ عاشق کہ لیتا تھا تجھے آغوش میں
اب وہ آغوش لحد میں آپ آسودا ہوا

ہائے وہ سر جس کو رکھتا تھا ترے در پر سدا
اب وہ چادر میں کفن کی ہے پڑا لپٹا ہوا

وہ دماغ اس کا کہ تھا افکار سے افلاک پر
قبر میں اب جا کے زیر خاک پست ایسا ہوا
وہ جبیں جس میں کہ تھی تیری ارادت سر بسر
قبر کی محراب میں اس کا ادا سجدا ہوا
ہائے وہ ابرو کہ جس کے خم میں تھے سو سو نیاز
اس کا ہر ہر بال ہے اس قبر میں بکھرا ہوا
خشک ہو کر ہائے اب مشت خس و خاشاک ہے
وہ مژہ جس کا کہ ہر ہر قطرہ اک دریا ہوا
ہائے وہ آنکھیں کہ ہر دم مایل دیدار تھیں
ان کو ہر دم منتظر یوں قبر میں رہنا ہوا
ہائے وہ چہرہ کہ تھا سرخ اشک خوں آلود سے
ناخن حسرت سے ہے سو جا سے اب چھیلا ہوا
خندہ ہائے عیش سے تھا جو دہن مانند گل
خود بخود افسردہ ہو کر اب وہ اک غنچا ہوا
ہائے وہ لب جو ترے بوسے سے شیریں کام تھا
اب وہ زہراب اجل سے اس طرح کڑوا ہوا
وہ زباں جس سے کہ تیرا ذکر کرتا تھا مدام
خامشی کا اب اسے آزار ہے گویا ہوا
تھا سدا جس کان کو تیرے سخن کا اشتیاق
قبر میں اس کو سخن ناجنس کا سننا ہوا
ہائے وہ گردن کہ تھی قابل تری تلوار کے
اس میں ہے طوق گریبان کفن ڈالا ہوا

وہ گلو جس پر کہ تیری تیغ چلتی بار بار
قبر مین تیغ اجل سے ہے پڑا کاٹا ہوا

رنج سے جو دوش رہتا تھا ہمیشہ بار کش
قبر میں جا کر وہ بارے خوب ہی ہلکا ہوا

تیری گردن میں حمایل رہتے تھے جو ہاتھ اب
رکھ کے چھاتی پر انہیں سوئے عدم جانا ہوا

ہائے وہ ناخن کہ تھا سینہ خراش الماں وار
اب وہ یوں بیکار ہے گویا کہ ہے ٹوٹا ہوا

ہائے وہ سینہ کہ مخزن تھا ترے اسرار کا
اب خزانے کی طرح مٹی میں پوشیدا ہوا

تھا سدا جس پشت کو تکیہ تری دیوار کا
اب زمین قبر کا اس کے لیے تکیا ہوا

ہائے وہ دل جس میں تیرا دھیان رہتا تھا مدام
اب وہ جا کر قبر میں مٹی سے آلودہ ہوا

وہ جگر جس پر کہ داغ عشق کھائے تھے سو اب
دل لگی کے واسطے پھولوں کا گلدستا ہوا

وہ قدم جس کو کہ ہر دم پھرنے ہی سے کار تھا
اب وہ زنجیر کفن میں ہے پڑا جکڑا ہوا

ہائے وہ تن جو تری الفت سے تھا شاداب سو
اب ہے دامان کفن میں خار سا الجھا ہوا

اس طرف شاید ترے گھر کا گماں ہو گا کہ ہے
قبر میں کعبے کی جانب اس کا منہ پھیرا ہوا

ہائے وہ مے کش کہ تیرے ساتھ پیتا تھا شراب
اب اسے خون جگر پینا وہاں تنہا ہوا
اس کے خون دل نے ہے کارِ مئے گلگوں کیا
اس کا دل ہے واں بجائے شیشہ و مینا ہوا
کچھ تو تھا ہی مست وہ تیری مئے دیدار سے
اب اجل کی مے سے ہے وہ اور بھی بہکا ہوا
مستیوں سے ہو چکا ہشیار وہ محشر کو بھی
گر یونہی بادے پہ 1 بادہ اب نشہ افزا ہوا
ہائے وہ بلبل کہ تھی تیری گرفتار قفس
گوشۂ تاریک قبر اس کے لیے پنجرا ہوا
ہائے وہ قمری کہ تھی وارفتہ تجھ سے سرو پر
اب نصیب اس کو وہاں نظارۂ طوبا ہوا
درد و غم، رنج و الم یوں ہیں پریشاں اس بغیر
جس طرح سے کارواں ہووے کوئی لوٹا ہوا
آہ و فریاد و فغان و نالہ بیکس ہو گئے
قافلے کا قافلہ تاراج یہ سارا ہوا
عشق اس بن ہو گیا اس طرح سے خانہ خراب
جس طرح سے شہر اجڑ جائے کوئی بستا ہوا
سینہ بریاں، دیدہ گریاں، درد دل، درد جگر
کیا کہوں میں سانحے سے ذوق کے کیا کیا ہوا
جاں گدازی، دل خراشہ، سینہ کوبی، سر زنی
وہ وہاں پنہاں ہوا اور یاں یہ کچھ پیدا ہوا

صرف مجھ کو ہی نہیں کچھ اس کے مرنے کا الم
یہ غم و اندوہ تو سارے میں ہے پھیلا ہوا
چرخ اس صدمے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اڑ گیا
یہ زمیں لرزی کہ گویا حشر اک برپا ہوا
اس الم کی کب کہ پہنچیں گرمیاں خورشید کو
ایک تو وہ آگ تھا ہی اور بھی دونا ہوا

ا۔ نسخۂ دوم (ص ۲۲۴) ''ساغر پہ ساغر''۔

قصہ کوتہ کب تلک اب کیجیے طول کلام
اس کا مرنا تو قیامت کا نمونہ سا ہوا
گذرے ہیں دنیا میں کیا کیا شاعران باوقار
اس قدر رنج و الم کس کس کے مرنے کا ہوا
اس قدر تاریخ کس کے مرنے کی مشہور ہے
اس طرح کس کے لیے اس بات کا چرچا ہوا
اس کے مرنے کا یہاں تک غم ہوا سب کو کہ اب
ہر کوئی تاریخ میں اس کی سخن آرا ہوا
اور اگر تجھ کو نہ آئے میرے کہنے کا یقیں
یا کہ پیدا وہم میری حیلہ سازی کا ہوا
تو سنا دوں تجھ کو اب میں مادۂ تاریخ کا
بے کم و بے کاست جیسا جس کے لب سے وا ہوا
خلق کہتی تھی کہ ہے اب ماتم استاد شاہ

جب کہ اس دنیائے دوں سے انتقال اس کا ہوا
اور قوم ''جن'' کہ پیدائش ہے اس کی آگ سے
اصل خلقت میں خمیر آتش سے ہے اس کا ہوا
یوں کہا اس نے جو دیکھا خاکیوں کا یہ خروش
خاک کو لو اور قصد عالم بالا ہوا
جب گیا اس جا سے وہ پیش خدائے لا یزال
اس نے فرمایا یہ ہے کان ہنر بخشا ہوا

۱۲۷۱ھ

آسماں نے یوں کہی ہے اس کی تاریخ وفات
مجھ سے بے جا خانماں برباد کیوں اوس کا ہوا

۱۲۷۱ھ

اور زمیں نے یہ کہا سو حسرت و افسوس سے
جب کہ اس کو یاں سے عزم عالم بالا ہوا
میرے سر سے سایہ اپنا یوں اٹھا لے ہائے ہائے
وہ کہ دنیا میں فلک ہے خاک در اوس کا ہوا
ہاتھ مل مل کر یہ کہتا تھا فرشتہ موت کا
جاں تو لی اس کی اجل نے اور میں رسوا ہوا
اور اجل کہتی تھی حسرت سے یہ شرماتی ہوئی
مجھ سے ایسا آدمی افسوس کیوں کشتا ہوا
نوحہ گر تاریخ میں اس کی ہوئے یوں آشنا
مر گئے سب دوست گویا اوس کا مرنا کیا ہوا
دشمنوں نے جب سنا یہ ماجرائے جاں گداز

یوں ہر اک تاریخ میں اس کی سخن آرا ہوا
مر گیا ذوق سخن ور قبلۂ اہل زماں
حیف ایسا شخص یوں آنکھوں سے پوشیدا ہوا
گو کہ دشمن تھا مگر اک چھیڑ تو آپس میں تھی
آج ہر دم دشمنی کا ہائے ہنگاما ہوا
آدمی کیسا ہی ہو پر مر کے پھر جیتا نہیں
تھا عدو لیک اب مرنا ہی قہر اوس کا ہوا
اور وہ حاسد کہ جس کو دشمنی تو کچھ نہ تھی
صرف اک دل میں حسد کا خار تھا بویا ہوا
اس نے سن کر یوں کہا سو حسرتوں سے ہائے ہائے
خانۂ فردوس میں یوں وہ اب آسودا ہوا
اور بھی زائد ہوا جس دم حسد تو پھر کہا
حسرت و اندوہ سے یوں عرش کا تارا ہوا
اور کہا ان دوستوں نے جو کہ تھے عاشق مزاج
عشق بازی کا ہے کیا تاراج اب جلسا ہوا
اور عشق فتنہ گر نے بھی کہا افسوس سے
مر گیا اب قدر داں میں آج یوں تنہا ہوا
نوحۂ اندوہ یہ پہنچا جو بزم عیش میں
حلقۂ ماتم وہ حلقہ بزم عشرت کا ہوا
شمع نے سوز دروں سے جل کے رو رو کر کہا
جب کہ اس پر حسرت و اندوہ کا غلبا ہوا
آتش اندوہ سے دل ہو نہ اب کیوں کر کباب

وائے مجھ کو چھوڑ کر اب وہاں اشرف افزا ہوا
بلبل آتش زباں نے سن کے حسرت سے کہا
کھلتے کھلتے آہ یہ گل آج پژمردا ہوا
طوطیِ شیریں دہن بھی یوں ہوئی شکر شکن
نخل طوبیٰ پر ہی جا کر زمزمہ پیرا ہوا
قمریِ جادو بیاں بھی یوں ہوئی گرم نوا
وہ نہیں تو سرو معنی ہے یہ کچھ اوکھڑا 1 ہوا

ا۔وہاں کو ''واں'' پڑھیں گے، لیکن ہائے ہوز کو گرا نہیں سکتے، شامل تاریخ ہے۔ (فائق)

۲۔''اوکھڑا'' کا واو شامل تاریخ ہے، خلاف نہیں کر سکتے۔ (فائق)

بلبل و طوطی و قمری سے یہ سن کر سانحہ
ساکنان باغ میں اک حشر سا برپا ہوا
کھول کر آنکھیں کہا نرگس نے ہر سو دیکھ کر
حیف گویا نور چشم آنکھوں سے پوشیدا ہوا
اور وہ سنبل کہ جس کی زلف عنبر فام میں
سینکڑوں عاشق مزاجوں کا ہے دل اٹکا ہوا
قطعہ یہ ایسا کہا اس نے زبان حال سے
بحر درد و غم میں ہے جو سر بہ سر ڈوبا ہوا
ذوق کا صدمہ ہر اک صدمے سے ہے جاں کاہ تر
موج زن مرنے سے اس کے رنج کا دریا ہوا

کیا کہوں کس کس طرح دل کو پریشانی ہوئی
کیا لکھوں جس جس طرح سے جان کو سودا ہوا
جس کو کنج باغ کہتے تھے خزان درد سے
یوں ہوا ویراں کہ گویا دامن صحرا ہوا
بس کہ اس کے غم میں روتے طائران بوستاں
آب جو کا بڑھ کے ہر ہر قطرہ اک دریا ہوا
خار خار درد سے سبزے کا سینہ چاک ہے
کاو کاو رنج سے دل خون لالے کا ہوا
سرو کو دیکھو تو حیرانی سی حیرانی ہوئی
غنچے کو دیکھو تو دم بھر میں پریشاں سا ہوا
فکر تھا تاریخ کا مجھ کو کہ یہ دل نے کہا
ہائے بیٹھے بیٹھے اور ایک 1 جان کو سودا ہوا

۱۲۷۱ھ

۱۔ 'ایک' کی یائے اعداد تاریخ میں شامل ہے اس لیے گرا نہیں سکتے۔ (فائق)

سوسن شیریں زباں نے سن کے یہ حال تباہ
یہ کیا شیون کہ اس کا تن بدن نیلا ہوا
گو کہ اس کو تھا نہ اصلا بات کرنے کا دماغ
پر نہ اتنا چپ بھی رہنے کا اسے یارا ہوا
اور اظہار غم و درد و الم کے واسطے

قطعۂ تاریخ میں یوں اس کا لب گویا ہوا
آہ واویلا کہ اب باد بہاری کی طرح
کوچ باغ دہر سے ہے ذوق یکتا کا ہوا
اس کے جانے سے عجب اک دل میں میرے درد ہے
میں تو کیا یہ درد سب عالم میں ہے پھیلا ہوا
کیا ہو رونق جب کہ وہ ہی رونق گلشن نہیں
کیا مزا جب باغ ہے اس بن پڑا اجڑا ہوا
ہائے کیا گل تھا کہ جس سے تھا شگفتہ باغ دہر
ہائے کیا بو تھی کہ تھا جس سے چمن مہکا ہوا
بات کہتے کس سے جا کر اپنے دل کے راز کی
جب کہ پنہاں خاک میں وہ راز داں ایسا ہوا
کون ہے قابل کہ جس سے کیجیے کچھ گفتگو
جب کہ پوشیدہ نظر سے ہم زباں اپنا ہوا
آپ گر کہیے زمیں کی تو وہ سمجھے چرخ کی
یوں کسی سے راز کہیے بھی تو حاصل کیا ہوا
اب تو چپ ہی بیٹھ رہنا ہے مناسب ہر طرح
جب کہ اپنے پاس سے گم وہ سخن آرا ہوا
خامشی بہتر ہے اب اول تو ہر ہر بات میں
اپنے دل سے کہہ لیا ایسا ہی گر کہنا ہوا
اور کچھ کہتے تو کہتے اس کی یہ تاریخ موت
ہے چمن کا رنگ بے طور آج تو بگڑا ہوا
رفتہ رفتہ مے کدے میں جب یہ پہنچا واقعہ

ہر طرف اک غل ہوا اور ہر جگہ غوغا ہوا

مے کشوں سے مغ تلک اور مغ سے تا پیر مغاں

جس کو دیکھو سر سے تا پا رنج کا پتلا ہوا

گوش مینا میں کہا قلقل نے پنبہ کھینچ کر

تجھ کو بھی اس کی خبر ہے کچھ کہ ناداں کیا ہوا

مر گیا وہ ہم جلیس مجلس عشرت فزا

تھا بڑا ہی یار باش، اب ایسا کب پیدا ہوا

سن کے مینا نے کہا جھک کر یہ گوش جام میں

بے خبر اس طرح سے ہنستا ہے کیا بیٹھا ہوا

میں نے قلقل سے سنا ہے ذوق نے پائی وفات

لالہ ساں ہر اک کے دل پر داغ غم تازا ہوا

جام سے یہ واقعہ سن سن کے ہر اک مے پرست

ہاتھ سے ساغر پٹک کر اس طرح گویا ہوا

ساقیا بھرتا ہے کیا ساغر شراب ناب سے

برہم و درہم ہے جب وہ عیش کا جلسا ہوا

کس کو رنجش سے دماغ اتنا کہ ہو پابند عیش

کس کو فرصت رنج سے جو مے پیے بیٹھا ہوا

تیرے کانوں تک نہیں پہنچا مگر یہ واقعہ

تو جو سرگرم نشاط و عیش ہے ایسا ہوا

یعنی استاد شہنشہ، ذوق عالی مرتبت

چھوڑ کر دنیا کو راہی جانب عقبیٰ ہوا

بادۂ عشرت کو گر چکھو تو ہے وہ تلخ تلخ

خانۂ خمار کو دیکھو تو ویرانا ہوا
نغمۂ عشرت اگر سن لے کہ بزم عیش میں
نوحۂ اندوہ ہے اس طرح سے پھیلا ہوا
مطرب شیریں نوا چاہے کہ لائے زور سے
تو بھی پھر جائے دہن سے لب تلک آیا ہوا
یہ تو وہ غم ہے کہ اس کے صدمۂ جاں کاہ سے
دم میں سو سو طرح سے عالم تہ و بالا ہوا
کوچے کوچے میں بھرا ہے بس کہ یہ درد و الم
اس کے ہر ہر گام پر اک حشر سا برپا ہوا
جاں گداز و جاں خراش و جاں ستان و جاں گسل
اس کا غم پیدا ہوا اور اس طرح پیدا ہوا
کان درد و درد جان و رنج۔ رنج و رنج دل
ایسا ایسا باعث غم اس کا مر جانا ہوا
ہے سزا تاریخ میں اس کی اگر یوں کہیے اب
حیف سب برہم وہ جلسہ مے پرستی کا ہوا
اور ساقی کو تردد تھا کہ اب کیا کیجیے
درد و غم اس کا تو دامن گیر ہر اک کا ہوا
دیکھیے انجام کیا لائے خمار اس کا کہ اب
نشۂ اندوہ سے ہر مست ہے بہکا ہوا
اس خم دنیا سے باہر آ کے اب اس کو عروج
عالم بالا پہ مثل نشۂ صہبا ہوا
ہاتف میخانہ بولا جب سنا یہ ماجرا

آہ میخانا پڑا ہے اوس بن اوجڑا ہوا

حلقۂ شیون میں اس کے ماتم پر درد سے

نوحۂ جاں کاہ کا جب شور و غل برپا ہوا

رہروان شاہ راہ شرع نے سن کر کہا

سود بھی ماتم سے کچھ جو حق نے چاہا تھا ہوا

اس کے شاگردوں پہ جب یہ ماجرا ظاہر ہوا

شعر یہ تاریخ میں سب کی زباں سے وا ہوا

کون فرمائے گا ہم پر مہربانی اس طرح

تھا عجب استاد وہ یک بار ناپیدا ہوا

سوز سے میں نے کہا تو کس لیے خاموش ہے

ایک عالم جب کہ ہے اس میں سخن آرا ہوا

تو بھی تاریخ وفات ذوق کا کچھ فکر کر

ہو کے شاعر بزم میں تو کس لیے چپکا ہوا

بس کہ تھا وہ صاحب فکر رسا فوراً کہا

دیکھتے ہی دیکھتے اب یار کیا سے کیا ہوا

۱۔ نسخۂ دوم (ص ۲۲۷) میں مصرع: ''آہ میخانہ پڑا ہے اوس کے بن اوجڑا ہوا'' ہے۔ تاریخ اس مصرع سے نہیں نکلتی ہے۔ اور نسخہ اول میں ''مے خانہ'' کی صورت میں ۱۲۷۲ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ایک عدد زائد۔ (فائق)۔

بس کہ تھیں اس کی طبیعت میں بھری جولانیاں

ایک قطعہ اور بھی اس کی زباں سے وا ہوا

ذوق کو ہر چند کرتے تھے یہ فہمایش کہ گر
دل دیا تو نے کسی کو یا کہیں شیدا ہوا
تو سمجھ لیجو کہ قیس و کوہ کن کی طرح سے
کوچے کوچے میں جہاں آباد کے رسوا ہوا
ذلت و خواری و رسوائی سے بھی قطع نظر
مجھ کو تو اک اور غم اس سے فزوں پیدا ہوا
یعنی اس میں جان کا بھی خطر انجام کا
جان سے جاتا ہے آخر عشق کا مارا ہوا
میری باتوں کو کسی صورت نہ لایا دھیان میں
میرا کہنا کار گر اس کو نہ کچھ اصلا ہوا
آخر اس نے خود سری کو کام فرما کر کہیں
دل لگایا اور عاشق اک پری وش کا ہوا
مختصر قصہ کہ سہہ سہہ کر جفائیں مر گیا
ہم کو جس کا ہر گھڑی ڈر تھا وہ اب دیکھا ہوا
اس توقع پر کہ شاید دل کی گرمی دور ہو
اور بھی اس طرح سے تاریخ میں گویا ہوا
یہ تو میں کہتا نہیں اے دل کہ مرنا ذوق کا
نا درست و نا مناسب اور نازیبا ہوا
کیوں کہ یہ باتیں بہ حسب خواہش تقدیر ہیں
گفتگو اس امر میں تقدیر سے لڑنا ہوا
جو قدر نے بات سوچی تھی وہی آخر ہوئی
جو قضا نے پردۂ تقدیر میں چاہا ہوا

لیکن اتنی بات تو ہے یہ کہ اپنے گھر میں میں
فکر میں تاریخ کی تھا ایک دن بیٹھا ہوا

لب پہ گستاخانہ میرے آ گیا بے ساختہ
آہ اے دل اس کا مرنا تو بہت بے جا ہوا

اور بھی اس نے کیا یہ قطعۂ نادر رقم
شورِ تحسین از زمیں تا آسماں جس کا ہوا

جس کا ہر مصرع ہے کامل مادۂ تاریخ کا
اس کی نسبت تو یہ اک اعجاز ہے گویا ہوا

مر گیا اے وائے وہ انساں کہ یہاں۱ ہر بات میں
مثل اوس۲ کا آج تک اے دل نہیں پیدا ہوا

سال فوت اوس کی لکھی ہم نے بصد آلام و درد
سر پہ نازل یہ الم تو وائے جاں فرسا ہوا

خامۂ جادو اثر کو پھر کیا گرمِ رقم
سامعانِ نکتہ ور کا جب کہ کچھ ایما ہوا

یاد ایامے کہ بستے تھے یہاں عیش و نشاط
اب تو کوچہ کوچہ دہلی کا الم خانا ہوا

یاد ایامے کی تھی یہ گل زمیں گل زار عیش
جا بجا تختہ گل سوری کا تھا پھولا ہوا

۱۔ 'یہاں' کی ہائے ھوز شامل اعداد ہے، گرا نہیں سکتے۔
۲۔ 'اوس' کا واؤ شامل اعداد ہے۔

لالہ و سنبل میں داغ اور پریشانی نہ تھی
بس کہ ر پر اک خوشی کا ابر تھا چھایا ہوا
سرو، گل کو تھی نہ ایسی حیرت و چاک جگر
قمری و بلبل سے بھی سر زد نہ یوں نالا ہوا
وہ ہی دہلی تھی کہ ہر ہر طرف سے آباد تھی
وہ ہی دہلی ہے کہ ہر ہر گھر ہے اب اجڑا ہوا
ایک اک ذرہ یہاں کی خاک کا تھا عیش خیز
جس جگہ اب درد اور اندوہ کا صحرا ہوا
ایک اک قطرہ یہاں کے بحر کا تھا موج لطف
جس کی ہر ہر موج سے اب درد کا دریا ہوا
گردش افلاک سے کیا کہیے کیا آفت پڑی
انقلاب دہر سے میں کیا کہوں کیا کیا ہوا
قصہ کوتہ جب کہ میر و درد و سودا مر گئے
اور ان کے مرنے سے اک حشر سا برپا ہوا
سر زمیں جتنی سخن کی تھی سو ویراں ہو گئی
گویا پہلا وہ عالم ہی تہہ و بالا ہوا
از سر نو پھر ہوا تعمیر کے درپے فلک
اس خرابے کی کہ تھا یکسر وہ ویرانا ہوا
یعنی اقلیم سخن پھر ہو گئے آباد سے
شاعری و شعر کا پہلا سا پھر چرچا ہوا
جب کہ اک استاد سے ہر وقت میں ہے ناگزیر
شیخ ابراہیم ذوق استاد شہ پیدا ہوا

ا۔ نسخۂ اول (ص ۲۳۵) گوگیا۔

بادشاہ قدرداں بھی بس کہ تھا رتبہ شناس
اس پہ اپنی مرحمت سے وہ کرم فرما ہوا
اور عنایت کر کے خاقانی ہند اس کو خطاب
نکتہ سنجوں کی نظر میں یوں شرف افزا ہوا
اور وہاں سے جب ملا اس کو لقب استاد خاص
رشک سے جل کر کباب اس دم دل اعدا ہوا
کون سی جا تھی کہ اس کا واں نہ تھا نام بلند
کون سا گھر تھا کہ اس کا واں نہیں شہرہ ہوا
تادم آخر اسی در پر رہا وہ جانشیں
یہ ہی کوچہ اس کا گویا مسکن و ماوا ہوا
عمر کو اپنی یونہی اس نے گذارا سر بسر
جب تلک راہی وہ یاں سے جانب عقبیٰ ہوا
وہ اسی در سے رہا زلہ ربائے فیض عام
وہ یہیں سے کامیاب دولت عظمیٰ ہوا
بس کہ اس کی طبع میں تھیں طرفہ شوخیاں
ناگہاں وہ دیکھ کر اس شخص کو شیدا ہوا
ہو کے عاشق جان کو کیا کیا ہوئی شوریدگی
دے کے اپنے دل کو سو سو طرح آوارا ہوا
لٹ گئی ساری متاع طاقت و ہوش و خرد

اس سر و سامان پر یوں بے سر و بے پا ہوا

وصل کی صورت نہ کوئی جب بہم پہنچی تو پھر

آخر آخر راز پنہاں سب پہ یہ افشا ہوا

ا۔ نسخہ دوم (ص ۲۲۹) یہیں۔

دست بردِ عشق سے جو بچ رہا تھا صبر کچھ

سو وہ تاراج جفائے ہجر جاں فرسا ہوا

حق بجانب اس کے بھی ہے کہ کہ کب تک صبر ہو

صبر اتنا بھی ہوا اس سے تو کیا تھوڑا ہوا

آخر انساں تھا چھپاتا کب تلک اس راز کو

جب نہ پنہاں ہو سکا تو سب میں اک چرچا ہوا

سب لگے کرنے بہم مل کر صلاح و مشورہ

حال دیکھا جب کہ یاروں نے بہت بگڑا ہوا

اور یہ سمجھے کہ اس کے واسطے غیر وصال

لاکھ تدبیریں کریں لیکن یہ کب اچھا ہوا

سب نے یہ چاہا کہ ہووے گر مساعد روزگار

اور کچھ سامان بھی موجود عشرت کا ہوا

وصل کی ٹھہرایئے اس سے کسی تدبیر سے

ورنہ آخر دیکھنا تم حال کیا اس کا ہوا

چار شنبہ آخر ماہ صفر کا ہم نشیں

باہزاراں خرمی جس دم نشاط افزا ہوا

یار یہ سمجھے کہ ہے تقریب تو یہ خوب ہی
پر مساعد گر فلک بھی اس میں تھوڑا سا ہوا
ناگہاں تقدیر سے تھا چرخ بھی کچھ راہ پر
دور اس کے دل سے جو کچھ اس میں تھا کینہ ہوا
دوست یہ سمجھے کہ موقع خوب ہے ایسا نہ ہو
اپنے ہاتھوں سے نکل جائے یہ وقت آیا ہوا
قصہ کوتہ ایک گلشن کو کیا آراستہ
اور اس میں دوستوں کا گرم گرم ہنگاما ہوا
سب نے یہ چاہا کہ اس تقریب سے اس شوخ کو
لایئے جس پر کہ ہے دل ذوق کا آیا ہوا
شاید اس بے رحم کا بھی آہن دل موم ہو
کیا تعجب ہے اگر وہ یاں کرم فرما ہوا
اول اول تو وہ گرم حیلہ سازی ہی رہا
گو کہ ہر اک عجز کا اس جا بساط آرا ہوا
بعد چندیں منت و باصد سماجت ہائے شوق
رانق افروز اس چمن میں ہو بہار آسا ہوا
دیکھ کر وہ روئے تاباں شمع کشتہ ہو گئی
شمع کے اس جال سے جاں برا نہ پروانا ہوا
اور وہ جو زنینان چمن تھیں۲ سبز و سرخ
کیا بیاں کیجے کہ ان کا حال تو کیسا ہوا
زلف سے سنبل کو واں کیا کیا پریشانی ہوئی
چشم سے نرگس پہ طاری حال حیرت کا ہوا

غنچۂ سوسن دہن سے رشک کھا کر مر گیا
غنچۂ گل لب سے کر کے شرم کچھ چپکا ہوا
آتش رشک و حسد سے دیکھ اس رخسار کو
جل کے سر سے پاؤں تک اک داغ سا لالا ہوا

۱۔ نسخہ اول (ص ۲۳۶) 'پُر' غلط۔
۲۔ نسخہ دوم (ص ۲۳۰) 'تھے'۔

پنجۂ دست نگاریں دیکھ کر اس کا چنار
رشک سے جل جل کے آپ ہی آگ سر تا پا ہوا
ساق پا سے شاخ گل شرم و حیا سے جھک گئی
اور فسردہ فندق پا سے گل رعنا ہوا
سرو نے دیکھا جو اس کے قامت دلچسپ کو
گڑ گیا اندر زمیں کے شرم کا مارا ہوا
طائران باغ نے دیکھی جو ایسی برہمی
ہر طرف پھرنے لگا ہر ایک گھبرایا ہوا
اہل مجلس نے جو دیکھا اس طرح کا ماجرا
سب کو حسرت تھی کہ یہ کیا حشر سا برپا ہوا
ساقیٔ سیمیں بدن یہ حال ابتر دیکھ کر
خندۂ ساغر سے محو گریۂ مینا ہوا
بادہ و خم کا ہوا یہ حال بزم عیش میں
یہ ہے واں بکھری پڑی اور وہ ہے واں ٹوٹا ہوا

برہمی ایسی پڑی عین نشاط و عیش میں
جس کے باعث سے زمیں تا آسماں غوغا ہوا
یہ تو تھی ہی اک مصیبت جاں گزا اے ہم نشیں
اس مصیبت پر فزوں اک اور یہ صدما ہوا
یعنی ایسے حادثوں میں ہو گئی شب تو تمام
اور سحر کے دل میں جو کچھ راز تھا افشا ہوا
دیکھ کر روئے سحر وہ تو روانہ ہو گیا
اور ادھر کیا کہیے اب جو کچھ کہ حال اس کا ہوا
یعنی درد جاں گزائے ہجر کی آئی نہ تاب
دم کے دم میں مر گیا اور راہیِ عقبیٰ ہوا
سوز دل خستہ نے برجستہ کہی تاریخ فوت
برہمی سی پڑ گی یہ اور کیا تھا کیا ہوا
باغ عالم سے گیا حیف آج پریاں چھوڑ کر

۱۸۵۴ء

عیسوی میں اس طرح سے وہ سخن آرا ہوا
اور سمت میں کیا اس نے رقم یہ مادہ
ہائے جور چرخ سے فتنہ نیا برپا ہوا

۱۹۱۱

سنہ فصلی میں بھی یہ اس نے کہا ہے مادہ
اور تو اب کیا کہوں اے دل جو ہونا تھا ہوا

۱۲۶۲ف

ایک قطعہ جس کے ہر مصرع میں اک تاریخ ہے

سنہ فصلی میں یہ کہہ کر یوں سخن فرما ہوا
آہ جور آسماں سے مل گیا اب خاک میں
برہمی کا باعث اس کا ہائے مر جانا ہوا
جاں جلی دل خوں ہوا یا چاک سینے میں پڑا
اوس کے مرنے کا نتیجہ یہ دل شیدا ہوا
ایک قطعہ اس نے یہ سنہ جلوسی میں کہا
جس سے دل محظوظ یاں ہر ایک سامع کا ہوا
مر گیا ذوق سخن ور قبلۂ اہل زماں
دل مرا محو تحیر کیا کہوں کیا کیا ہوا
اس کے مرنے سے زبس دل کو پریشانی ہوئی
جب تحیر دل میں آیا بے سر و بے پا ہوا
سوز نے جب یار سے اپنے کہا جا کر یہ حال
اور اس کے سامنے اس بات کا چرچا ہوا
لے کے انگشت تحیر دانت میں افسوس سے
جادۂ تاریخ میں یوں وہ قدم فرسا ہوا
زندہ و سالم اسے دیکھا تھا کل تو سوز ہائے
آج کس کافر سے وہ مقتول بے چارا ہوا
عین حال نزع میں یہ آپ بھی اس نے کہا
وائے حسرت لو جہاں سے ہے سفر اپنا ہوا
میں نے بھی اس باب میں کچھ کچھ کیا تھا فکر سو
غیب سے دل میں مرے مطلع یہی القا ہوا
ایک عالم اسکے ماتم سے تہ و بالا ہوا

از زمیں تا آسماں اک شور واویلا ہوا
تا کجا تجھ سے کہے جاؤں یہ میں اب ماجرا
خیر جو گذری سو گذری اور جو ہونا تھا ہوا
تجھ سے ان باتوں کا کیا شکوہ شکایت کیجیے
تھی یہی مرضی خدا کی جو ہوا اچھا ہوا
سب نے تاریخیں کہی ہیں تو بھی اک تاریخ کہہ
تا کہ رہوے مادہ وہ قبر پر لکھا ہوا
خلق تو جانے کہ مرتے دم تلک یاری نبھی
اور وہ جانے کہ کچھ سینہ مرا ٹھنڈا ہوا
قبر میں اس کو ہوا یہ امر موجب عیش کا
اور جہاں میں تجھ کو باعث نیک نامی کا ہوا
میرے کہنے سے اسے بارے پشیمانی ہوئی
بولنے کا کچھ نہ اصلا شرم سے یارا ہوا
چپکے چپکے زیر لب شرما کے یوں کہنے لگا
میں تو سمجھا تھا جفا کچھ کھیل ہے، یہ کیا ہوا

قطعے کی تصنیف کے بعد فکر تیز پا کی گرم جولانی نے آسایش کے اختیار کرتے کرتے ایک شوخی دل چسپ ظاہر کی کہ اور قطعہ دو بیت کا جو اس قطعے کے اختتام کی تاریخ پر مشتمل ہے، تماشائیان عجایب سخن کی نگاہ پر جلوہ گر گیا۔ اگر وہ بھی نذر احباب کیا جائے، لطف سے خالی نہیں:

چوں بصد درد رقم بنمودم
قطعۂ درد و مصیبت افزائے
گفتم ای سوز بگو تاریخش

گفت گو ''مرثیۂ محنت زائے''

۱۲۷۱

اور قرینۂ مقام سے روشن طبعان صافی ضمیر پر یہ تو منکشف ہو ہی گیا ہو گا کہ ''واقعۂ تعب خیز'' بھی کہ اس قطعۂ درد مضمون کا نام اور ان ابیات حسرت مشحون کا لقب ہے، عدد تاریخ پر مشتمل ہے۔ خدائے سخن آفرین اس فکر آسمان سیر کی تیز پائی من افزائش کرے اور اس فارس مضمار سخن کی طبیعت کو ایسا گرم جولان رکھے کہ حریفان سبک خیز کا وہم تیز گرد اس کی گرد کو نہ پہنچے۔ اب بعضے احبائے شوخ طبع دامن گیر ہوتے ہیں کہ ہر چند اقتضائے اختصار باقی شعرائے رنگین سخن کے قطعات کی تحریر سے مانع ہے لیکن مرزا علی بیگ نازنین تخلص ریختی گو کے قطعے سے اغماض بے جا اور چشم پوشی ناروا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس پردے میں اس کے سلیقۂ سخن وری کی خوبی دقیقہ سنجان معنی یاب پر منکشف ہو جاتی ہے۔ اس ماتم کی جان گزائی کی اثنا میں فی الجملہ رسم غم زدائی بھی وقوع میں آتی ہے۔ ناچار خامۂ خام رقم کو اس عرصے کی جولاں گری سے باز رکھنا مناسب نہ سمجھا:

نہیں نازنیں رنج کرتی کسی کا
کیا جب سے یار اور حرمت ہے کھوئی
بلا سے رکھوں شاد دل کو تو اپنے
اگر میں نے کنبے کی عزت ڈبوئی
خصم جب موا لونڈیوں کو رلایا
کہ اس پردے میں نام رکھے نہ کوئی
ولیکن مجھے کاملوں سے ہے الفت
غم ذوق میں رات بھر میں نہ سوئی
لکھی ان کی تاریخ اور یہ ہوا غم

میں ذوق کو میں ہوا آپ روی

اے صابر نا واقبت اندیش! اب جولان بے صرفہ سے باز آ اور عنان قلم کو روک کہ شوق پرستان معنی زبان کو شکوے سے آشنا اور لب کو حرف شکایت پروا کرتے ہیں، کہ اگر حیلۂ چرخ مکار نے اس کمالات انتساب کے افادۂ صحبت سے محروم کیا، بارے اس کے کلام بلاغت نظام کو منتظر ان لطایف کے نذر کر کہ نگاہ قیس میں آہو بھی چشم لیلیٰ سے کم نہیں ہے:

دل مجنوں ز آہو در تسلی است

بلیلی ہر چہ ماند عین لیلیٰ است

سخن سنجان انصاف دوست پر واضح کرتا ہے کہ اگر سب کلام اس معرفت مآب کا تحریر میں آئے تو وہ دریائے ذخار حوصلۂ صدف میں گنجایش پذیر نہیں ہوسکتا، اور قدرے قلیل پر قناعت کی جائے تو دل متحیر ہے کہ کس شعر کو نقطۂ انتخاب سے مزین کرے؟ اور کس بیت کو اس زیور سے خلیع العذار رکھے کہ ہر معنی گوہر شاداب ہے اور ہر بیت بیت انتخاب:

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

ہر چند ایک کو اختیار اور دوسرے کو ترک کرنا ترجیح بلا مرجح کے قبیل سے دشوار نظر آتا تھا، لیکن جیسے گرسنگان مضطر کے خوان الوان نعم سے بے تفضیل و ترجیح جس سے چاہتے ہیں، ابتدا کرتے ہیں، شوق بے تاب نے جس قدر حوصلہ فرصت میں قابل گنجایش پایا، اس گنج شایگان سے اٹھا کر ان اوراق میں مرقوم کیا:

کہتے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا

کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا

صراط عشق پہ از بس کہ ہے ثابت قدم میرا

دم شمشیر قاتل پر بھی خوں جاتا ہے جم میرا
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے

کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
مدتوں دل اور پیکاں دونوں سینے میں رہے

آخرش دل بہہ گیا خوں ہو کے پیکاں ہی رہا
سب کو دیکھا اس سے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ

وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا
گر ترے فریادیوں کے نامۂ پیچیدہ کو

رکھ کے منہ پر پھونکیے پیدا ہو نالہ صور کا
شکر پردے ہی میں اس بت کو حیا نے رکھا

آج ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا
ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا

کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہ گاروں کا
لبوں پر جاں عبث ہے منتظر، وہ شوخ کب آیا

اگر چہلم کو بھی آیا تو ہم جانیں گے اب آیا
ٹھہری ہے ان کے آنے کی یاں کل پہ جا صلاح

اے جان برلب آمدہ تیری ہے کیا صلاح
ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تکبیر

تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لے کر
مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس

بد گماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس
یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں

واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
نہ ڈال آبلہ اے گرمی فغاں منہ میں
کہ چپکا بیٹھ رہوں بھر کے گھنگنیاں منہ میں
ہمارا پی کے لہو تیرے تیر کا سوفار
یہ چپ ہوا کہ کہ گویا نہیں زباں منہ میں
مر گئے پر بھی تغافل رہا آنے میں
بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لے جانے میں
وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر کو دیکھتے ہیں
محبت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں
صحبت صافی دلوں سے ہوں مکدر تیرہ دل
زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں
اسیر رنج و غم میں ہوں مریض جاں بلب میں ہوں
اور اس پر اب تلک جیتا ہوں میں کوئی عجب میں ہوں
عبث تم آہ رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو
نخل خرما کی طرح باغ محبت میں ملا
کثرت زخم سے اک خلعت زیبا ہم کو
ہم گئے جس کی طرف جوں گل بازی اس نے
پاس آنے نہ دیا دور ہی پھینکا ہم کو
رشک تھا اپنے نوشتے میں کہ اس نو خط نے
خط لکھا غیر کو اور بھول کے بھیجا ہم کو
کرتے جوں کوہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت

پر وہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہے گا ہم کو
دل میں تھے قطرۂ خوں چند سو مانند حباب
نہ رہے وہ بھی جب الفت نے نچوڑا ہم کو
جس کی آواز سے ہیں رونگٹے سوہاں کے کھڑے
وہ محبت نے دیا سلسلۂ پا ہم کو
اک حلاوت ہے عداوت میں بھی اس ظالم کی
کہ دی ازہر بھی جو اس نے تو میٹھا ہم کو
دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو
ہم وہ ہیں رند کہ اس عالم پیری میں بھی ہے
انس مے خانے سے جوں پنبۂ مینا ہم کو
کھانے پینے کی قسم کھائی ہے تجھ بن ہم نے
ورنہ تھا زہر تو ہر طرح گوارا ہم کو
نکالوں کس طرح سینے سے اپنے تیر جاناں کو
نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو
تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ
نگہ وہ ترک کہ جس کی نہیں جفا کی پناہ
اور اس کی آنکھیں وہ کافر کہ بس خدا کی پناہ
نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے
نہیں یہ بھی معلوم، ہے یا نہیں ہے
وہ ہے پاس ہی پر مری بدگمانی

لیے پھرتی مجھ کو کہیں سے کہیں ہے

زباں پیدا کروں جوں آسیا سینے میں پیکاں سے
دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

ہم نے اس بت میں جو دیکھا ہے، نہیں کہہ نہیں سکتے
کہ مبادا کہیں سن پائیں شریعت والے

ساقیا عید ہے دے بادے سے مینا بھر کے
کہ پیاسے ہیں مے آشام مہینا بھر کے

قطرہ قطرہ آنسو، جس کی طوفاں شدت ہے
پارہ پارہ دل ہے جس میں تو دہ تو دہ حسرت ہے

قسمت برگشتہ دیکھو اک نظر کی تھی ادھر
سو بھی آ کر تا سر مژگاں حیا سے پھر گئی

زخمی میں ہوا ہوں تری دزدیدہ نظر سے
جائے گا نہیں چور مرے زخم جگر سے

ذکر کچھ چاک جگر سینے کا سن سن اپنے
کر کے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن اپنے

زخم دل پر کیوں مرے مرہم کا استعمال ہے
مشک گر مہنگا ہے تو کیا لون کا بھی کال ہے

سن کے میری جاں کنی کو "کوہ کن"
جوں صدا الٹا پھرا کہسار سے

وبال دوش تھا اس ناتواں کو سر لیکن
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے

توڑا کمر شاخ کو کثرت نے ثمر کی

دنیا میں گراں باریِ اولاد غضب ہے
لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
شب ہجراں بسر نہیں ہوتی
نہیں ہوتی، سحر نہیں ہوتی
میری طرز نالہ ہائے زار سے
ٹپکے بلبل کے لہو منقار سے
یوں نگہ نکلی ہے چشم یار سے
مست جیسے خانۂ خمار سے
کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے
دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو
آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے
کل جہاں سے کہ اٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دل بے تاب مجھے
لیتے ہی دل جو عاشق دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے
کیا لے چلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے
آلودہ سرمے سے نہ ہوئی چشم میں نگاہ
دیکھا جہاں سے صاف ہی اہل صفا چلے
میں گراں بار محبت مرا خوں بھی ہے گراں

جی دھڑکتا ہے تری نازکی گردن سے

----

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

باب الراء المہملہ

راجہ

راجہ تخلص، طراز و سادۂ حشمت و زیب مسند حکومت، آرایش چار بالش اقبال، بانی بنائے عز و جلال، شایستۂ تشریف تفاخر، مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر، خلف الصدق اعظم اراکین دولت و جاہ، شوکت پناہ، ابہت دست گاہ، راجہ چیت سنگھ بہادر والی بنارس کہ چالیس برس سے گل زمین آگرہ اس کے قدم بہار توام سے خاک چمن پر افتخار اور رہوا اس گل زار فیض کی نسیم ختن سے عبر کرتی ہے۔ وجہ قیام کی اس گلشن ہمیشہ بہار کُمن یہ کہ جب راجہ چیت سنگھ کے پدر عالی وقار نے عالم فانی کو پدرود کیا، رئیس صوبۂ اودھ نے چاہا کہ راجہ متوفی کی جاگیر پر آپ قبضہ کرے۔ حکام بلند مقام انگریز نے علی الرغم اس رئیس کے مراسم اعانت و شرایط و امداد کو بجالا کر چیت سنگھ کو حکومت موروثی کی مسند پر متمکن اور بالش ریاست پر جانشین پدر کیا۔ راجہ موصوف حسب قرارداد زرخراج کو سال بہ سال ادا کرتا تھا، لیکن انگریزوں نے سنہ سترہ سو اٹھتر عیسوی میں اس سے کچھ فوج کمکی اطلاب کی اور اس نے یہ امر اپنے مقدور سے خارج پا کر عذر اور بجا آوریٔ فرمان سے پہلو تہی کیا۔

سنہ سترہ سو اکیاسی عیسوی میں ھستنگز صاحب نے عازم بنارس ہوکر راجہ موصوف کی گرفتاری کا قصد کیا۔ ہرچند اس عاقبت اندیش کا ارادہ یہ نہ تھا کہ ایسی فوج ظفر تلاش سے مقابلہ اور اس لشکر نصرت اثر سے بادلہ کرے، سپاہ جہالت دست گاہ کی ناعاقبت اندیشی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ آتش فساد نے اشتعال پایا اور شعلۂ قتال بلندی پر آیا اور یہ مفسدہ اس حد تک کھچا کہ سپاہ انگریزی سے دو کمپنی اور چند افسر فوج نے شربت مرگ چکھا۔ یہاں سے قیاس کیا چاہیے کہ سپاہ مقابل سے کس قدر جوانان دلاور کسوت حیات سے عاری ہوئے ہوں گے۔ آخر کار راجہ ممدوح نے کہ کور باطنان بے باک کی سفاہت سے جرم ناکردہ میں ماخوذ تھا، شکست فاحش پا کر

گوالیار کو پناہ گاہ مقرر کیا۔ عالی جاہ نے طریقۂ مہمان نوازی کو مسلوک کر کے اس کے مصارف ضروریہ کے واسطے پانچ لاکھ روپیہ کی جاگیر علاحدہ کر دی، لیکن اس راجہ نے بعد چند روز کے سفر آخرت اختیار کیا۔ راجہ بلوان سنگھ کہ یہ صفحہ اس کے حمایداوصاف سے مملو اور یہ عبارت اس کی گزیدگی اطوار سے مالامال ہے، حکام عہد کی تجویز سے

ا۔ نسخہ مطبوعہ مطبع مرتضوی دہلی ۱۲۷۱ھ (ص ۲۴۲) میں 'کوملی' ہے۔
ا۔ نسخہ اول (ص ۲۴۳) ''کنچنی''۔

سرزمین آگرہ میں مقیم ہوا اور یہ نواح اس حسن اتفاق سے رونق پذیر ہوئی۔ زبان خلایق اس کی محمدت وستایش سے دفتر از بر رکھتی ہے۔ گاہ گاہ اس کی حسن لیاقت ولطف طبیعت سے زمین ریختہ بھی پے سپر افکار گوہر نثار ہوتی ہے۔ خامۂ خام رقم ان اشعار لطافت بار سے یہ دو تین شعر درج تذکرہ کرتا ہے:

تو ہے وہ گل کہ نام ترا باغ دہر میں
دو دو پہر وظیفۂ مرغ سحر ہوا

مرنے کا تو کچھ غم نہیں پر غم ہے یہ راجہ
مہمان ہے درد جگر اور کوئی دم

اقلیم کبھی زیر نگیں رہی تھی راجہ
اب حرف بھی غالب ہے نگیں پر نہ رہیں گے

راحت

راحت تخلص، مرزا محمود بیگ خلف احمد بیگ، رومی الاصل۔ اوایل حال میں پیشۂ سپاہ گری کو وسیلۂ تحصیل روزی مقدر سمجھ کر گلوئے تشنۂ حریفان بے باک کو آب دم

شمشیر سے سیراب اور حلق خشک اعدا کو قطرۂ پیکان سے شاداب کرتا تھا۔ مدت سے گوشۂ انزوا اختیار اور قطع علایق کو خلعت اقدار تجویز کیا۔ آشنا و بیگانہ سے ترک ملاقات کر کے امید و بیم سے فارغ اوقات بسر کرتا ہے۔ سرمایۂ علمی بہ قدر ضرورت فراہم ہے۔ اصلاح شعر مومن خاں مرحوم مومن تخلص سے لی ہے اور استعداد خداداد سے موزونی ذاتی کو کسب کمال کا معین کر کے صنعت شاعری کو سر بلند کر دیا۔ یہ چند شعر اس کے افکار گوہر نثار سے منتخب ہوئے:

اشک آنکھوں سے نکل کر زیر مژگاں تھم گیا
دم نہ لے سایے میں کیوں کر تھا مسافر دور کا

ہم سے وہ بھی چھٹے اور یہ دل شیدا چھوٹا
یاد کس کس کو کریں خیر جو چھوٹا چھوٹا

صبر و قرار و تاب و تواں رفتہ رفتہ سب
آ جائیں گے کہیں سے دل رفتہ گر ملا

غیروں سے جو اشارے محفل میں ہیں تمہارے
سمجھیں وہ یا نہ سمجھیں پر یہ غلام سمجھا

کھلایا مجھے غم پلایا مجھے خوں
ہوا جب میں ناکام مہماں تمہارا

کچھ جان سی آتی ہے مری جان میں قاتل
پانی ترے خنجر میں ہے کیا آب بقا کا

لے گیا رات کو باتوں میں لگا کر ان کو
کیوں کہ تایل نہ ہوں راحت تری تقریر کے ہم

اجل پہلے آئے کہ وہ پہلے آئیں
یہی راہ مدت سے ہم دیکھتے ہیں

روئے قاتل سے خجالت کیوں نہ ہو روز جزا

ساتھ میرے ایک عالم ہو لیا فریاد کو

یہ چاہتا ہوں کہ رازِ نہاں نہ افشا ہو

ترے دہن سے زیادہ مرا دہن بن جائے

راحت

راحت تخلص ہے جوان خوش مزاج، حلیم طبع، شیخ کریم الدین نام ساکن اعظم پور باشندہ کا، کہ کتب فارسی وصرف ونحو عربی سے بہ قدر ضرورت ماہراور رسائی طبع سے ریختہ گوئی پر قادر ہے۔ شستگی زبان اور تلاش معنی کی طرف مایل اور متانت الفاظ اور دل چسپی مضامین میں ساعی۔ یہ دوشعر اس کے یاد تھے:

ہمیشہ گذری قفس میں، اسی تمنا میں

کہ اب رہا ہوئے، اب موسم بہار آیا

خودی کو نیست کیا، جب ہوئی بقا حاصل

جب اعتبار گیا تب کچھ اعتبار آیا

راسخ

راسخ تخلص، سعادت علی خان، شاگرد مومن خان مرحوم، مرد نیک نہاد، خوش اخلاق، تیز فکر ہے۔ ہر چند شعر گوئی کا اتفاق کم ہوتا ہے لیکن جس قدر ہے خالی لطف سے نہیں۔ یہ دو شعر یاد تھے:

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر

سرمہ ہوں، یا غبار ہوں، کیا ہوں

میں بنائے جہاں ہی، لیکن

جب کہ ناپائدار ہوں، کیا ہوں

راغب

راغب تخلص، احمد حسین برادر زادہ حافظ محمد بخش عرف حافظ ممو۔ تیزیٔ فکر اور جودت طبع کے ساتھ پسندیدگی اطوار اور گزیدگی کردار کو فراہم رکھتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے اشعار سے منتخب ہوئے:

آئے بھی وہ اگر تو نہ آئے اسے یقیں
کیا حال ہو گیا دل امیدوار کا

چھٹ گئے آلام سے، راحت کا ساماں ہو گیا
بڑھتے بڑھتے درد دل آخر کو درماں ہو گیا

یا رب اسے تو چین دے، مجھ کو نہ دے نہ دے
جلتا ہے میرے حال پہ، دل غم گسار کا

اس کو بھی کیا صبا نے جہاں سے اٹھا دیا
چھوڑا نہ ایک ذرہ ہمارے غبار کا

کیا فہم ہے وہ اپنی شکایت سمجھتے ہیں
شکوہ اگر کروں روشن روزگار کا

ترغیب خلد اور مجھے راغب خدا سے ڈر
کیا کم ہے لطف خلد سے کچھ کوئے یار کا

میں نے کہا سر کٹنے میں کیا کیا نہ ملے لطف
کہنے لگے لے آؤ، اگر ہے کوئی سر اور

راقم

راقم تخلص، شیخ مظفر علی، خلف شیخ رستم علی، شیخ زادہ ساکن قصبۂ چارکلیانہ۔ عمر ستر برس کی ہے۔ مرد با اخلاق، متانت اور نیک نہادی اس بزرگ کے اوصاف کا ایک شمہ ہے۔ فن فارسی کو شاہجہان آباد میں مولوی عبدالباقی مرحوم سے کسب کیا تھا۔ فارسی و ریختہ دونوں میں فکر کرتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے افکار سے ہیں۔

اشعار فارسی

قامت ست ایں یا قیامت، یا قیام آفت است
یا بلا بر پاست ایں یا عالم بالاست ایں
شعر ہائے راقم است ایں یا نجوم آسماں
یا جواہر ریزۂ کاں یا در دریاست ایں

اشعار ریختہ

غیر تزویر نہیں ہیں بت مکار کے کار
دم ہمیں دیتے ہیں اور ہوتے ہیں اغیار کے یار
تیغ مت کھینچ میاں ہاتھ کو پہنچے نہ ضرر
تیر مژگاں ہی خدا را دل بیمار کے مار
آفریں دست جنوں تجھ کو کہ دم کے دم میں
کر دیے خوب مرے جامۂ و دستار کے تار
اک جہاں قتل کیا جنبش ابرو نے تری
کیا ستم دیکھیے دکھلائیں گے تلوار کے وار
آج صحرا میں بہے دیدۂ تر سے دریا
وار کے وار رہے، اور رہے پار کے پار

رحمت

رحمت تخلص ہے جوان وجیہہ، خوش روئے نیک اسلوب، رحمت علی نام کا۔ ایام شباب عین بہار پر اور روزگار جوانی کمال رونق پر ہے۔ اور باوجود اس سن و سال کے مزاج میں خلق اور طبیعت میں سازگاری ہے۔ جناب مستطاب مولوی امام بخش صہبائی کے ساتھ قرابت قریبہ اور انہیں سے تلمذ رکھتا ہے۔ کتب درسیہ فارسی کو بہت تحقیق سے پڑھا اور عروض و قافیہ کو نہایت تدقیق سے تحصیل کیا۔ فکر اشعار فارسی و ریختہ شایستہ اور ارجمند، زبان شستہ اور تلاش بلند ہے۔ نہ رنگینیٔ معنی کی تعریف بیان کی محتاج اور نہ فروغ مضامین کی مدح کو تفصیل کی احتیاج۔ جیسی نظم دل کش اور رنگین ہے، نثر فارسی بھی نہایت دل چسپ و متین ہے۔ ایک انشا ''حدیقۂ رحمت'' نام کہ مکاتبت شوقیہ اور نامہ ہائے بہت افزا سے پر اور ''نالہ بلبل'' جو ناہر سنگھ راجہ بلب گڑھ کی تعریف سے مملو اور ایک ملاحت عبارت شور تشبیہ و استعارات سے زخم شوق پر نمک افگن اور دوسرے[1] اسینۂ خاطر پر ناخن زن ہے۔ کمال متانت و فصاحت کے ساتھ ریختۂ خامہ شیریں سخن ہے اور ریختے میں ایک مثنوی ہے مسمی بہ 'شکایت فلک' زبان کی شستگی ایسی کہ اس کے سننے سے طبیعت سامع کی یک قلم غش سے پاک ہو جائے اور عبارت کی متانت اس طرح کی کہ اس کے پڑھنے سے مدنفس،

ا۔ نسخہ مطبوعہ مطبع مرتضوی دہلی (۱۲۷۱ھ) میں 'دوسرے' کا لفظ نہیں ہے۔ نسخہ مطبوعہ نول کشور (۱۲۹۹ھ) میں موجود ہے۔

رگ یاقوت سے گراں تر نظر آئے۔ یہ چند شعر فارسی اور چند ابیات ریختہ اس کے نتاج طبع سے مرقوم ہوتے ہیں:

اشعار فارسی

جنس دل گرچہ عزیز است بہ ہیچش نخرند

ایں ستم پیشہ نکویان جفا گستر ما
ساقی بریز در قدح من شراب را

دستے بگردن افگن و افگن نقاب رار
خشک است رز کہ ابر بہارش نداده آب

رحمت دہیم رخصت چشم پر آب را
نہ مے، نہ ساقی و نے یارائے چمن پیرا

چہ جاں فزاید ازیں نغمۂ ہزار مرا
تو جام مے بکف خویشتن بمن دادی

ہمیں بہ پیش حریفاں بس اعتبار مرا
عبث تفرح گلشن، چرا کنم رحمت

ز داغ شد جگر و سینہ لالہ زار مرا
تو و صد گردش چشم و من و صد آرزو در دل

تو و چشمک بہ اغیار و من و در سینہ پیکاں ہا
من و رعنا جواں شوخی کہ چشم مست او رحمت

بہ کافر ماجرائے می زند راہ مسلماں ہا
در خور حوصلۂ شوق نہ باشد جامے

بہر ما وقف تواں کرد خمستانے چند
گر ہمیں نالہ پس از مرگ کشد سر زولم

وید از خاک من خستہ نیستانے چند
غمزه و شوخی و انداز و ستم کرده ہجوم

یک جگر دارم و جمع آمده مہمانے چند
رحمت و کوہ کن و قیس بہم آمده اند

چہ تماشا است کہ جمع اند پریشانے چند
مدتے شد تا فراہم آمد ایں چاک جگر
یارب آں بیرحمی خنجر گزاراں را چہ شد
غفلت اہل ہنر را چارہ نتواں یافتن
نیم رنگ آمد سخن معنی نگاراں را چہ شد
بہ دل نہ رغبت کفر و نہ میل دیں دارم
نہ مہر کعبہ نہ با بت پرست کیں دارم
جہاں بہ لرزہ شد از جنبش زمیں کہ بگور
بخویشتن دل بے تاب ہم نشیں دارم
تو در کناری و اندوہ ہجر می کشدم
کہ ہم چو طالع خود خصم در کمیں دارم
نہ کفر دانم و نے دیں، ہمیں قدر دانم
کہ دل بہ بند غم الفت بتاں دارم
اگرچہ پائے رسانم ندادہ اند ولے
سرے بہ قافلہ چوں گرد کارواں دارم
برائے سوختن ہا با حریفاں ساختم رحمت
بہ ہر جا رفتہ ام چوں شمع ہائے انجمن رفتم
خمار بادۂ غم در سرش بیں
برنگ لالہ داغ اندر برش بیں
دلم برد از نگاہ و از نگاہے
دل اندر سینہ چوں من مضطرش بیں
ادائے شوخ و انداز جورش ا

جدا از نرگس جادوگرش ہیں
لب نازک گزد از حسرت اکنوں
لب و ایں آرزوے خاطرش ہیں
ہجوم آہش اندر سینہ بنگر
وفور گریہ در چشم ترش ہیں
چناں کز پہلویم نازش جدا داشت
بہ عشق از خود بجاے دیگرش ہیں

اشعار ریختہ

تخفیف درد سر کا تھا باعث حضور قلب
ورنہ نہ دیر اور نہ کچھ کعبہ دور تھا
گر جانتے تھے سہہ نہ سکو گے یہ آفتیں
رحمت لگانا دل کا تمھیں کیا ضرور تھا
ناصح کہا کیا کہ تو اب ترک کر شراب
اور ہم پیے گئے ہیں یوں ہی عمر بھر شراب
اللہ رے رسائی طالع کہ ہم صبا
بیٹھے نہ خاک ہو کے بھی دامان یار پر
دیکھا ہے کس کا جلوۂ حیرت فزا کہ اب
اشک آ کے تھم رہے مژۂ اشک بار پر
دل ہے بے تاب بہت شوخی جاناں کی قسم
ہدف تیر ہے جاں کاوش مژگاں کی قسم
طعنے اب تک ہیں کہ رخ کی مرے کیا قدر تمھیں
میں نے اک روز کہیں کھائی تھی قرآں کی قسم

تھا غمزہ تیز مے سے، ہوا اور تیز تر
برش میں تیغ کی ہے بہت دخل آب کو

ہنستے تھے کل جو حال پہ میرے، سو آج میں
روتا ہوں ان کے دیکھ کے حال خراب کو

اہل نظر ہیں جلوۂ یوسف میں محو آج
اک سیر ہو جو تو ابھی الٹے نقاب کو

رحمت یہ عمر اور ورع خیر ہے تجھے
بڑا تو کیوں لگائے ہے عہد شباب کو

ابر بہار کی سی مجھے چشم تر ملے
جوں برق مضطرب مجھے یارب جگر ملے

گردش ہے اس کمینے کی عکس مراد پر
کم مانگیں آسمان سے تو بیشتر ملے

مجھ کو مخل نہ جان تو صحبت کا عندلیب
کیا نقص نوحہ گر سے اگر نوحہ گر ملے

تیرا ہے کچھ یہ طور نرالا جہان سے
ورنہ یہ رسم ہے کہ بشر سے بشر ملے

آرام ایک حرف تھا رونے سے مٹ گیا
خانہ خراب خاک میں یہ چشم تر ملے

تم کو ہے اس کا چارۂ وحشت بھی پر ضرور
یارو کہیں جو رحمت آشفتہ سر ملے

رحیم

رحیم تخلص، مرزا رحیم بیگ، خلف مرزا پیر بیگ۔ وطن اصلی آباو اجداد اس صاحب سخن عالی نہاد کا شاہجہان آباد اور مولد و منشا خاک سر دھنہ ہے کہ دارالحکومت عمدۂ نسواں، بزرگ ہمت، زیب النسا بیگم مرحوم کا شمار کیا جاتا ہے۔ حسب اتفاق سن بارہ سو ستاون ہجری میں مطابق اٹھارہ سو اکتالیس مسیحی کے قصبۂ میرٹھ میں وارد ہو کر حکمت مآب، کمالات انتساب، حکیم بودلی خاں کی خدمت میں تحصیل کمال کا ارادہ کیا۔ فضائل مآب موصوف نے اہلیت ذاتی پر نظر کر کے فرزندی میں لیا اور شفقت پدرانہ اس کے حال پر مبذول فرما کر فرزندان حقیقی سے زیادہ تربیت کیا۔ سن بارہ سو ساٹھ ہجری میں زبدۂ ارباب کمال مولوی محمد بخش نادان تخلص میرٹھ میں وارد ہوئے اور مجلس مشاعرہ منعقد ہوئی۔ اور اس صاحب فکر رسا کو تشریف تلمذ سے مشرف کر کے فن عروض و قافیہ سے آگاہ اور علم بلاغت سے کچھ کچھ بہرہ مند کیا۔ ہر چند اوایل میں شرر تخلص کرتا تھا، جب ان سے تلمذ ہوا، رحیم تخلص کیا۔ ذہانت و اصابت فکر ظرف بیان میں گنجایش نہیں رکھتی۔ چند رسالۂ علوم متفرقہ فارسی اور اردو میں اس سے سرمایۂ استعداد طلبا ے شوق نہاد ہیں۔ اگر چہ جناب مستطاب مولانا و بالفضل اولانا مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالی سے تحصیل کتب یا اصلاح شعر کا اتفاق نہیں ہوا لیکن ان چند روز میں بعض رسایل مصنفہ ان کے متردوان جادۂ رسالت کی معرفت جناب موصوف کے مدرسۂ افادات میں پہنچ کر معرض اصلاح میں ہیں اور علاوہ اس کے رسایل و امکاتیب کے وسیلے سے بسا فوائد علمی پایۂ تحقیق کو پہنچائے۔ بالفعل حسب فرمائش ارسطوے عہد و جالینوس روزگار حکیم احسن اللہ خاں کے وزیر بادشاہ اوان اور ثانی سعد اللہ خان ہیں، قصص الانبیا کو منظوم کرتا ہے اور قریب ایک ربع کے یہ کتاب انتظام پا چکی ہے۔ اشعار فارسی اور ریختہ میں فکر بلند اور تلاش دل پسند ہے۔ یہ چند شعر اس کے نتائج افکار سے مرقوم ہوئے:

ساقی بیا کہ گشتہ سر لالہ زار سبز

بر سبز و بحر سبز و لب جوے بار سبز
دیوار سبز، صحن چمن سبز، شیشہ سبز
مے سبز و جام سبز و لباس نگار سبز
اغلب کہ از کمال نشاط گل و بہار
مثل چمن ز پردہ بر آید نگار سبز
روے بتاں ز سبزہ بر آمد تمام سبز
وز عکس خط روے بتاں آبشار سبز

ا۔ نسخہ اول (ص ۲۴۸) میں "و" نہیں۔

جو لکھتا ہوں بیاں اپنے دل بے تاب و مضطر کا
تڑپتا ہے بہ رنگ نبض عاشق تار مسطر کا
یہ کس مضطر کی بے تابی دل کا حال لکھا ہے
کہ نقشہ ہے خط ملفوف میں لوٹن کبوتر کا
خدا جانے کہ وقت ذبح کیا انداز قاتل تھا
کہ نعرہ ہے لب ہر زخم سے اللہ اکبر کا
دوں میں کس کس کو کہ اک جان کے خواہاں ہیں بہت
غم جدا، فکر جدا، درد جدا، یار جدا
بل بے گرمی آبلوں کی آب کیا تیزآب تھا
پاؤں پڑتے ہی مرے خار بیاباں جل گیا
کسے رحم آئے جز داغ جگر حال پریشاں پر
بغیر از شمع روتا کون ہے گور غریباں پر

پس مردن بھی ہم بار ندامت لے چلے سر پر
کہ اڑ کر خون کے چھینٹے پڑے دامان قاتل پر

کہنے ہی کی بات ہے، کہنے دو، لائے تو کوئی
مجھ سا عاشق ڈھونڈ کر معشوق تم سا دیکھ کر

کیوں کہوں میں حال دل کیوں راز عشق افشا کروں
جان جائیں گے نہ کیا وہ رنگ میرا دیکھ کر

اب تک تو ہجر میں ہیں فقط تن پہ کھائے گل
تقدیر دیکھیں آگے کو کیا کیا کھلائے گل

طفیل لاغری میں رہ گیا ہوں کوئے جاناں میں
کہ مثل بو نظر آتا نہیں اور ہوں گلستاں میں

ایک سینہ ہے روکے کس کس کو
تیر کو، تیغ کو، کہ خنجر کو

رسا

رسا تخلص، شاہ زادۂ والا مراتب، مرزا کریم الدین بہادر۔ سنین عمر قریب ستر کے پہنچے ہیں۔ طبیعت کی شوخی اور فکر کی رسائی جوانوں سے زیادہ ہے۔ خوش مزاجی اور وسعت اخلاق سے طریقۂ صلح کل میں گام زن، ظرافت طبع اور شگفتگی خاطر سے پیشانی کا سطح، رشک گلشن۔ اوایل عمر سے اب تک اپنا سخن حافظ غلام رسول شوق کے زیور اصلاح سے مزین کیا ہے۔ یہ چند شعر ان کے نتائج افکار سے صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہوئے:

بے وفاؤں سے اے رسا تم نے
سچ کہو دل لگا کے کیا پایا

ہو گیا اس کو دیکھ دل حیراں
بات کرنے کا حوصلا نہ ہوا

کھونا غبار آئینہ کا، کام کچھ نہیں
مشکل ہے کام، دل سے مٹانا غبار کا

پریشان حالوں کی جب قدر جانو
جو اس طرح دل ہو پریشاں تمہارا

ہو برا غفلت دنیا کا کہ جس کے ہاتھوں
رہے غفلت میں ہم اور سر پہ سفر آ ہی گیا

ہمارا دم نہ کہیں سن کے یہ نکل جائے
خدا کے واسطے لو نام تم نہ جانے کا

دل و دین و قرار و ہوش تک تو دے دیا تجھ کو
سوا ان کے وہ کیا تھا اور جو ہم نے چھپا رکھا

تم کہو دل لے کے دکھلاؤں نہ اپنی شکل میں
ہم کہیں دیکھا کریں صورت تمہاری رات دن

یاں تلک اس کے غم میں روئے رسا
کہ ہم آنکھوں کو اپنی کھو بیٹھے

رشید

رشید تخلص، سید بہادر علی، جیل خانہ آگرہ میں عہدہ محرری پر مامور ہے۔ یہ شعر اس کی غزل سے انتخاب ہوا:

وہ ترک شوخ جو غیروں سے ہم کنار ہوا
رشید گور سے تھی ہم کو ہم کناری رات

رضا

رضا تخلص، یگانۂ عالم وفاق، زبدۂ شرفائے آفاق، ماہر دقایق سخن، مرزا جیون۔ عنایت سلطانی سے عہدۂ داروغگی ماہی مراتب اس کے خاندان میں چلا آتا تھا۔ خیاط ازل نے جامۂ اہلیت اور خلعت آدمیت اس کے قامت استعداد پر قطع کیا تھا۔ تہذیب اخلاق کی اعانت سے حضور و غیب میں وفاق اور دل و زبان میں اتفاق۔ مشق سخن میر نظام الدین ممنون سے کی تھی۔ ایسا شاگرد عقیدت شعار کم نظر آیا ہے۔ عرصۂ دراز ہوا کہ مربع عناصر اور مثلث ارواح اور خمسۂ حواس اور قطعات انفاس سے سیر ہو کر روضۂ خلد کا مثمن اور قامت حور کا مصرع پسند کیا۔ یہ چند شعر اس کے نتائج افکار سے مرقوم ہوئے:

غیر سے گرم اختلاط ہے وہ
ہم بھی سنتے ہیں اور جلتے ہیں

ہاتھ مں تم جو حنا اپنے ملا چاہتے ہو
آج دو چار کا کیا خون کیا چاہتے ہو

رنج ایسے مجھے دیتے ہو کہ تنگ آیا ہوں
میں نے جانا کہ مری جان لیا چاہتے ہو

رضا

رضا تخلص محمد رضا۔ آگرے میں سکونت اور فن سخن میں خاور سے تلمذ رکھتا ہے۔ یہ شعر اس کی غزل سے انتخاب ہو کر درج تذکرہ ہوا:

شب فراق بھی مقتل ہے عاشقوں کے لیے
تڑپ تڑپ کے کٹی آج اپنی ساری رات

رضوی

رضوی تخلص، حکیم جعفر علی، ابن حکیم شجاعت علی، ساکن قصبۂ جے پور۔ اہلیت ذاتی اور مکارم جبلی میں شہرۂ آفاق، فن طب میں دستگاہ معقول حاصل ہے۔ گاہ گاہ شعر اردو کہتا ہے۔ یہ تین شعر اس کے نتائج طبع سے ہیں:

وقت رخصت کیا کہوں کس بے کسی سے رو دیا
دل تو مجھ کو دیکھ کر، میں دل ربا کو دیکھ کر

پنجۂ بے داد سے رضوی نہ چھوٹا مرغ دل
انگلیاں صیاد کی ہیں، یا قفس کی تیلیاں

سر تو دیتا ہوں پر اپنی سخت جانی سے مجھے
خوف آتا ہے کہ قاتل کا نہ خنجر ٹوٹ جائے

رضی

رضی تخلص سیف الدولہ سید رضی خان بہادر صلابت جنگ۔ سید صحیح النسب، آباو اجداد اس کے امراء عظیم الشان سے تھے اور وہ خود حکام وقت، یعنی کمپنی کی طرف سے عہدۂ وکالت پر مامور ہو کر بادشاہ فلک جاہ دہلی کے دربار میں شرف حضوری سے مشرف رہتا تھا۔ چند شعر اس کے ایک تذکرے میں مرقوم تھے لیکن کوئی شعر ناخن بدل زن نہ تھا، ناچار یہ ایک شعر انتخاب ہوا:

رضی سے صنم کیوں برا مانتا ہے
یہ تیرا ہے بندہ، خدا جانتا ہے

رفعت

رفعت تخلص ہے رافع رایات سخن دانی، زبدۂ دودمان امیر تیمور گورگانی۔ جوان خوب صورت، خوش سیرت، جادو رقم، عطارد قلم، سحر ساز، معجزہ طراز، صاحب طبع سلیم و ذہن مستقیم، موجد عبارت سلیس، گنجور معانی نفیس، شاہزادۂ ذوی الاحترام ،مرزا پیارے نام کا۔ صفحہ اس کے دیوان کا صفائی عبارت سے غیرت آئینۂ ضمیر صافی گوہراں، مطلع اس کی غزل کا روشنی مضمون سے رشک مطلع خورشید درخشاں۔ ہر بیت لذت معنی سے جواب بیت ابروشیریں، ہر مصرع شور فصاحت سے دنداں شکن لب ہائے نمکیں۔ رباعی کے چاروں مصرعے مانند عناصر اربع چسپاں اختلاط، قطعے کا ہر شعر دیوانگان محبت کے خانہ ہائے زنجیر کی طرح سخت ارتباط۔ ابیات عاشقانہ مضامین آہ و نالہ سے رشک دیوان فغانی، فکر رسا ایجاد معنی سے غیرت خلاق المعانی۔ روانی طبیعت کے سامنے بحر بے کراں ایک قطرہ، گوہر باری سخن کے روبرو افکار سحابی ای رشحہ۔ الفاظ پاکیزہ سے ابر نیساں کی گوہر باری منفعل اور رنگینی مضمون سے رنگ شفق خجل۔ پرگوئی کا تو یہ حال کہ ہر غزل کی زمین شاخ و برگ اشعار بے شمار سے مجمع ہزار چمن اور خوش گوئی ایسی کہ جو شعر اس گل زمین کا فضالہ اور اس گلشن کا سبزۂ بیگانہ ہے، وہی مثل ابروے دل ربایاں ناخن بہ دل زن ہے۔ اکثر معنی نگار اس کے خامۂ جادو طراز کے ایک رشحہ سے صاحب دیوان اور بیشتر سخن سنج اس کی زبان کی ایک جنبش سے سحبان بیان۔ اوایل میں جناب غفران مآب حافظ عبدالرحمٰن خان احسان غفراللہ لہ سے نسبت تلمذ کی حاصل تھی اور اب جناب فیض مآب مولانا مخدومنا مشہور عرصۂ یکتائی، حضرت صہبائی، مدظلہ العالی سے مستفید ہے۔ پیشۂ عاشقی شعرائے چرب زبان کی فقط قیل و قال ہے اور اس شیریں گفتار کا حال۔ مدام ماہ رویان شیریں کلام سے ہم صحبت اور ہمیشہ نیکوان خوش اندام سے ہم خلوت۔ معشوقہ ہائے ملیح کے خوان وصل سے نمک چش اور خوبان صبیح کے بادۂ وصال سے قدح کش۔ یہ اشعار گوہر نثار اس کے درج سخن سے انتخاب ہوئے:

ہم خوش تھے کہ محشر میں تو دیکھیں گے وہ دیدار
لیکن یہ قیامت ہے کہ محشر نہیں ہوتا

کس منہ سے کروں دل کی شکایت کہ برا ہے
تجھ سے تو جدا وہ کبھی دم بھر نہیں ہوتا

کب تک یہ ستم تیرے سہے جائیں گے ہم سے
ہوتا ہے جگر سینے میں، پتھر نہیں ہوتا

میں تجھ کو نہ کہتا تھا، حسینوں کو نہ دے دل
رفعت کوئی ان لوگوں سے جاں بر نہیں ہوتا

دیکھیے کرتا ہے کیا دن رات کا رونا ترا
روگ یہ بے ڈھب تجھے اے چشم گریاں ہو گیا

آہ کی آتش فشانی سے تھا عالم کا ضرر
اور کیا ضبط، اب تو دل سینے میں بریاں ہو گیا

رو تو اے شوق شہادت سر پہ اپنے ہاتھ دھر
لوگ کہتے ہیں کہ قاتل کچھ پشیماں ہو گیا

میں نے برسوں دل کو پالا اپنے بر میں ناز سے
اور یہ دم بھر میں ایسا دشمن جاں ہو گیا

ہو برا بے تابیِ دل کا کہ اس کے ہاتھ سے
راز پنہاں ایک عالم پر نمایاں ہو گیا

میں لگائے جس کو رکھتا تھا گلے سے رات دن
بار گردن ضعف سے وہ ہی گریباں ہو گیا

تم رہے زلفیں بناتے واں، یہاں ہم مر گئے
اتنے ہی عرصے میں کچھ کا کچھ مری جاں ہو گیا

حسن کی خوبی سے بھی واقف نہ تھا اپنے وہ شوخ
دیکھتے ہی دیکھتے اک آفت جاں ہو گیا
یا الٰہی درد کس پردہ نشیں کا تھا کہ شب
دل میں اٹھ اٹھ کر مرے دل ہی میں پنہاں ہو گیا
خدنگ پہلو میں بیٹھا تو اس کے دیکھ کے پر
میں سمجھا خط کو مرے لے کے نامہ بر آیا
دل و جگر کو نہ جا کر لگی ہو آگ کہیں
نفس نفس کے ہے ہم راہ یہ دھواں کیسا
مژہ کو چھیڑے تو مدت ہوئی پہ یہ اب تک
چبھے ہے خار سا سینے کے درمیاں دیسا
نہ دل کے پاس جگر نے جگر کے پاس تواں
پڑا ہے تفرقہ یاروں کے درمیاں کیسا
خدا نہ کردہ، کرے نالہ گر ترا عاشق
تو پھر زمین یہ کیسی یہ آسماں کیسا
کچھ آنکھ کا گیا، نہ گیا کچھ خیال کا
مارا گیا دل اور یہی بے قصور تھا
میرا یہ قتل اور وہ نازک دماغیاں
اتنا بھی لطف حق میں مرے تم سے دور تھا
رحم اس کا ہو کہ نالے کا اثر ہو کچھ ہوا
نزع میں بارے وہ لینے کو خبر آ ہی گیا
تھا ہدف غیر پر اپنا تھا مقدر جو درست
غلط اندازی سے وہ تیر ادھر آ ہی گیا

آج کچھ رفعت دل خستہ کا احوال ہے غیر
جو کہ دھڑکا تھا سو وہ پیش نظر آ ہی گیا

نہ کیجو قصد تو پیکاں کے آزمانے کا
کہ زخم دل کو ہے پانی کے ڈھب چرانے کا

بسان طائر رنگ پریدہ وحشت سے
کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا

نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے گر ہم
یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا

ا۔نسخہ مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ (ص ۲۴۶)
''رحم اس کا ہے کہ نالے کا اثر کچھ ہو گیا''۔

گندھی تھی کون سے بدمست تشنہ لب کی وہ خاک
کہ جس سے خم یہ بنا ہے شراب خانے کا

شب وصال میں دیتا ہے لطف کیا کیا کچھ
ہر ایک بات پہ عالم یہ منہ بنانے کا

بہ ذوق ناز کو دے رخصت جفا کہ یہاں
ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا

سمجھتا کاش میں اول کہ بے وفا تجھ میں
چرا کے دل کو ہے طور آنکھ کے چرانے کا

نہ ان کو ناز سے فرصت کہ ہم سے ہو کچھ چھیڑ
نہ ہم کو ضعف سے یارا ستم اٹھانے کا

تری گلی میں ہوئے خاک بھی تو کیا حاصل
ترا ہے ڈھب وہی دامن اٹھا کے آنے کا

گھٹے ہے جوں جوں ملاقات شوق بڑھتا ہے
کہ ڈھنگ یہ بھی محبت کے ہے بڑھانے کا

اسی کے ساتھ تھے چرچے جہان کے سارے
بہت رہا ہمیں افسوس دل کے جانے کا

برا ہو بادِ خزاں کا کہ دم کے دم میں یہاں
کیا ہے فیصلہ بلبل کے آشیانے کا

ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے ان کو راز و نیاز
اور ایک ہم ہیں کہ منہ تکتے ہیں زمانے کا

کم ہو گئی شاید بت و بت خانہ کی الفت
کچھ ان دنوں آتا ہے جو رہ رہ کے خدا یاد

ظالم تو کسی سے تو ذرا رحم سے پیش آ
دنیا میں کرے گا کوئی کیا تجھ کو بھلا یاد

کچھ میری ہی جانب سے نبھی اتنی بھی ورنہ
تم کو تو وہ اقرار بھی اپنا نہ رہا یاد

بیٹھ اے تیر ستم گر تو دل زار کے پاس
بیٹھتے یار ہیں دنیا میں سدا یار کے پاس

صبر بھی تیرے ہی کچھ ڈھنگ ہے سیکھا کہ اسے
عمر آئے ہوئے گذری ہے دل زار کے پاس

تجھ کو لینی ہے تو لے ورنہ اجل لیتی ہے
جاں جو کچھ باقی رہی ہے ترے بیمار کے پاس

ہائے پانی بھی چوانے کو نہ آیا دم مرگ
کوئی جز گریۂ حسرت ترے بیمار کے پاس

در مے خانہ کو سمجھا ہوں در کعبہ کہ یاں
جب میں آتا ہوں تو آنکھوں سے لگا جاتا ہوں

بعد مرنے کے بھی الفت نہ گئی دل سے کہ میں
خاک ہو کر ترے دامن سے لگا جاتا ہوں

آتش عشق سے جل جل کے بنا ہوں سرمہ
کوئی دن کو تری آنکھوں میں بھی آ جاتا ہوں

لب ہیں جاں بخش یہ کہیے کہ میں ان کی خاطر
اپنے جینے ہی سے مایوس ہوا جاتا ہوں

یوں چلے جاؤ تم اور ہم چپ رہیں
دب کو تھے کیا جانے ہم کس دھیان میں

منہ میں جو آئے ترے واعظ تو کہہ
پر نہ کہیو کچھ بتوں کی شان میں

پونچھے اشک اس نے گمان غیر میں
مر گئے ہم اتنے ہی احسان میں

جاں اجل کو دیں گے اک جھگڑے کے ساتھ
تو ہے جو دے دیں تجھے اک آن میں

رہی بعد از فنا بھی گر یہی اس دل کی بے تابی
تو محشر تک رکھے گی زلزلے میں خاک مدفن کو

رفیق

رفیق تخلص مرد میدان تہور، رفیق علی نام کا ہے کہ مدت العمر سے زمرۂ سواران انگریزی میں منسلک اور سلسلۂ علایق سے آزاد ہے۔ اس کے سوا کچھ اور حال اس کا دریافت نہیں۔ یہ ایک شعر اس کے نتائج طبع سے مسموع ہوا:

تھی بجھی زہر میں تیغ نگۂ یار رفیق
کہ لگا زخم جو دل پر سو وہ ناسور ہوا

رقم

رقم تخلص صاحب پایۂ ارجمند حکیم سکھانند۔ فن طبابت میں اپنے عصر کا وحید اور صناعت شعر میں شاہ نصیر مرحوم سے مستفید۔ یہ شعر اس کے افکار سے ہے:

وفور شوق میں رخ کے لیے دھاں کے لیے
نہیں تمیز کہ بوسے کہاں کہاں کے لیے

رمز

رمز نام نامی و تخلص گرامی ہے اس والا جاہ، بلند پایے گاہ کا کہ رستم اس کے آستانے کا ایک چاکر اور حاتم اس کے نعمت خانے کا ایک دریوزہ گر۔ آفتاب کو اسی کے پرتو ضمیر سے شعاع ہے اور آسمان کو اسی کی بلندیٔ جاہ سے ارتفاع۔ زمانہ اگر اس سے رتبہ افزائی نہ سیکھتا، نہ سکندر کو جہانگیر کرتا اور نہ دارا کو تاج دار۔ آفتاب اگر اس سے مایہ بخشی حاصل نہ کرتا، نہ معدن کو زر سے مالا مال کرتا اور نہ ابر کو گوہر بار۔ دریا اس کے جود کی خجالت سے آب آب اور کوہ اس کے حلم کی غیرت سے ہمہ تن اضطراب۔ تیغ شجاعت اعداء کے واسطے برق خرمن، کمند جرأت اشقیا کے واسطے رگ گردن۔ رستم اس کے عرصۂ پیکار میں زال سے کم، دستاں۔۔۔۔ اس کے میدان جنگ میں ہراساں۔ فریدوں کو اس کے دربار عام میں مجال نہیں اور جمشید کو اس کی

بزم خاص میں کچھ وقار نہیں۔ اس کی زیادہ بخشی سے دامن ہر سائل کا کان زر اور اس کے نیسان لطف میں اشک ہر یتیم کا گنج گوہر۔ کمال شفقت سے گلوے تشنۂ اعدا کو آب شمشیر سے سیراب کیا اور نہایت مرحمت سے نخل عمر دشمن کو چشمۂ تیغ سے شاداب۔ اے صابر شیریں گفتار زبان قلم کس کی حمایدِ بے شمار سے گوہر ریز ہے کہ ہر سخن سے شوکت چہرہ نما اور ہر حرف سے ابہت نقاب کشا ہے۔ بیان کو روشن کر اور دعوے کو مبرھن۔ یہ وہ داور ہے کہ اگر چشم نرگس میں غبار پڑ جائے موج نسیم معاتب ہو اور اگر پہلوے گل کو نوک خار سے آزار پہنچے، صبا مخاطب ہو۔ اور یہ وہ داور ہے کہ پایہ اس کے ایوان رفیع الارکان کا فرق افلاک پر ہے اور سایہ اس کے لطف و مرحمت کا تمام روے خاک پر۔ اور یہ وہ داور ہے کہ خار اس کے دشت نبرد کا علم کاویانی ہے اور ہاتھ اس کے جود و سخا کا ابر نیسانی۔ اور یہ وہ داور ہے کہ اس کے عہد میں گرگ تہمت خون یوسف سے لرزاں ہے اور تغافل آنکھ چرانے کے جرم سے نظر بندی کے شایاں۔ یعنی داور روا دگر، سایہ گستر، قدر دان ہنر، رتبہ شناس ہنرور، دولت پناہ، اقبال دست گاہ، گردوں رفعت، آسمان شوکت، جمشید بزم، افراسیاب رزم، داور بے مثال، خداوند بے همال، آسمان چاکر، چاکر پرور، ماحیِ آثار ظلم و بیداد، دافع رسوم شر و فساد، قامع بنیان جور و جفا، حادم اساس رنج و عنا، وارث تاج و نگیں، والی زمان و زمیں، ولی عہد خلیفۃ الحق، شائستہ خلافت مطلق، معین ارباب شجاعت و تہور، مرزا فتح الملک بہادر دام اقبالہ و ضاعف اجلالہ کہ اس کے حرف معدلت کے مقابل حکایت نوشیرواں افسانۂ دروغ ہے اور اس کے ذکر شجاعت کے رو بہ رو داستان رستم بے فروغ۔ تیر اس کا بے دست یاری زہ و کمان سینۂ اعدا کی طرف دواں اور خنجر اس کا بے مددگاریِ دست و بازو گلوے دشمن پر رواں۔ شہرۂ جود سے نام حاتم بے نشان اور نہیب حملہ سے پاے سام گریزاں۔ صبا کو اگر قواعد جود تعلیم کرے، پشت سرو مدام بار ثمر سے دوتا رہے، اور اگر نسیم کو رسوم نشاط سکھائے دہن غنچہ ہمیشہ فرط تبسم سے وا

رہے۔ اس کثرت مہمات خلافت اور ہجوم امور سلطنت پر آرایش سخن کی طرف توجہ اور پیرایش نظم کی جانب التفات اس مرتبہ ہے کہ اگر باد صبا زبان سوسن کو گویا نہ کرے، نونہالان چمن کی تربیت سے معزول ہو اور اگر نسیم دہان گل کو حرف سرا نہ کرے، غدر بے استعدادی نا مقبول ہو۔ رزمیہ میں مصرع ہائے ابیات تیغ دو دم، بزمیہ میں دوائر حروف جام جم۔ بلبل فصیح زبان کو اس کی تعلیم سے دریافت ہوا کہ برگ گل پر قطرات شبنم لفظ آتش کے نقاط ہیں اور قمری بلیغ گفتار کو اس کے ارشاد سے منکشف ہوا کہ بیاض خیاباں میں قلب صنوبر سے معمّی بافراط ہیں۔ سخن عذوبت معانی سے ایسا دل چسپ کہ اس کی تکرار لب شوق پر قند مکرر ہے۔ نظم حسن مضامین سے ایسا دل کش کہ خاطر عشاق میں جلوۂ عرایس سے شوق انگیز تر ہے۔ اسی دل کشی کا اقتضا ہے کہ ہر چند یہ کلام بلاغت نظام ادب کی مصلحت سے افسر کتاب ہو کر گرسنہ چشمان سخن کے واسطے خوان گستر اور قدر شناسان معنی کی نظر میں جلوہ گر ہو چکا ہے، فرط شوق نے دامن ضمیر کو ہاتھ سے نہ چھوڑا کہ اس چمن زار سیراب کی گلگشت جب تک دوبارہ نذر تماشا نہ ہوگی، نہ خامہ قدم اٹھا سکے گا اور نہ شغل تحریر ہاتھ بڑھا سکے گا۔ اور حق یہ ہے کہ اس نوبادۂ معنی کی لذت سے طبیعت کی سیری حال ہے اور اشتیاق کی کمی وہم وخیال۔ اگر کام ہوس اس سے چاشنی گیر اور مذاق آرزو اس سے لذت پذیر نہ ہو، ناکامی ابد پر نوحہ اور محرومی دائمی پر گریہ درکار ہے۔ اس واسطے پھر طبائع اہل ہنر کی ضیافت کا سامان مہیا اور ارباب کمال کی تفریح کا اسباب آمادہ ہوتا ہے:

آنکھیں تو اس کو دیکھ کے ہوتی ہیں بے قرار
بن دیکھے دل تڑپنے لگا اس کو کیا ہوا
ہوا شوق تماشا جب سے تیرے روے نیکو کا
نہ میں قابو کا ہوں دل کے نہ دل ہے میرے قابو کا
ڈھونڈو گے جان کو بھی محبت کی راہ میں

پھرتے ہو رمز دل کی ابھی جستجو میں کیا
کیا قتل ظالم نے کس کس ادا سے

ملا مجھ کو قسمت سے جلاد اچھا
سب کچھ آساں ہے تجھے گردش دوراں کرنا

ایک مشکل مری مشکل کا ہے آساں کرنا
دل دیا تھا جسے دل دار سمجھ کر میں نے

رمز اب وہ ہی دل آزار ہوا، ہائے نصیب!
حال سن سن کے عشق میں تیرا

رمز کرتے ہیں خاص و عام افسوس
ذبح ہونا میرے حق میں ہے حیات جاوداں

آب خنجر میں ترے ہے آب حیواں کا خواص
کیسی زمیں کہ غرق ہوا آسماں تلک

اے گریہ! اب یہ جوشش طوفاں کہاں تلک
تصویر صنم پیش نظر رہتی ہے اپنے

کعبے میں تو جا کر ہوئے بت خانہ نشیں ہم
اس شوخ کو میں نامے میں القاب کیا لکھوں

مشفق نہیں، شفیق نہیں، مہرباں نہیں
خوبیاں ساری خدائی کی بتوں پر ختم ہیں

بے وفائی کا مگر شکوہ ہے "بت گر" سے ہمیں
لب ملے کیوں کہ تیری مجلس میں

دیکھ کر تجھ کو جان ہے کس میں
نہ حرم میں جگہ نہ دیر میں جاے

ہم گئے جائیں گے اے خدا کس میں

ذبح کو خواہ چھوڑ دے صیاد

آ پھنسے اب تو ہم ترے بس میں

سرمایہ جو محیط میں دیتے قرار رمز

ہے میرے ایک گوشۂ چشم پر آب میں

رمز الفت میں جو چاہو آرام

تو یہ راحت طلبی جانے دو

رمز وہ مست ناز ہے فتنہ

اس کو سونے دو کیوں جگاتے ہو

اگر ہوں قابل دیدار آنکھیں

جدھر دیکھوں ادھر آئے نظر تو

بعد مردن بھی نہ چھوٹا ہم سے ذوق مے کشی

خاک سے اپنی سبوے مے بنے ساغر بنے

ہم نے تو غم یار میں یوں عمر بسر کی

مر مر کے جو کی شام تو رو رو کے سحر کی

کاٹ دے اس کو بھی تو اے قاتل

لگ رہی گردن اک ذرا سی ہے

مل رہے گا وہ کبھی تو ہم نشیں

اس کے ملنے کی تمنا چاہیے

رنج

رنج تخلص ہے جناب مستطاب، معلیٰ القاب، غفران مآب زبدۂ اصفیاے

کرام، اسوۂ کملائے عظام، حضرت شاہ محمد نصیر محمدی کا، طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ، کہ سجادہ نشین اور نواسے حضرت بابرکت قدوۂ تخت نشینان قصر فردوس، خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ والغفران کے تھے۔ کمالات ظاہری و باطنی اس ایک ذات بابرکات میں جمع تھے۔ باوجود وفور اخلاق کے ہیبت بزرگانہ اس کے چہرۂ نورانی سے اس طرح جلوہ گر تھی کہ یکا یک گستاخ طبعان شوخ مزاج کو یارائے کلام نہ ہوتا تھا:

ہیبت حق ہست ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

باوصف تعلقات ظاہری کے ایسا قطع تعلق کیا تھا کہ ان کی نظر عالی میں تمام دنیا برابر ذرے کے قدر نہ رکھتی تھی۔ نہ دنیا کے جاہ و حشمت کے آنے کی خوشی اور نہ جانے کا غم۔ بسا اوقات مشاہدہ ہوا کہ جو کچھ پاس آیا، سب مستحقین پر تقسیم کر کے آپ بالکل تہی دست رہ گئے۔ اگر کبھی متاع دنیا سے اس قدر گنجینۂ حصول میں ذخیرہ ہوا کہ حوصلۂ حرص و آز بھی اس کا متحمل نہ ہو، پیشانی پر شگفتگی کے آثار ہویدا نہ ہوئے اور اگر اس سے زائد کیسۂ مراد سے زیان ہوا نشان ملال ناصیۂ حال سے پیدا نہ ہوئے۔ علم موسیقی اور حساب کو ایسا کمال کو پہنچایا تھا کہ زبان قلم ان کی تقریر اوصاف میں قاصر ہے۔ ایک رسالہ تال میں لکھا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعوئ یکتائی اس فن میں سوائے اس یکہ تاز کمال کے دوسرے کو سزاوار نہیں، اور علم حساب میں جمع اعمال میں تنصیف سے جبر و مقابلہ تک یک لخت قواعد جداگانہ اور علاحدہ ان قواعد سے جو کتب متداولہ میں ثبت و مرقوم ہیں، ایجاد کیے اور ہر عمل کے واسطے نیا طریق مقرر کیا اور ان ضوابط مخترعہ سے کئی رسالے مرتب کیے۔ وہ سب رسالے ہنوز مسودہ تھے کہ جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ سال بارہ سو اکسٹھ ہجری غرہ شوال روز یک شنبہ تھا کہ زمین فردوس ان کے قدوم فیض لزوم سے سرسبز ہوئی۔ مومن خان مومن تخلص مرحوم نے کہ جناب جنت مآب موصوف سے خویشی و دامادی

کی نسبت رکھتے تھے، تاریخ وفات میں یہ قطعہ لکھا:

شیخ زماں شد ز دہر، وز پئے سال وفات
فکر بلندم رہ جنت ماوا گرفت
گفت بہ مومن، ملک خواجہ محمد نصیر
در قدم ناصر و درد نکو جا گرفت

ازبس کہ طبیعت فیض طوبت مطالب عالیہ و مقاصد بلند کی طرف متوجہ تھی، شعر کی جانب کم التفات فرماتے تھے۔ لیکن گاہ گاہ اس راہ میں بھی اتفاقاً گذر اور زمین سخن کو رتبۂ فلک الافلاک کا مرحمت ہو جاتا۔ یہ چند شعر بطریق یادگار مرقوم ہوتے ہیں:

ٹھیرا نہ یہاں تو کارخانہ اپنا ۔ افسوس دلا
واں دیکھیے ہووے کیا ٹھکانا اپنا ۔ ہے طور برا
اپنا وہ تھا کہ جس سے بیگانہ رہے ۔ نادانی سے
بیگانہ وہ تھا کہ جس کو جانا اپنا ۔ کیا قہر کیا

خط دیکھ کے ادھر تو مرا دم الٹ گیا
قاصد ادھر بہ دیدۂ پرنم الٹ گیا

تیرے بن جب تک کہ میرا دم رہا
آہ اور نالہ ہی بس ہم دم رہا
کان کا موتی نہیں عاشق کا اشک
سردی مہری سے تری یوں تھم رہا
یاد میں اس گل بدن کی صبح تک
اشک سے تکیہ مرا سب نم رہا

یقیں ہو گیا دیکھ کر اس کا قامت

کہ بے شک قیامت میں دیدار ہو گا

کھڑکی نکال جانب دشمن نہ بام پر

کوٹھے چڑھی جو بات کھلے خاص و عام پر

یاد دلوا کے جو ہم بستریٔ یار رلائے

سو وہ تصویر نہالی ہے بغل کا دشمن

دل یہ جس کے لیے پہلو میں طپاں رہتا ہے

یہ سنا ہے کہ اسے بھی خفقاں رہتا ہے

زندگی تلخ و ناگوار ہوئی

آنکھ سے آنکھ جب دو چار ہوئی

رند

رند تخلص ہے نوجوان سعادت مند، اکرام الدین نام کہ کہ مولوی عبدالعزیز عزیز اور مولوی عبدالکریم سوز حاجب زادگان حضرت استادی کا ماموں زاد بھائی ہے۔ تحصیل کتب فارسی اور کسب فن شعر مولوی عبدالکریم سوز کی خدمت میں کرتا ہے۔ بہت ذہین ہے اور گاہ گاہ تحصیل طب کی طرف متوجہ ہے۔ اس کی غزل میں اکثر اشعار، خصوصاً مقطع اپنے تخلص کا مصداق ہوتا ہے۔ یہ چند شعر اس کے نتائج سے ہیں:

تری زلف بکھری بکھری جو نہ دیکھتے کبھی ہم

تو نہ ہوتے یوں پریشاں، نہ یہ حال زار ہوتا

نہ وصال اس سے ہوتا، نہ اٹھاتے رنج فرقت

جو شراب ہم نہ پیتے تو یہ کیوں خمار ہوتا

مرے نام سے ہے ظاہر مرا حال مے کشی کا

مجھے زندہ کون کہتا، جو نہ بادہ خوار ہوتا
گلہ نہیں ہے ہمیں کچھ ترے ستانے کا
ہے اب کے طور ہی بگڑا ہوا زمانے کا
وہ مر گئے تری صحبت کے یار، کیا اے رند
جو آج کل نہیں چرچا شراب خانے کا
تو نے جلا جلا کے ہمیں خاک کر دیا
اور خاک ہو گئے تو صبا نے اڑا دیا
تو نے ہماری یاد کو خاطر سے اپنی ہائے
حرف غلط کی طرح سے، ظالم مٹا دیا
لگتی چلی تھی، فتنۂ محشر کی آنکھ پر
ٹھوکر لگا کے شوخی سے، تم نے جگا دیا
ہم پر تو التفات نہ تھے ایک بزم میں
ساقی نے رند جان کے ساغر پلا دیا
رند مے پینے سے بچتا تھا بہت ہی لیکن
کچھ نہ کچھ یاروں کی صحبت کا اثر آ ہی گیا
آتے ہی فصل گل کے بجز شوق مے کشی
اے رند سوجھتا نہیں سود و زیاں مجھے
پاس آ کر مرے خفا بیٹھے
بیٹھے گر اس طرح تو کیا بیٹھے
کارگر دل میں یوں ہوئی مژگاں
جس طرح ناوک قضا بیٹھے
دل میں آنا ترا نہیں مشکل

ہو گئے غبار جب آ بیٹھے

ناتوانی پہ بھی کوچے میں ترے اے ظالم

شوق دیدار اڑائے لیے جاتا ہے مجھے

ا۔نسخہ اول (ص ۲۵۲) ''ترے''۔

ترے مریض کی حالت بتر ہے کیا کہیے

اور اس کے حال سے تو بے خبر ہے کیا کہیے

رند

رند تخلص، سید محمد خاں لکھنوی۔ مشتاق قدیم اور صاحب طبع سلیم ہے۔ دو دیوان ریختہ اس سے یادگار اور حلیۂ طبع سے محلی ہو کر اکثر نواح ہندوستان میں منظور سخن سنجان روزگار ہیں ا۔ دو تین برس ہوئے کہ درد تن کو خاک میں ملا کر صاف کوثر و تسنیم کے شوق میں باغ جناں کی طرف راہی ہوا۔ یہ چند شعر اس کے مرقوم ہوتے ہیں:

اب عشق و عاشقی کا زمانہ نہیں رہا

جاتا رہا وہ وقت وہ ہنگام ہو چکا

ہوشیاری نے ستم گر تری بے ہوش کیا

تیری گفتار نے ظالم مجھے خاموش کیا

گل کو دیکھا تو بندھا عارض رنگیں کا خیال

غنچہ گر باغ میں دیکھا تو دھن یاد آیا

ناز بے جا اٹھایئے کس کے؟

اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

کب مٹا عشق کا نشاں دل سے
زخم اچھا ہوا تو داغ رہا
ہم آفتاب بام ہیں یا ہیں چراغ صبح
کیا اعتبار شام گئے یا سحر گئے

۱۔ نسخۂ اول ص ۲۵۹ ''ہے''۔ نسخہ دوم (ص ۲۵۲) ''ہیں''۔

رکھ دیا سر کو پائے قاتل پر
مرتے مرتے بھی جی چلا بیٹھے
خاک ہو کر ہی ہم اٹھیں تو اٹھیں
اب تو در پر تمہارے آ بیٹھے

رنگین

رنگین تخلص سعادت یار خاں۔ اس کا اپد ربزرگ وار طہماسپ بیگ خاں تورانی سات برس کی عمر میں روم سے ہندوستان میں آیا اور پیش گاہ عنایت سلطانی سے منصب ہفت ہزاری و خطاب محکم الدولہ طہماسپ بیگ خاں اعتصاد جنگ بہادر سے سرفراز ہوا۔ ہر چند یہ صاحب ہنر زمین سرہند میں متولد ہوا، لیکن ایام صبی سے دم واپسیں تک خاک پاک شاہجہان آباد لطافت بنیاد میں بسر کی۔ گو کہ گاہ گاہ بہ طریق سیاحت کے اطراف و جونب کی طرف متوجہ ہو کر لطف سفر سے بہرہ مند اور چندے شاہزادۂ گردوں شوکت مرزا محمد سلیمان شکوہ کی ملازمت سے ارجمند ہوا۔ اوایل حال میں شاہ حاتم سے تربیت پائی اور فن شعر کو اس کی خدمت میں کسب کیا۔ جب شاہ موصوف نے وفات پائی، پھر کس سے اصلاح شعر کا اتفاق نہ ہوا اور ہمیشہ اپنے زور

طبع کے اعتماد پر آپ اپنے سخن میں حک و اصلاح کی۔ یہ بات اس کی تراکیب سخن سے ظاہر اور اس کی بندش الفاظ سے باہر ہے۔ کثرت مشق سے دفتر دفتر

ا۔ نسخہ مطبوعہ مطبع مرتضوی ۱۲۷۱ھ میں 'اور سکا' اور نسخہ دوم (ص ۲۵۴) میں ''اس کا'' ہے۔

اشعار کا لکھنا اس کے نزدیک ایسا تھا جیسے رقت مداد کے سبب سے کسی کی زبان قلم سے ایک قطرہ بے اختیار کاغذ پر تراوش کرے۔ آخر عمر تک اس شہ سوار عرصۂ سخن کے قلم کی سیر مثل جمازہ سور کے لا ینقطع رہی۔ ہرچند اس مرد سنجیدہ نے اپنے زور طبع سے سخن کو موزوں کیا لیکن اور کسی کا مقدور نہیں کہ اس کے مجموعۂ سخن کو ترازو میں وزن کر سکے۔ بیشۂ سخن وری میں ببر ژیاں اور نیستان سخن میں شیر غراں تھا۔ مضامین نازک اس کے صریر قلم کو نعرۂ شیر اسمجھ کر شگاف خامہ سے سر باہر نہ نکال سکتے تھے۔ اس سرمایہ دار سخن کی عمر کا سرمایہ چار دیوان ہیں۔ اول مسمی بہ ''دیوان ریختہ'' اور دوسرا دیوان مسمی بہ ''دیوان بیختہ'' اور اس دیوان کی ہر زمین میں دو غزلے کا التزام اور اپنے زعم کے موافق شستگی الفاظ و پاکیزگی عبارت میں نہایت اہتمام کیا ہے۔ تیسرا دیوان مسمی بہ ''دیوان آمیختہ'' اور اس میں حرف ہزل گوئی کی داد دی ہے۔ چوتھا دیوان ریختی کا مسمی بہ ''دیوان انگیختہ'' اور ان چاروں دیوان کا نام ''چار عنصر رنگین'' ہے۔ اور سوائے دواوین اربعہ کے چند کتب اور یعنی مثنوی شاہزادۂ مہ جبین اور رانی سری نگر کے حال میں اور ایک مثنوی مسمی بہ ''ایجاد رنگین'' اور نسخہ ''مجالس رنگین'' اور ''رنگین نامہ'' ''محمود نامہ'' کے جواب میں اور ایک ''فرس نامہ'' علم فروسیت میں اس جامع انواع سخن سے یادگار۔ اور ان سب کتابوں کا نام ''نورتن'' ہے۔ دیوان دوم کے دیباچے میں کہ زبان اردو میں اس رنگیں نگار چابک

رقم کا لکھا ہوا ہے،

ا۔ نسخہ دوم (ص ۲۵۳) میں "شعر" غلط ہے۔

ریختی کو اپنا ایجاد بیان کیا ہے۔ راقم کے عندیے میں تو ادعائے محض ہے۔ اس واسطے کہ انشاء اللہ خاں سے بہت ریختیاں مشہور اور السنۂ عوام پر مذکور ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس ظریف طبع شوخ مزاج نے ابیات ریختی کو ریختے کا قصر تصور کر کے اسی شبستان میں اپنا گھر بنا لیا تھا اور اس کی ریختی نے اس قدر شہرت پائی تھی کہ انشاء اللہ خان کی ریختی اہل روزگار کی خاطر سے فراموش ہو گئی تھی۔ اگر راقم سے پوچھیے تو انشاء اللہ خاں نے ریختی کی اول بنا ڈالی، اس معمار سخن نے اس بنا کو بلند بلکہ تمام کیا۔ اس کے بعد جان صاحب لکھنوی نے اس عمارت میں صفائی و رنگینی زیادہ کی۔ نازنین۔ اس محل کو اپنی جلوہ گاہ بنایا اور اس قصر دل نشین کو کمال زینت سے حجلۂ عروس کر دیا۔ رنگین شیریں کلام میدان سخن میں تو یکہ تاز تھا ہی، لیکن فن شہ سواری میں ایسا کمال تھا کہ اگر فی المثل اسپ چوبیں اس کے زیر ران ہوتا، اس طرح کا چالاک ہو جاتا کہ اگر نگاہ فلک سیر اس سے ہم جولان ہوتی، نصف راہ میں رہ جاتی۔ اور فن فروسیت میں یہ مہارت تھی کہ گھوڑے کے نقش پا سے اس کا ارادہ معلوم اور نشان سم سے عیب و ثواب مفہوم ہو جاتا۔ "فرس نامہ" اس کے کمال پر گواہ اور اس سخن کا شاہد ہے۔ یہ چند شعر اس کے کلام سے انتخاب ہوئے:

ربط ہم سے آپ نے جو اب بہت کم کر دیا
سچ بتاؤ تم کو صاحب کس نے برہم کر دیا

یہ طفل اشک مرا ہو گیا ہے کچھ ابتر
نہیں ہے اس کی مری چشم اشک بار میں جا

پڑا یہ ہے ترے کوچے میں کیوں شہید نگہ
مگر اسے نہیں ملتی کسی دیار میں جا

کیا کرتے ہو ناصح تم نصیحت رات دن مجھ کو
اسے بھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

مجھے جو دیکھتا ہے آج کل کہتا ہے وہ ہنس کر
نظر آتا ہے مجھ کو ان دنوں تو کچھ مکدر سا

دل بغل سے لے گئی رنگیں وہ دزدیدہ نگاہ
ورنہ دل دیتا ہے کون اپنا کسی کو جان کر

چھپ قہر ہے کسی کی، کسی کی ستم تراش
سب سے تری نرالی ہے کچھ اے صنم تراش

تھی ہوس یہ دید کی رنگیں کہ میری بعد ذبح
رہ گئیں آنکھیں کھلی حیرت سے قاتل کی طرف

خمار عشق میں بازی لگائیں کس بھروسے پہ
بساط اپنی میں تھا اک نقد دل سو ہار بیٹھے ہیں

حسرت و حرمان و یاس و حیرت و رنج و تعب
کیا کہوں اس ہجر میں کیا کیا ہے اور کیا کیا نہیں

وعدہ آنے کا کر کے اے بد عہد
پھر تغافل ترا قیامت ہے

رھا

رھا تخلص، غلام محمد خاں، قوم افغان، ساکن اکبرآباد، شاگرد و خلیفہ سید گلزار علی اسیر۔ جد بزرگوار اس کا سرکار والی بھرت پور میں عہدہ ہائے جلیلہ سے ممتاز رہا اور

اس کے پدر عالی مقام نے، ازبس کہ ایام طفلی میں شوق سلح شوری غالب تھا، اسی سرکار میں عہدۂ سپہ گری پر مامور ہو کر کثرت اعتبار سے ابنائے روزگار میں امتیاز بہم پہنچائی۔ کہتے ہیں کہ اس کامل خرد نے مولوی محمد کامل علیہ الرحمۃ سے کہ نجوم و ھیئت و ہندسے میں یگانۂ روزگار اور وحید قرون و ادوار تھے، تمام کتب درسیہ ابتدا سے انتہا تک پڑھی ہیں۔ ریختہ میں زبان شستگی اور فکر بلندی سے خالی نہیں ہے۔ یہ چند شعر اس کے مرقوم ہوئے:

کیوں قافیہ یاں تنگ نہ ہو اہل سخن کا
مضموں ہے مرے شعر میں تنگی دہن کا

اللہ رے بناوٹ کہ بگڑنے لگے سن کر
کچھ وصف کیا میں نے جو بے ساختہ پن کا

عریاں تنی کے لطف اٹھیں گے شب وصال
اس ماہ نے کیا ہے لباس کتاں پسند

دل لگ چلا ہے اس کا بھی شاید کسی طرف
آنے لگا جو کچھ مرے غم کا بیاں پسند

پھرتے ہیں یوں دل چھپائے ہم ہوائے دہر سے
جس طرح لائے چھپا کوئی تہہ دامن چراغ

اسے غیر کی بزم سے کھینچ لایا
ہم آہ جگر کے اثر پر فدا ہیں

کی آخر کو رو رو جگہ اس کے دل میں
رسا ہم تری چشم تر پر فدا ہیں

کہنا ترا ہمارے سر آنکھوں پہ ناصحا
پر کیا کریں جو دل ہی نہ ہو اختیار میں

لو آج کس کی زلف معنبر کی لے اڑی
یہ بوے عطر بیز جو باد سحر میں ہے
دریا رواں ہو گر میں نچوڑوں اسے رہا
عالم سحاب کا مرے دامان تر میں ہے

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

باب زاء المعجمۃ

زار

زار تخلص حافظ امام بخش نابینا، متوطن شہر کرامت بہر تھانیسر۔ ہر چند تولد سے چھ مہینے بعد بیماری چیچک سے بینائی جاتی رہی لیکن بقول صائب:

دہ در شود کشادہ شود بستہ چوں درے
انگشت ترجمان زبان است لال را

اللہ تعالیٰ نے بعوض چشم ظاہر بیں کے دیدۂ دل کو روشن کر دیا تھا اور اس قدر صفائی باطن عطا کی تھی کہ ذہن گویا لوح محفوظ کا ایک ٹکڑا تھا۔ غالباً وہی ایک پردہ تھا کہ باطن سے اٹھا اور ظاہر پر پڑ گیا، تا کہ وہ نظر صافی جو پردگیان معنی کی تماشائی تھی، نظارہ خسائس ظاہری سے آلودہ نہ ہو۔ مختلف فریقوں سے صحبت واقع ہوئی اور ہر ایک کا فیض اس طرح سے اخذ کیا کہ کملا اسی قوم کے اس بزرگ کی ذات غرائب سمات کو مغتنم جاننے لگے۔ علم موسیقی کے دقایق کو اس طرح سے معلوم کیا تھا کہ اگر کسی کامل فن کے گانے یا بجانے کے وقت اس کے سر تحسین کو جنبش یا زبان کو گردش ہوتی، اس کو اپنے کمال پر دست آویز بہم پہنچتی، اور اگر یہ ماہر فن زبان تکلم کو ساکت کرتا، ہر چند ارباب محفل سب بہ اتفاق حرف آفریں پر شور حشر برپا کرتے، اس کو اپنی استعداد میں شک آ جاتا۔ شاعر کا یہ کلام واقعی ہے:

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین بے وقوف او سکوت سخن شناس

صرف اور نحو اور کچھ رسائل منطق بھی زبان عربی سے آشنا ہونے کے واسطے پڑھے تھے۔ اور اسی قدر استعداد پر بعضے اوقات اشعار عربی بہ اعتبار ترکیب نحوی کے سوائے معنی ظاہر کے کچھ اور ایسی توجیہ کرتا کہ سامع کو یکایک حیرت ہو جاتی۔ اور تمام تفسیر حسینی اور کتب حدیث میں سے صرف نصف مشکوٰۃ پڑھی تھی۔ اور طرفہ یہ ہے

کہ حافظے کی خوبی سے اس نصف کی سب حدیثیں ازبر اور مثل آیات قرآنی یاد تھیں۔ ذہن کی رسائی سے صحاح ستہ میں سے جو حدیث عرض کی جاتی، اسی قدر استعداد کے زور سے اس کو حل کر دیتا اور غالباً دیکھا گیا کہ وہ تحقیق شایبۂ خطا سے پاک ہوتی تھی۔ مذاق شعر فہمی ایسا تھا کہ فارسی کو فارسی اور ریختے کو ریختے کے مرتبے میں سمجھ کر اس کی ایسی داد دیتا کہ جان سخن سے آفرین نکلتی اور شاعر کو یقین ہوتا کہ مخاطب صحیح اس کے سوا منصۂ وجود پر جلوہ گر نہیں ہے۔ کتب درسیہ فارسی مثل سہ نثر ظہوری

ا۔ نسخہ دوم (ص ۲۵۶) ''ناشناس''۔

اور چار عنصر بیدل کے اکثر مقامات، اور بعض دواوین مثل دیوان ناصر علی، اور اکثر مقامات دیوان جلال اسیر جناب استادی مولائی مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھ کر اس فن میں استعداد معقول بہم پہنچائی تھی اور اکثر اشعار جلال اسیر کے مولوی منصف علی خاں مرحوم سے جو دقیقہ فہمی کلام کملائے زبان فارسی، خصوصاً جلال اسیر میں اپنے زعم کے موافق آپ کو یگانہ روزگار جانتا تھا، حل کیے تھے۔ ان فنون کے سوا دقائق صناعت کیمیا اور علم دعوت سے بہت واقف۔ کیمیا گر اور مہوسان کہن سال کو تکلم کے وقت اس کی اکسیر سازی پر یقین ہو جاتا تھا۔ لیکن اس باب میں سوائے سخن آرائی کے اور کچھ نہ تھا۔ مگر اعمال میں البتہ کچھ سخن نہیں ہے۔ بعض عمل محنت کشی اور ادائے زکوٰۃ کے وسیلے سے بہت کارگر اور نہایت موثر دیکھے گئے۔ ظرافت طبع کا یہ حال کہ اس قول مشہور کے موافق ''الہزل فی الکلام کالملح فی الطعام'' کوئی سخن لطیفے سے خالی نہ ہوتا۔ اس مقام میں خامۂ خام رقم ایک حکایت طرفہ اور ایک نقل غریب لکھتا ہے کہ ایک شخص کی زوجہ نے بیس برس پہلے اس واقعہ سے انتقال

کیا تھا کہ بعد ایک مدت کے ایک شخص سے تجھ کو ملاقات ہوگی، اور اس کی شکل و شمائل بھی بیان کر دی اور کہا وہ شخص تیری زوجہ کو کشور عدم سے پھر دار الملک وجود میں لے آئے گا۔ حسب اتفاق اس نے حافظ موصوف کو ایک جگہ کسی تقریب سے دیکھا اور وہ صفات اپنے وہم کے موافق اسی بزرگوار میں فراہم پائیں۔ پاؤں پر گرا اور مدعا بیان کیا۔ اس بزرگوار نے اول تو انکار محض کیا اور کہا کہ ظالم! ایسی حرکات سے توبہ کر اور اس عقیدۂ فاسد کو دل سے نکال کہ یہ امر سوائے رب قدیر کے کسی کے حیز قدرت میں نہیں۔ اس کو اس منجم کا قول ایسا خیال میں جما ہوا تھا کہ اس کلام کو عذر لنگ سمجھا اور ہرگز نہ مانا۔ اس وقت بعض آشناؤں کے اشارے اور اپنی ظرافت طبع کی اقتضا سے کہا کہ یہ کام دیوالی کی شب کے سوا اور ایام میں ممکن نہیں کہ سرانجام ہو۔ وہ شخص ہر ایک دیوالی کی شب اپنے مدعا کے واسطے حاضر ہوتا اور یہ شیریں سخن اس کو لطائف الحیل سے اس طرح ٹال دیتا کہ اس کا الزام بھی اسی کے ذمے ہوتا۔ یہ مخمصہ بارہ برس تک یوں ہی چلا گیا اور اس کو وہم تک نہ گزرا کہ یہ عذر واقعی ہے یا نتیجۂ ظرافت۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک طفل کو بارہ برس تک شیر سے محروم رکھا اور اس کے لب کو نالے سے آشنا اور چشم کو آب گریہ سے تر نہ ہونے دیا۔ یہ حکایت اس چالاک طبع پر صادق آتی ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ باوجود اس چرب زبانی کے گرد طمع اس کے دامن حال پر نہ بیٹھتی تھی۔ حصول مایحتاج پر کہ رزاق مطلق کی رزق رسانی کے وسیلے سے احسن وجہ سے حاصل ہوتا، قانع تھا۔ گاہ گاہ فکر شعر کی طرف بھی ملتفت ہوتا۔ سخن اس کا کم تو ہے لیکن سنجیدہ ہے۔ ماہ جمادی الاولیٰ بارہ سو ستر ہجری میں عالم فانی سے رحلت کی اور سینۂ احباب پر داغ مفارقت کو رکھا۔ دو چار شعر راقم کو یاد تھے، مرقوم ہوئے:

دکھلاؤں چارہ گر کو جو زخم جگر تو وہ
رو رو کے یوں کہے ہے کہ اس کا نہیں علاج

زار یوں دیتا ہوں تسکیں اس دل غم ناک کو
اب کوئی لاتا ہے اس نا آشنا بے باک کو
آشنا ہوتی ہے اس لب سے جو دشنام تو ہم
دل میں کہتے ہیں کہ دشنام ہمیں کیوں نہ ہوئے
نہ تو آنکھوں میں خواب آتی ہے
اور نہ کچھ دل میں تاب آتی ہے

زاھد

زاھد تخلص، خواجہ ولایت حسین۔ سوائے اس کہ مقیم آگرہ اور شاعر اعظم تخلص کا شاگرد ہے، حال معلوم نہیں۔ یہ دو تین شعر اس کی غزل سے انتخاب ہوئے:

خدا کے واسطے فرقت زدوں کو مت چھیڑو
نہ پوچھو یہ کہ کٹی کس طرح ہماری رات
کسی فریب سے بھی میں نہ جا سکا در تک
غضب کی تھی ترے کوچے میں ہشیاری رات
وہ رشک ماہ شب چاردہ جو ہو بر میں
تو کیسے چین سے زاھد کٹے ہماری رات

زر

زر تخلص، شیخ بلاقی، ابن شیخ سعد اللہ ولد شیخ بلند۔ وطن اصلی آبا و اجداد کا بلدۂ لاہور ہے ا۔ جد بزرگوار اس پسندیدہ اطوار کا انقلاب روزگار و گردش چرخ دوار سے موضع گوہانہ میں وارد ہوا اور اسی سرزمین میں قیام کیا۔ کبھی پیشۂ سپاہ گری اور گاہے کار زراعت کو وسیلۂ تحصیل معاش ٹھہرایا۔ اس بزرگ نے والد ماجد کی وفات کے

بعد پیشۂ سادہ کاری شیخ امام بخش سادہ کار دہلوی سے کہ اس فن

۱۔ نسخہ اول (ص ۲۶۶) "لاہوری"۔

میں شہرۂ آفاق ہے، کسب کر کے خاک اکبرآباد کو مسکن مقرر کیا۔ اگرچہ سیم و زر کے صفائح پر سادہ کاری کرتا ہے لیکن صفحۂ کاغذ اس کے نقش و نگار معنی سے رشک ارژنگ وغیرت کارنامۂ بہزاد ہے۔ نسبت تلمذ کی مرزا حاتم علی مہر اور مرزا عنایت علی ماہ سے رکھتا ہے کہ یہ دونوں بزرگوار باہم اخوت حقیقی رکھتے ہیں۔ یہ چند شعر اس کے دفتر اشعار سے منتخب ہوئے:

دل میں جگر میں سینے میں یکساں ہے درد آج
اے چارہ گر بتاؤں کدھر کم کدھر بہت

سیم تن جان لے کے چھوڑیں گے
اپنا اے زر ذرا سنبھالو دل

کبک و طوطی میں کچھ کمال نہیں
ان میں تیری سی بول چال نہیں

مجھ سے کہتے ہو مرے گھر سے نکل باہر ہو
کب میں باہر ہوں بھلا آپ کے فرمانے سے

خوف افلاس نہیں سیم تنوں کو اے زر
زرق و برق ان کو ہوئی ہے مرے یارانے سے

گانٹھ میں کوڑی نہیں الفت پریزادوں کے ساتھ
زر تجھے سودا ہے کیا تیرا خیال خام ہے

کون سی صورت ہے ملنے کی بتوں سے یہ بتا

وہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

زکی

زکی تخلص، محمد مہدی علی، ساکن مرادآباد۔ مرد شیریں سخن، ظریف طبع، خوش کلام، تیز فکر۔ طرز سخن اس کی ادل پسند، مادہ تاریخ بہم پہنچانے میں بے مثل

نسخہ مطبوعہ نول کشور (ص ۴۵۸) ۱۲۹۹ھ: ''اس کا''

و مانند۔ بیشتر لکھنؤ میں رہا اور ارباب کمال کی ملاقات سے فیض یاب ہوا۔ ایک عرصہ ہوا کہ نواب مصطفیٰ خان بہادر شیفتہ تخلص کے مکان میں بزم شعر خوانی منعقد ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں یہ سخن سنج بھی حضرت دہلی میں وارد تھا۔ راقم نے ایک روز مشاعرے میں اس کی صورت سے آشنائی اور اس کے سخن سے دل بستگی بہم پہنچائی۔ اب ایک مدت سے اس گل زمیں میں قدم رنجہ نہیں کیا۔ یہ اشعار اس کے نتائج افکار سے مرقوم ہوتے ہیں:

کھلوں ہوا پہ طرہ طبع سلیم کا
بس جائے، بوے مشک سے، دامن نسیم کا
اک پری وش پہ دل ان روزوں جو ہے آیا ہوا
ہر طرف پھرتا ہوں دیوانہ سا گھبرایا ہوا
آج تو انداز باتوں کا ترا کچھ اور ہے
پا گئے ہم بھی، کہ ہے غیروں کا سکھلایا ہوا
بند قبا سے نیل ہے اس کے بدن میں آج
سوسن کا گل کھلا چمن یاسمن میں آج

چنگاریاں سی اڑتی ہیں اپنے سخن میں آج
گویا ستارہ ریز زباں ہے دہن میں آج
جوہر تھے مجھ میں سب ملکوتی خصال کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

زیب

زیب تخلص، میرزا جمال الدین عرف مرزا کلن، ابن مرزا بہادر ابن مرزا بختاور بخت ابن مرزا محمد عالی جاہ ابن حضرت عالم میر ثانی۔ شیخ ابراہیم ذوق سے فن شعر کا استفادہ کیا ہے۔ اس کے اشعار سے یہ چند شعر منتخب ہوئے:

لہو میں بھر کے جو دامن کو اپنے یار آیا
یقیں ہے آج کسی بے گنہ کو مار آیا
ہمارا جوش جنوں وہ ہے جس کے ہاتھوں سے
نظر کفن کا بھی ثابت نہ ایک تار آیا
قہر معشوق ہیں خود سر کہ کسی کو اے زیب
ہم نے دیکھا نہیں ان سے کبھی بر سر آتے
زندگی دیکھیے ہو ہاتھ سے دل کے کیوں کر
اس کے آتے ہیں نظر اور ہی اطوار مجھے
دیدہ و دل نے مرے مجھ کو ڈبویا ورنہ
تھا ترے عشق سے کیا یار سرو کار مجھے
بعد ایک عمر لگی آنکھ، ذرا سونے دے
نہ کر اے شور قیامت ابھی بیدار مجھے

زیرک

زیرک تخلص، حافظ قلندر بخش ساکن پانی پت۔ تحصیل علم شاہجہاں آباد و لکھنؤ میں کی۔ اشعار ریختہ و فارسی دونوں اس کے باغ طبع کے ثمر زودرس ہیں۔ قصائد عربی میں عالم تخلص کرتا ہے۔ اوایل میں اشعار اردو میں بیدم تخلص کرتا تھا، اور غرور علم و فضل سے دماغ اس کا آسمان بریں سے ورے نہیں ٹھہرتا ہے۔ یہ شعر اس کا بہم پہنچا:

زیرک شباب ہی میں ہے کچھ لطف زندگی
یہ عیش پھر کہاں، جوانی گذر گئی

---------اختتام---------